تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں تصورِ یورپ: نو آبادیاتی مطالعہ

محقق
انیلہ رفیق
177-FLL/MSURDU/F15

نگران
ڈاکٹر نجیبہ عارف
پروفیسر، شعبہ اُردو

INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY ISLAMABAD
International Islamic University CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD

شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH23949

MS
915
ا ن

اردو ادب - سفرنامہ
" " - جنوبی ایشیا

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Anila Rafique**

Title of the Thesis: " اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفرناموں میں تصورِ یورپ: نوآبادیاتی مطالعہ "

Registration No: 177-FLL/MSURDU/F15

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Urdu Department Female
IIUI

External Examiner:

Dr.Abid Sial
Department of Urdu NUML,
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Urdu Department Female
IIUI

Supervisor:

Dr.Najeeba Arif
Professor, Urdu Department, Female IIUI

الجامعة الإسلامية العالمية
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شعبہ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ انیلہ رفیق رجسٹریشن نمبر 177-FLL/MSURDU/F15 نے ایم۔ایس اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان "اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفرناموں میں تصورِ یورپ: نو آبادیاتی مطالعہ" میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں اس کے تحقیقی معیار سے مطمئن ہوں اور تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
شعبہ اردو،
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

AC161948

100 Rupees

۱۰۰ روپیہ

﴿بیان حلفی﴾

منکہ مسماۃ انیلہ رفیق دختر محمد رفیق رجسٹریشن نمبر 177-FLL/MS/UR/F15 حسب ذیل حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ

یہ کہ میرا مقالہ بعنوان **"اٹھارھویں صدی کے جنوب ایشیائی سفرناموں میں تصور یورپ نوآبادیاتی مطالعہ"** سرقے سے پاک ہے

، اور اس مقالے میں مکمل اور اصل حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔

لہٰذا متذکرہ بالا بیان حلفی میرے علم و یقین کے مطابق درست اور حقیقت پر مبنی ہے اور کوئی امر مخفی نہ رکھا گیا ہے۔ المرقوم 13/07/2020

المحلف

Anila Rafiq ______ دستخط معہ نشان انگوٹھا

مقالہ نگار: انیلہ رفیق دختر محمد رفیق

رجسٹریشن نمبر 177-FLL/MS/UR/F15

شناختی کارڈ نمبر 37405-3732087-2

ATTESTED

TARIQ IQBAL MAKER

ISLAMABAD

13 JUL 2020

124
100

عمران احمد ولد محمد مختار ساکن NB 130/2 نیا آباد

مسئلہ ہذا سے واقف ہے

13-07-202

37405-5452991-5

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

والد محترم 'محمد رفیق' کے نام

پیش لفظ

یورپی اقوام کے جنوب ایشیائی خطے میں وارد ہونے کے بعد یہاں کے باشندوں کا بھی سترھویں صدی سے یورپ کی طرف سفر کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا مگر یورپ کے متعلق سفر نامے لکھنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز جنوب ایشیائی خطے میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپی نوآبادیات کے ابتدائی دور سے ہوا۔اس دور میں جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ دہلی سے دکن تک پھیلی مغلوں کی عظیم الشان سلطنت یورپ سے آئے برطانوی تاجروں کی نوآبادیات کا حصّہ بننے لگی۔اس لیے اس دور میں لکھے گئے سفر ناموں کی ادبی اور تاریخی اہمیت مسلمہ ہے۔ایک تو اس لیے کہ یہ سفر نامے اٹھارہویں صدی کے نصف آخریعنی ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے ابتدائی دور میں تحریر کیے گئے تھے اوراس سے پہلے ہمارے پاس ہندوستانی باشندوں کے سفر یورپ سے متعلق تحریر کیے گئے سفر نامے دستیاب نہیں تھے یعنی یہ سفر نامے ہندوستانی ابتدائی نوآبادیاتی باشندوں کے یورپ اور یورپی تہذیب و تمدن، سیاست، مذہب، علمی و سائنسی ترقی اور دیگر اہم پہلوؤں پر ان کے براہ راست مشاہدات اور معلومات پر مبنی ابتدائی ماخذات تھے۔دوسرے اس لیے کہ ان سفر ناموں کے مصنفین ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور کی بعض سیاسی و تاریخی صداقتوں کے عینی شاہدین بھی تھے جن کا ذکر انھوں نے اپنے سفر ناموں میں بھی کیا۔اس طرح یہ سفر نامے اوران میں بیان کردہ تصورات اور تاثرات یورپ اور یورپی نوآبادکاروں کے حوالے سے سفر نامہ نگاروں کی پیش کردہ آراء دراصل ہندوستانی ابتدائی نوآبادیاتی دور کے باشندوں اور یورپی نوآبادکاروں کے درمیان ابتدائی نوآبادیاتی تعلقات کی نوعیت اوران کے رویوں کو جاننے کے حوالے سے بھی اہم اور مستند تاریخی ماخذات ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کی اسی اہمیت کے پیش نظر راقم الحروف نے زیر نظر تحقیقی مقالے "اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں تصوریورپ: نوآبادیاتی مطالعہ " میں جنوب ایشیائی سفر ناموں کی ذیل میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کے متعلق تین ہندوستانی ابتدائی سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کا نوآبادیاتی ومابعد نوآبادیاتی نظریہ سازوں اور نقادوں فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید کے نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ بنیادی نظریات کی روشنی میں تحقیقی وتنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ان سفر ناموں میں 'تاریخ جدید از منشی اسماعیل، شگرف نامۂ ولایت از منشی اعتصام الدین اور مشاہدات فرنگ از میر محمد حسین شامل ہیں۔ان سفر ناموں کے علاوہ مجوزہ تحقیق میں جنوب ایشیائی باشندے محمد عبداللہ کے سفر نامے 'سفرنامہ روس و چین' سے روس کی سیاحت والے حصّے کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

مجوزہ تحقیقی موضوع کے حوالے سے یہ بات ضروری بھی ہے اور اہم بھی کہ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر راقم الحروف کے تحقیقی مقالہ سے پہلے اگرچہ چند ایک سفر ناموں پر انفرادی طور پر مختصر تحقیقی مقالے (آرٹیکل) تحریر کیے گئے تھے مگر کوئی منظم یا باقاعدہ تحقیقی مقالہ اردو میں تاحال پیش نہ کیا جاسکا تھا۔ انگریزی میں اگرچہ اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں کی اہمیت کے پیش نظر گزشتہ چند دہائیوں سے تحقیقی کام کا آغاز ہو چکا ہے مگر زیر نظر تحقیقی مقالہ اپنے موضوع اور تحقیق کی جہت کے اعتبار سے انگریزی میں کی گئی سابقہ تحقیقات سے قدرے مختلف ہے۔ راقم الحروف نے اس تحقیقی مقالے کے تعارف میں جنوب ایشیائی سفر ناموں پر سابقہ اردو اور انگریزی تحقیقات کا تفصیلی تعارف اور تنقیدی جائزہ پیش کر دیا ہے جو مجوزہ تحقیقی موضوع کی اہمیت و انفرادیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

مجموعی طور پر زیر نظر تحقیقی مقالہ 'اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں تصور یورپ: نوآبادیاتی مطالعہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب سے پہلے 'تعارف' اور آخر میں تحقیقی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔

تعارف چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں قدیم ہندیورپی تعلقات میں سفر ناموں کی اہمیت اور مختلف غیر ملکی اقوام کے قدیم باشندوں کے ہندوستان سے متعلق لکھے گئے مشہور سفر ناموں کا تعارف پیش کیا گیا ہے بعد ازاں ہندوستان اور یورپ میں تعلقات کی ابتداء، ہندوستانی باشندوں کے یورپ کی طرف سفر کے آغاز اور ہندوستان میں یورپ کے متعلق سفر نامے لکھنے کی روایت کے آغاز کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی منظر نامہ کو بیان کیا گیا ہے اور اٹھارہویں صدی میں یورپ کے سفر سے متعلق سفر نامے تحریر کرنے والے جنوب ایشیائی باشندوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر کی گئی سابقہ تحقیقات کا تعارف و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جب کہ چوتھے اور آخری حصے میں مجوزہ تحقیق کی ضرورت، اہمیت اور انفرادیت پر دلائل پیش کیے گئے ہیں

باب اول مجموعی طور پر چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں یورپی نوآبادیات کے آغاز و ابتداء پر مختصر معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ دوسرے حصے میں نوآبادیاتی و مابعد نوآبادیاتی نظریہ سازوں اور نقادوں فرانز فینن، البرٹ میمی، ایڈورڈ سعید اور ناصر عباس نیّر کا مختصر تعارف اور نوآبادیاتی تھیوری کے اہم اور بنیادی نظریات اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں یورپی نوآبادیات کے مختلف ادوار کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ چوتھے اور آخری حصّے میں بنیادی اور اہم نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برصغیر میں یورپی نوآبادیاتی عہد کا مختصر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم میں ہندوستان اور یورپ کے درمیان سفری روابط کی ابتداء، مجوزہ تحقیق کے لیے منتخب کردہ سفر ناموں کے مصنفین کے دستیاب سوانحی حالات اور ان کے سفر یورپ کے اغراض و مقاصد اور اسباب و محرکات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ محمد عبداللہ کے سفر نامہ 'سفر نامہ روس و چین' سے روس کی سیاحت والے حصے پر الگ سے مقالہ پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازاں دیگر جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی یورپ اور یورپی اقوام کے متعلق عمومی معلومات جیسے کے یورپ کا جغرافیہ، یورپ کی ترقی کے اسباب، یورپیوں کی امریکہ اور ہندوستان کے سمندری راستہ کی دریافت اور امریکہ و ہندوستان میں یورپی نوآبادیاتی سرگرمیوں کا تجزیہ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات و آراء کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں جنوب ایشیائی سفر ناموں میں ہندوستان کی ابتدائی نوآبادیاتی صورت کے حوالے سے بیان کردہ اہم سیاسی و نوآبادیاتی حقائق کا نوآبادیاتی صورت حال کے نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم مجموعی طور پر اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے انگلستان اور برطانوی زندگی کے عمومی پہلوؤں جیسے کے انگلستان کی مادی ترقی، عوامی سہولیات، برطانوی معاشرتی و سماجی رجحانات اور رسم و روایات نیز انگلستان کی زرعی و صنعتی ترقی پر ان کے مشاہدات و تاثرات کے نوآبادیاتی مطالعہ کا احاطہ کرتا ہے۔ مگر باب کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک تجارتی کمپنی سے لے کر ایک سیاسی قوت بننے تک کے سفر کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی یورپی بحری جہاز رانی کے حوالے سے آراء اور ان کے بحری سفر کے احوال و مشاہدات کے حوالے سے ان کے بیان کردہ تاثرات و تبصروں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب کے آخر میں مختلف یورپی اقوام کے متعلق سفر نامہ نگاروں کی پیش کردہ آراء سے ان یورپی اقوام کے متعلق سفر نامہ نگاروں کی سوچ اور نقطۂ نظر کو بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں برطانوی و دیگر یورپی زندگی کے اہم پہلوؤں جیسے کے مذہب، نظام سیاست، نظام تعلیم، سائنسی ترقی، ایجادات و جدید نظریات اور مستشرقیت پر جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی معلومات و آراء اور تاثرات کا تجزیاتی مطالعہ نوآبادیاتی نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں یورپی زندگی کے اہم پہلوؤں پر اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی پیش کردہ آراء میں پائے جانے والے اتفاق و اختلافات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ماحصل میں مجوزہ تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

آخر میں میں اس تحقیقی مقالہ کی تکمیل پر چند احباب کا بطور خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گی مگر سب سے پہلے تو میں اس ذات باری تعالیٰ کی بے حد شکر گزار ہوں کے جس نے مجھے اتنی ہمت، توفیق اور زندگی عطا فرمائی کے میں اپنا یہ تحقیقی مقالہ بااحسن طریقے سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئی۔

میں اپنے والدین کی بے حد شکر گزار ہوں کے جن کی محبت اور دعائیں بھی ہر وقت میرے شامل حال رہیں۔ میں یہاں اپنے بھائی 'عمران احمد' کا بھی بطور خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کے جنھوں نے ایم ایس اردو کے کورس ورک سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود مجھے یونیورسٹی اور مختلف لائبریریوں میں لے کر جانے کی ذمہ داری بڑے خلوص اور محبت سے نبھائی۔

یہاں سب سے آخری اور خاص شکریہ میں اپنی محسن اور مشفق و مہربان استاد اور اپنے تحقیقی مقالہ کی نگران ڈاکٹر نجیبہ عارف کا ادا کرنا چاہوں گی کہ جنہوں نے اس تحقیقی مقالہ کی تکمیل تک ہر قدم پر میری رہنمائی، حوصلہ افزائی اور اصلاح کی۔ یہاں یہ اعتراف بھی ضروری ہے ڈاکٹر نجیبہ عارف کی ذات میرے لیے کسی لائبریری سے کم نہ تھی کہ جس سے میں نے جب چاہا استفادہ کیا۔ میری محترم و مشفق استاد نے بہت فراخ دلی سے مجھے میرے تحقیقی مقالے سے متعلق ایسا تحقیقی مواد بھی فراہم کیا جس تک میری رسائی یقیناً ناممکن تھی۔ میں اس مشفقانہ سلوک پر ان کی بے حد مشکور ہوں۔

انیلہ رفیق

۲۸ فروری ۲۰۲۰ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	تعارف	۱
۲۔	باب اوّل: نوآبادیات: تعارف، اہم مباحث اور نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برصغیر میں نوآبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ	۳۲
۳۔	باب دوم: اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار اور تصویر یورپ	۶۶
۴۔	باب سوم: اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں مشاہدات و تاثرات انگلستان: نوآبادیاتی مطالعہ	۱۱۴
۵۔	باب چہارم: اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں یورپی زندگی کے اہم پہلو: تصورات و تاثرات (نوآبادیاتی تجزیاتی مطالعہ)	۱۶۶
	ماحصل	۲۲۲
	ماخذات	۲۳۵

فہرست

نمبر شمار　　　عنوانات

پیش لفظ

۱۔ تعارف

۱-۱　قدیم ہندیورپی تعلقات اور سفر نامے

۱۔۲۔　اٹھارہویں صدی: ہندوستانی سیاسی منظر نامہ اور یورپ کے سفر نامے

۱۔۳۔　اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں پر کی گئی سابقہ تحقیقات کا تعارف و تنقیدی جائزہ

۱۔۳۔۱۔　اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر کی گئی سابقہ انگریزی تحقیقات کا تعارف و تنقیدی جائزہ۔

۱۔۳۔۲۔　اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر کی گئی سابقہ اردو تحقیقات کا تعارف و تنقیدی جائزہ

۱۔۴۔　مجوزہ تحقیق، ضرورت، اہمیت اور انفرادیت

۱۔۵۔　حوالہ جات

۲۔ باب اوّل:

نوآبادیات: تعارف، اہم مباحث اور نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برصغیر میں نوآبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ

۲۔۱۔　تعارف

۲۔۲۔　نوآبادیاتی صورتِ حال: اہم نظریات و مباحث

۲۔۳۔　نوآبادیاتی ادوار

۲۔۴۔　نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برصغیر میں یورپی نوآبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ

۲۔۴۔۱۔　پرتگالیوں کی دریافت اور ہندوستان آمد

۲۔۴۔۲۔　ولندیزوں کی ہندوستان آمد اور عروج و زوال

۲۔۴۔۳۔　ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور برطانویوں کی ہندوستان آمد

۲۔۴۔۴۔ فرانسیسیوں کی ہندوستان آمد اور قیام
۲۔۴۔۵۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی رقابت۔۔۔انگریزوں کی فتح
۲۔۴۔۶۔ ہندوستانی شعبۂ علم وادب اور زبان اور انگریزی نوآبادکارانہ عزائم: تنقیدی جائزہ
۲۔۵۔ حواشی وحوالہ جات

۳۔ باب دوم:
اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار اور تصویر یورپ
۳۔۱۔ پس منظر
۳۔۲۔ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار:
۳۔۲۔۱۔ محمد عبداللہ
۳۔۲۔۲۔ منشی اسماعیل
۳۔۲۔۳۔ مرزا شیخ اعتصام الدین
۳۔۲۔۴۔ میر محمد حسین
۳۔۳۔ سفر نامۂ روس وچین: تنقیدی جائزہ
۳۔۴۔ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی خطۂ یورپ کے متعلق
۳۔۴۔۱۔ عمومی معلومات
۳۔۴۔۲۔ یورپ کا جغرافیہ
۳۔۴۔۳۔ یورپ کی ترقی اور عروج کے اسباب
۳۔۴۔۴۔ امریکہ (نئی دنیا) کی دریافت اور امریکہ پر یورپی نوآبادیاتی یلغار
۳۔۴۔۵۔ پرتگالیوں کی ہندوستان کے سمندری راستہ کی دریافت اور مختلف یورپی اقوام کی ہندوستان آمد اور سرگرمیاں
۳۔۵۔ جنوب ایشیائی سفر ناموں میں ہندوستانی ابتدائی نوآبادیاتی صورتِ حال کے اہم حقائق: نوآبادیاتی تجزیاتی مطالعہ
۳۔۶۔ حواشی وحوالہ جات

۴۔ باب سوم:

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں مشاہدات وتاثرات انگلستان: نوآبادیاتی مطالعہ

۴۔۱۔ اٹھارہویں صدی کا نصف آخر، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت اور جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کا سفر یورپ

۴۔۲۔ یورپی بحری سفر کے مشاہدات واحوال

۴۔۳۔ شہر لندن کی خصوصیات

۴۔۴۔ برطانوی سماجی ومعاشرتی رجحانات اور رسم وروایات

۴۔۵۔ برطانوی صنعتی وزرعی ترقی کے مشاہدات

۴۔۶۔ برطانوی، فرانسیسی، اسکاٹش اور ہائی لینڈی باشندوں کے درمیان افتراقات واختلافات

۴۔۷۔ حواشی وحوالہ جات

۵۔ باب چہارم:

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں یورپی زندگی کے اہم پہلو: تصورات وتاثرات (نوآبادیاتی تجزیاتی مطالعہ)

۵۔۱۔ اٹھارہویں صدی اور یورپ

۵۔۲۔ مذہب

۵۔۳۔ برطانوی نظام تعلیم

۵۔۴۔ برطانوی نظام حکومت اور حکومتی ادارے

۵۔۴۔۱۔ بادشاہت

۵۔۴۔۲۔ پارلیمنٹ

۵۔۴۔۳۔ عدلیہ

۵۔۴۔۴۔ فوج

۵۔۴۔۵۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے روابط

۵۔۵۔ یورپی سائنسی ترقی، ایجادات اور جدید نظریات

۵۔۶۔ مستشرقیت

۵۔۷۔ یورپی زندگی کے اہم پہلو اور جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے تاثرات و رویے: تنقیدی جائزہ
۵۔۸۔ حواشی و حوالہ جات

ماحصل

ماخذات

تعارف

ا۔ قدیم ہند یورپی تعلقات اور سفر نامے:

سفر کو انسانی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ قدیم زمانے میں جب ذرائع مواصلات موجود نہ تھے تو لوگ اپنی ضروریات (خوراک، تجارت، تحصیلِ علم اور رہائش وغیرہ) اور ایک دوسرے کے احوال دریافت کرنے کے لیے سفر اختیار کرتے۔ ان سفر کرنے والوں میں کچھ ایسے ذی شعور اور اہلِ علم بھی تھے جو اگر کبھی دنیا کے اَن جانے خطوں یا ملکوں کی طرف رختِ سفر باندھتے تو اس خطے یا ملک کے سفر کا احوال جو اس ملک یا خطے کے جغرافیہ، آب وہوا، لوگوں کی تہذیب و تمدن اور خوراک وغیرہ جیسی مفید معلومات پر مبنی ہوتا، اسے اپنی ڈائریوں یا روزنامچوں کی صورت میں محفوظ کر لیتے اور پھر اپنے اہلِ وطن کو دنیا کے ان دور دراز ممالک کے متعلق مستند اور مفید معلومات پہنچاتے۔ اس طرح ان ابتدائی سفر کرنے والوں کی سفری ڈائریاں، روزنامچے، یادداشتیں اور سفر نامے نہ صرف اَن جانے خطوں کے بارے میں جاننے کا ذریعہ بنیں بلکہ بعد میں ان خطوں کی جانب سفر کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا سبب بھی بنیں۔ سفر کے انہی فوائد اور اہمیت کے پیشِ نظر قدیم عرب اور یورپی علمی روایت میں اسے بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ عربوں نے اس سفر کی بدولت نہ صرف دنیا کے دور دراز خطوں کی علمی، تبلیغی اور تجارتی مقاصد کی غرض سے سیاحت کی بلکہ اس طرح وہ عرصۂ دراز تک دنیا کی تجارت پر بھی قابض رہے۔

عربوں اور یورپیوں کے قدیم سفر نامے اہلِ یورپ کے لیے گائیڈ بکس ثابت ہوئے اور ان کی بدولت نہ صرف اُنھوں نے دنیا کے اَن جانے خطوں کو تلاش کر لیا بلکہ ان کی تجارت پر قابض ہو کر انھیں سیاسی طور پر مغلوب کرنے کے بعد انھیں اپنی نو آبادیات میں بھی شامل کر لیا جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ برصغیر پاک وہند اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔

ہندوستان اور یورپ کے درمیان اگر قدیم تعلقات کے حوالے سے بات کی جائے تو دونوں قوموں کے درمیان زمانۂ قدیم سے ہی تجارتی تعلقات استوار ہو چکے تھے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے ناواقف تھیں اور ان کے درمیان تجارت ایک تیسری قوم یعنی عربوں کے توسط سے اشیائے کوچک سے تاتار و ایران اور بحرِ احمر و خلیج فارس کی راہ سے ہو رہی تھی۔

سکندر ہندوستان پہنچا ضرور مگر وہ یہاں اپنی کوئی باقاعدہ حکومت قائم کیے بغیر ہی جلد واپس لوٹ گیا۔ اس کی آمد کا البتہ یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ یورپی اس اَن جانے خطے کی جانب متوجہ ہو گئے۔[1] یونانیوں نے 'بلخ' کی حکومت کے

زمانے سے ہی اہلِ ہند کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے جیسے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کے **میگستھنز** موریہ سلطنت کے عہد میں تین سو سال قبل مسیح میں بعض سفارتی امور کی تکمیل کے سلسلے میں **ہندوستان آیا اور نہ صرف** اپنے سفارتی امور انجام دیئے بلکہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور یہاں کے لوگوں کا بغور مشاہدہ بھی کیا۔ اس نے ہندوستان سے متعلق جمع کردہ اپنی ان قیمتی معلومات کو اپنی کتاب انڈیکا میں تفصیلاً درج کر دیا۔ اس طرح اس تاریخی کتاب کو ہندوستان سے متعلق کسی غیر ملکی (یورپی) کا پہلا سفر نامہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مورخین اس سفر نامے کو موریہ سلطنت کے حالات جاننے کے حوالے سے ایک بہترین ماخذ بھی قرار دیتے ہیں۔[۲]

ہندوستان کو بیرونی دنیا سے متعارف کروانے اور مقبول بنانے میں دراصل میگستھنز اور دوسری قوموں کے ایسے سیاحوں نے اہم کردار ادا کیا ہے جنہوں نے نہ صرف ہندوستان کی سیاحت کی بلکہ اپنی سیاحت، سفر اور ہندوستان کے حالات و واقعات کو اپنے سفر ناموں کی زینت بنا دیا۔ میگستھنز کے بعد تیرھویں صدی عیسوی میں مارکو پولو کی ہندوستان آمد کے درمیانی عرصہ تک کسی ایسے یورپی کی آمد کے شواہد نہیں ملتے جس نے سفر نامہ بھی تحریر کیا ہو، ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اپنی انفرادی حیثیت اور ضرورت کے پیش نظر اس خطے کی جانب سفر کیے ہوں۔ اس دوران البتہ دوسری قوموں کے افراد جیسے کے چینی، عرب، ایرانی وغیرہ مختلف مقاصد کے حصول کے لئے ہندوستان کی سیاحت کرتے رہے اور ہندوستان کی سیاحت سے متعلق ان کے تحریر کردہ سفر نامے ہندوستان کی شہرت میں دن بدن اضافہ کا سبب بنتے رہے۔ یہاں ان میں سے چند مشہور سیاحوں اور ان کے تحریر کردہ سفر ناموں کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پانچویں صدی عیسوی میں میگستھنز کے تقریباً سات سو سال بعد ہندوستان آنے والا دوسرا سیاح 'فاہیاں' ایک چینی باشندہ تھا۔ فاہیاں بدھ مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بدھ مذہب سے متعلق کتابوں کی نقول حاصل کرنے آیا تھا۔ اس زمانے کے ہندوستان کے حالات و واقعات پر مبنی اس کی کتاب 'بدھ حکومت کے حالات' یقیناً ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔[۳]

عربوں کی بات کی جائے تو قدیم زمانہ سے ہی تجارت پیشہ تھے اور جہاز رانی میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ طلوعِ اسلام کے بعد انہوں نے خاص طور پر دین کی تبلیغ اور سیاحت کے پیش نظر دنیا کے دور دراز خطوں (ایشیا، یورپ اور افریقہ) کا سفر طے کیا۔ سلیمان تاجر وہ پہلا عرب سیاح تھا جس نے چین اور مشرق وسطی کی تجارت کے دوران ہندوستان کی سیاحت بھی کی اور اپنا سفر نامہ ۲۳۷ھ میں لکھا جسے ۱۸۴۵ء میں 'سلسلہ التواریخ' کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس سفر نامہ میں ہند کی سیاست اور تہذیب پر معلومات کے ساتھ ساتھ ہند کے تمدن کا چین کے ساتھ موازنہ بھی

پیش کیا گیا تھا۔[۴]

گیارھویں صدی عیسویں میں ہندوستان آنے والا ایک اور مشہور سیاح 'ابوریحان البیرونی' تھا۔ البیرونی، ہندی علوم کی تحصیل کے سلسلے میں ہندوستان آئے۔ یعنی ان کی ہندوستان سیاحت کا مقصد علمی تھا۔ انہوں نے اس زمانے کے سماجی، دینی اور علمی حالات کو اپنی مشہور زمانہ کتاب 'کتاب الہند' کی زینت بنایا۔ عرب سیاحوں کی تاریخ 'ابن بطوطہ' کا نام لیے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ابن بطوطہ چودھویں صدی عیسویں میں ہندوستان آیا۔ اپنے سفر نامہ 'عجائب الاسفار' کی بدولت اسے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ اس نے ۱۳۲۵ء میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور حجاز، مصر، شام، عراق، ترکی، ایران، بخارا، بدخشاں، افغانستان اور ہندوستان کے سفری تجربات و مشاہدات کو اپنے سفر نامے کا حصہ بنایا۔[۵]

یورپی سیاحوں کی بات کی جائے تو وہ اسکوڈے گاما کو اس حوالے سے اولیت حاصل نہیں بلکہ قدیم یورپی سیاحوں میں 'مارکوپولو' کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وہ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت (۱۲۶۵ء تا ۱۲۸۷ء) میں چین سے مالا بار تک آیا اور کئی برس تک یہاں مقیم رہا۔ اس کے بعد دیگر کئی یورپی سیاحوں نے ہندوستان پہنچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے ان میں 'بارتھولومو ڈاز' اور 'کرسٹوفر کولمبس' کے نام سر فہرست ہیں بالآخر ۱۴۹۸ء میں بحری سفر کے ذریعے ہندوستان پہنچنے کا یہ سہرا واسکوڈے گاما کے سر سجا۔[۶]

واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں کی ڈائریوں میں سفری احوال اور ہندوستان کے جغرافیائی و موسمی حالات، تہذیب و تمدن، رہن سہن، اور مشاغل وغیرہ کے متعلق معلومات بعد میں آنے والے یورپیوں کے لئے رہنمائی کا سبب بنیں اور اس طرح یورپی اقوام کے ہندوستان کی طرف آسانی سے سفر کرنے کے راستے کھل گئے۔ عرب، چینی، ایرانی اور دوسری ایشیائی اقوام تو زمینی قربت کی بنا پر تجارتی و دیگر مقاصد کے پیش نظر عرصہ دراز سے اہل ہند کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہوئے تھیں مگر واسکوڈے گاما کی ہندوستان آمد کے بعد تقریباً تمام یورپی ممالک نے بھی اہل ہند کے ساتھ براہ راست تجارتی تعلقات قائم کر لئے اور اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سترھویں صدی کے اواخر میں تقریباً تمام بڑی یورپی طاقتیں جیسے کہ انگریز، فرانسیسی، ڈچ اور ڈینیز وغیرہ انڈین ساحلوں پر لنگر انداز ہو چکی تھیں اور پرتگالیوں کی تقلید میں اہل ہند کے ساتھ تجارت کر کے ڈھیروں ڈھیر منافع کما رہی تھیں۔[۷]

یوں اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یورپیوں کا ذوق سفر ہی دراصل اُن کے لیے وسیلۂ ظفر ثابت ہوا جبکہ اُن کی سفر نامہ نگاری آنے والی نسلوں کے لیے ایسے خطوں اور ایسی اقوام کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ بنی جن سے وہ پہلے سے واقف نہ تھے۔ ان سفر ناموں میں دستیاب قیمتی معلومات کی بدولت یورپی اقوام نے نہ صرف دور دراز

اور اُن جانے خطوں تک بآسانی رسائی حاصل کر لی بلکہ وہ وہاں کے رہنے والوں کو مغلوب و محکوم بنانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ ہندوستان کے سفر سے متعلق سفری ڈائریاں اور روز نامچے لکھنے کی روایت کا جو آغاز واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا اس نے سترھویں صدی میں ہی باقاعدہ سفر ناموں کی صورت اختیار کر لی۔ اس طرح دوسری یورپی اقوام کے باشندے جو مختلف اغراض و مقاصد کے تحت ہندوستان آتے، اپنے سفر کے تجربات و مشاہدات کو سفر ناموں کی صورت میں قلمبند کرنے لگے مثلاً کپتان ہاکنس نے جو ۱۶۰۸ء میں شاہِ انگلستان کا خط لے کر جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا، اس نے اپنا سفر نامہ بھی تحریر کیا۔ اسی طرح سر طامس رونے بھی جسے شاہِ انگلستان نے ۱۶۱۵ء میں جہانگیر کے دربار میں تحفے تحائف دے کر بھیجا تھا اس سفر سے متعلق سفر نامہ بھی تحریر کیا۔ جان فریبر جو ۱۶۲۹ء۔ ۱۶۳۰ء میں ہندوایران کی سیاحت کے لیے آیا اس نے اپنے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ایک کتاب *Franels* تحریر کی جو کئی جلدوں پر مشتمل تھی۔ فرانس کے ایک جوہری موسیو جے پی ٹیور نیر نے ۱۶۵۳ء۔ ۱۶۵۴ء میں دکن اور شمالی ہند کے بہت سے علاقوں کی سیر کی اور اس حوالے سے اپنا سفر نامہ (Travels in India) بھی تحریر کیا۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی نے اس سفر نامے کا اردو ترجمہ کیا۔ اسی طرح ایک اور فرانسیسی سیاح موسیو تھیونو (تھیوناٹ) نے بھی جو ۱۶۶۴ء میں ہندوستان آیا، اپنا سفر نامہ تحریر کیا۔ [۸]

غرض کہ ہندوستان کے متعلق سفری تجربات و مشاہدات کا جو سلسلہ واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں نے شروع کیا تھا وہ اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد تک بھی جاری رہا اور اس طرح ہمیں ہند کے متعلق یورپی سیاحوں، تاجروں، ڈاکٹروں، سفیروں اور سرکاری اہلکاروں کے لکھے گئے سفر ناموں کی ایک کثیر تعداد دکھائی دیتی ہے۔ ان سفر ناموں میں ہندوستان کے موسمی حالات، جغرافیائی حدود، تہذیب و تمدن، جانوروں، پودوں اور اشیائے خورد و نوش وغیرہ کے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں جس سے یورپی اقوام نے بے پناہ استفادہ حاصل کیا۔

ہم نے یورپیوں کے متعلق تو جان لیا کہ کب اور کیسے ہندوستان پہنچے اور ان کے ہاں ہندوستان سے متعلق سفر نامے لکھنے کا آغاز کب سے ہوا؟ مگر ساتھ ہی یہ سوال بھی ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ اہل ہند نے یورپ کی طرف سیاحت یا دوسرے مقاصد کے پیش نظر کب سے سفر کرنا شروع کیا اور سفر کے حالات کو کب سے سفر ناموں کی صورت میں لکھنا شروع کیا؟

اہل ہند کے حوالے سے اس سوال کے جواب کی تلاش میں نکلیں تو ہمیں خاصی مایوس کن صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ اہل ہند عرصہ دراز تک دھرتی پوجا کے تصور کے زیر اثر دور دراز ممالک کے سفر سے گریزاں رہے۔ سمو نتی سین اس حوالے سے اپنی کتاب *Travels to Europe: Self and other*

in Bengali Travel Narrative, 1870-1910 میں لکھتی ہیں کہ مغربی تخیلاتی ادب میں قدیم داستانوں سے لے کر قرون وسطی میں جدید ذرائع اظہار کے ذریعے سفر کو دلچسپ اور حیرت انگیز چیز کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس لیے مغرب میں نہ صرف سفر بلکہ سفر نامہ نگاری کی قدیم روایت موجود ہے۔[۹] اس کے برعکس اگر ہندو مذہبی روایت کا جائزہ لیا جائے تو ایک طرح سے متضاد صورت حال سامنے آتی ہے کہ اس میں یا تو سفر کی واضح الفاظ میں مذمت کی گئی ہے یا پھر اس پر مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ قدیم روایتی ادبی تخلیقات جیسے کے 'مہابھارتا' میں سفر کے متعلق اگر کچھ پڑھنے کو ملتا ہے تو اسے زیادہ تر جلاوطنی سے منسوب کیا گیا ہے۔ سفر کو صرف ایک صورت یعنی کسی مذہبی فریضہ کی ادائیگی یا مقدس مقام کی زیارت کے سلسلے میں نہ صرف جائز قرار دیا گیا بلکہ اسے اختیار کرنے کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ 'مہابھارتا' اور 'پرانا' میں مقدس مقامات کی زیارت کو خداؤں کی راہ میں قربانی پیش کرنے سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم ہندی ادب سفر کے متعلق زیادہ تر مذہبی خیالات کے زیر اثر ہی رہا۔ قرون وسطی کے روایتی بنگالی ادب جیسے کے 'منگل کاویا'(Mangal Kavya) میں عام طور پر تجارت اور مذہب سے منسوب سفری کہانیاں مل جاتی ہیں، تاہم ہندو شاستر ک روایت میں ایک طرف تو سفر کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی اور اگر کہیں ایسا ذکر آیا بھی ہے تو اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں کہا جاسکتا کے ہندو سفر سے بالکل ہی گریزاں رہے بلکہ دوسرے لوگوں کی طرح ہندوؤں نے بھی نہ صرف اپنی جغرافیائی حدود کے اندر بلکہ دور دراز مقامات کا سفر تجارت، جلاوطنی یا کامیابی کے حصول کے لیے کیا۔ بہر حال جہاں تک برہمنی سوچ کا تعلق ہے تو یہ لوگ عرصہ دراز تک سفر کو غیر صحت بخش، غیر تسلی بخش اور گھر سے دور خطرات سے بھرپور ایک سرگرمی قرار دیتے رہے۔[۱۰]

اہل ہند کی طرف سے یورپ کے متعلق جاننے کی عملی کوششوں کا آغاز دراصل شہنشاہ جلال الدین اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۴) کے دور میں اس کی ذاتی کوششوں سے ہوا۔ اکبر کے دور میں معقولات کو فروغ حاصل ہوا۔ اکبر اگرچہ خود پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا مگر علوم و فنون سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ وہ مصوری، نقاشی، شعر و سخن اور موسیقی کا اچھا ذوق رکھتا تھا۔[۱۱] اکبر نے یورپ کی علمی و ادبی ترقی کے بارے میں بھی سن رکھا تھا لہذا وہ اہل علم یورپیوں کی تلاش میں تھا۔ ان دنوں یورپیوں کے جہاز گووا اور سورت کی بندرگاہوں پر آیا کرتے تھے۔ اکبر کے حکم پر حاجی حبیب اللہ کاشی ۹۸۴ھ میں بندرگاہ گوا سے نہ صرف یورپی سوغاتیں بلکہ ایک کثیر جماعت یورپی اہل ہنر و فن کی ساتھ لے کر بادشاہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ انہی یورپیوں میں پادری 'فریبتون' بھی شامل تھا۔ شہزادوں میں سے بعض کو جو اعلی ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے پادری فریبتون کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ تاکہ یونانی کتب کے تراجم کرائے

جا سکیں اور علم و حکمت کی باتوں کو فارسی کا لبادہ پہنا کران سے فیض یاب ہوا جاسکے۔[۱۲] اس کے بعد اکثر یورپی پادری اکبر کے دربار میں حاضر ہوتے رہتے اور بادشاہ دینی و دنیاوی معاملات پر نہ صرف ان کی گفتگو سنتا بلکہ اس نے 'توریت' اور 'انجیل' کے تراجم کا حکم بھی دیا۔ مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب دربار اکبری میں شہزادوں کو سکھائی جانے والی یورپی زبانوں کے حوالے سے شبہ کا اظہار کرتے ہیں یعنی ان کے مطابق یہ سند کے ساتھ نہیں بتایا جاسکتا کے شہزادے 'رومی' زبان سیکھتے تھے یا عبرانی۔ ہاں البتہ شہزادہ مراد کے بارے میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ چونکہ پادری فریبتون کے شاگرد تھے اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ اسے اپنی زبان یعنی یونانی سکھاتے ہوں گے۔ گلفشاں خان اپنی کتاب *Indian Muslim Perceptions of the West During the Eighteenth Century* میں عبدالستار نامی ایک شخص کا تذکرہ کرتی ہیں جسے اکبر نے Jerom Xavier کی شاگردی میں دیا تاکہ وہ یورپین زبانیں سیکھ کر یورپی کتب کے فارسی تراجم کر سکے۔ چھ ماہ کی محنت کے بعد دونوں کی کاوش سے جو تراجم کیے گئے وہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کے تھے اور عیسائیت کے اعتقاد کی ترجمانی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قدیم مغربی فلاسفی کے حوالے سے بھی تراجم کیے گئے۔ ۱۶۰۳ء میں عبدالستار نے Jermon Xavier کی مدد سے ثمرات الفلاسفہ مرتب کی۔ اس کتاب کا موضوع رومن سلاطین کی تاریخ، رومن دانشوروں اور حضرت عیسیٰ کی زندگی ہے۔[۱۳]

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کے دور میں یورپ کے ساتھ روابط کی ابتداء علوم و مذہبی کتب کے تراجم سے ہوئی مگر اکبر کے دور میں ہمیں کسی ایسے ذی شعور شخص کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جس نے خود براہ راست یورپ کا سفر اختیار کر کے یورپ کی تہذیب و تمدن یا علوم و فنون و دیگر اشیا کے متعلق کوئی معلوماتی سفر نامہ بھی تحریر کیا ہو۔

سترھویں صدی تک مغلوں کی ہندوستان میں فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ اور مغلیہ سلطنت کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا چلا جارہا تھا جو سترھویں صدی کے آخر تک دکن تک پھیل چکا تھا۔ سترھویں صدی میں تقریباً تمام یورپی اقوام بھی ہندوستان سے تجارت کی غرض سے یہاں پہنچ چکی تھیں۔ ۱۶۰۸ میں کیپٹن ولیم ہاکنز (Captain William Hawkins) نے مغل بادشاہ 'جہانگیر' کے دربار میں حاضری دی اور کمپنی کے لئے شاہی سرپرستی حاصل کی۔ اس طرح مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کمپنی کو فیکٹریاں کھولنے کے لئے شاہی اجازت نامہ دے دیا گیا۔ بعد ازاں کمپنی وقتاً فوقتاً اپنی ضرورت کے مطابق اسی طرح کے شاہی اجازت نامے حاصل کرتی رہی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فیکٹریاں قائم کرتی رہی۔[۱۴] فرانسیسی بھی انگریزوں کے نقش قدم

پر چلتے ہوئے ہندوستان پہنچ گئے اور جلد ہی انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں جیسے کے سورت اور مسولی پٹم وغیرہ میں اپنی فیکٹریاں قائم کرلیں۔[۱۵]

پہلے پہل جب یورپی جنوب ایشیائی ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے اور مقامی تاجروں سے تجارت کرنے لگے تو انہیں بے پناہ منافع حاصل ہونے لگا اور ہندوستانی مصنوعات کی یورپی منڈیوں میں مانگ دن بدن بڑھنے لگی۔ اس طرح یورپیوں کو اس سرزمین پر اپنے روشن مستقبل کے آثار دکھائی دیئے تو انہوں نے اس سرزمین پر اپنے قدم جمانے کے لئے ہندوستانی تاجروں کے ساتھ تجارتی شراکت داری قائم کی، ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کیں، اپنے لئے ہندوستانی ملاح، جہازران اور سپاہی بھرتی کئے۔ یوں آہستہ آہستہ سترھویں صدی سے مقامی لوگوں کا ہند سے یورپ کی طرف سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ سترھویں صدی میں ہندوستان سے یورپ کی طرف سفر کرنے والوں میں زیادہ تر وہ عورتیں (جنہوں نے یورپین مردوں سے شادیاں کیں)، ملاح، جہازران اور غلام شامل تھے جنہیں یورپی واپس جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے جاتے۔[۱۶] سترھویں صدی میں ہندوستان سے یورپ جانے والوں کی تعداد دستیاب ریکارڈ کے مطابق کچھ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن سترھویں صدی میں بھی ہمیں ہندوستان سے یورپ جانے والے کسی ایسے شخص کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جس نے کوئی سفرنامہ بھی تحریر کیا ہو۔ ہندوستانی اشرافیہ کا ذکر کیا جائے تو گلفشاں خان کے مطابق محمد قباد بیگ جو اورنگ زیب کے عہد میں دکن میں دیوان تھا سترھویں صدی کے آخر یا اٹھارویں صدی کی ابتدا میں یورپ گیا اور یورپ میں اپنے قیام کے دوران اس نے یونانی اور لاطینی علوم سیکھے۔ مگر یورپ کے سفر یا وہاں سیکھے گئے علوم کے حوالے سے اس نے کوئی کتاب یا سفرنامہ وغیرہ بھی تحریر کیا؟ اس بارے میں ہمیں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔[۱۷] یوں سترھویں صدی کے اختتام تک بھی ہمیں کسی ایسے ہندوستانی باشندے کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوتیں جس نے یورپ کے سفر سے متعلق کوئی سفرنامہ بھی تحریر کیا ہو۔

۲۔ اٹھارویں صدی: ہندوستانی سیاسی منظر نامہ اور یورپ کے سفر نامے

اٹھارویں صدی کے آغاز ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات مغلیہ سلطنت کے لیے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔ عالمگیر جیسے بااصول، باکردار، نیک نیت، عادل اور اسلامی خطوط پر سلطنت کو چلانے والے بادشاہ کے رخصت ہو جانے سے گویا یہ ساری صفات بھی مغلیہ سلطنت سے رخصت ہو گئیں۔ اٹھارویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی منظر نامہ کا سرسری جائزہ لیں تو ہر طرف بدامنی، انتشار، بغاوتوں اور خانہ جنگی کا بازار گرم نظر آتا ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے فوراً بعد ہی اس کے جانشین تخت کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ حالانکہ اورنگ زیب اپنی وفات سے قبل اپنے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش کو جنگ و جدل سے بچانے کے لیے ان کے درمیان سلطنت کو تقسیم کر گیا تھا۔ مگر انہوں نے باپ کی تقسیم پر رضامندی ظاہر نہ کی اور 'جاجو' کے مقام پر معظم نے اعظم شاہ اور اس کے دو بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ بعد ازاں کام بخش بھی حیدر آباد کے قریب معظم سے شکست کھا گیا۔ اور ۱۷۰۸ء میں وفات پا گیا۔ یوں معظم 'بہادر شاہ' کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا۔ وہ مجموعی طور پر اچھی خصلتوں کا مالک تھا۔ مگر اسے زیادہ دیر حکومت کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ۱۷۱۲ء میں اچانک بیمار ہو کر وفات پا گیا۔[۱۸]

'شاہ عالم' کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے درمیان تخت کے حصول کی جنگ چھڑ گئی اور آخر کار تخت جہاندار شاہ کے ہاتھ آیا۔ جہاندار ایک عیاش اور اخلاقی گراوٹ کا شکار بادشاہ تھا۔ اس کے دور میں وزراء وامراء طاقتور اور بااختیار ہو گئے اور اپنی من مانیاں کرنے لگے۔ اس کا دور حکومت بہت مختصر (صرف گیارہ ماہ) تھا۔ اس کے بھتیجے 'فرخ سیر' نے بارہہ کے سیدوں کی مدد سے اسے شکست دی اور خود تخت پر قابض ہو گیا اور انہی سید برادران کو مروانے کے لئے ان کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔ آخر کار وہ اپنی سازشوں میں ناکام ہوا اور دونوں سید بھائیوں نے ۱۷۱۹ء میں اسے تخت سے اتارا، اندھا کر کے قید میں ڈلوایا اور پھر اذیت ناک موت دی۔[۱۹]

'فرخ سیر' کی حکومت میں مغلیہ سلطنت نے زوال کا سفر بہت تیزی سے طے کیا۔ اس کے عہد میں مغل دربار تورانی، ایرانی، افغانی اور ہندوستانی امراء کی سازشوں کا گڑھ بن گیا جبکہ سلطنت کا امن و سکون غارت ہو گیا۔[۲۰] 'فرخ سیر' کے بعد سید برادران نے پہلے رفیع الدرجات اور پھر رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا۔ مگر دونوں ہی اپنی بیماری کے باعث چند ماہ میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد سید برادران نے 'محمد شاہ' کو تخت افروز کیا۔ محمد شاہ نے تورانی امراء کے ساتھ ساز باز کر کے سید برادران میں سے ایک بھائی کو قتل کروا دیا۔ محمد شاہ ایک عیاش بادشاہ ثابت ہوا۔ اسے امورِ سلطنت میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے درباری امراء کو ایک دوسرے سے حسد کرنے اور غدارانہ سازشیں کرنے سے ہی فرصت نہ تھی تو سلطنت کا نظام کیونکر صحیح طور پر چل سکتا تھا۔ لہٰذا مغلیہ سلطنت کو اس غفلت کے خوفناک نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک نے دکن میں اپنی آزاد ریاست قائم کر لی۔[۲۱] نومبر ۱۷۳۸ء میں مرہٹوں نے پہلے مالوہ اور پھر مارچ ۱۷۳۹ء میں بند ھیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ محمد شاہ کی فوجی کاروائیاں مرہٹوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور مجبوراً محمد شاہ نے مالوہ اور بند ھیل کھنڈ ایک معاہدے کے تحت مرہٹوں کے حوالے کر دیے۔ محمد شاہ کے عہد میں سکھ، جاٹ اور روہیلے سبھی سرگرم ہو گئے، ملک افراتفری اور بدامنی کا شکار ہو گیا۔[۲۲] رہی سہی کسر نادر شاہ

کے حملے (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی کے دہلی پر حملوں (۱۷۵۷ء) اور قتل وغارت نے پوری کر دی۔

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ اور پھر عالمگیر ثانی بالترتیب تخت نشین ہوئے مگر کوئی بھی صورت حال کو سنبھال نہ سکا اور مرہٹے مالوہ، گجرات، بہار، بنگال، اڑیسہ اور راجپوتانہ میں لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے ہوئے لاہور تک پہنچ گئے۔ حالات کی کشیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہ ولی اللہ اور نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کو خطوط لکھے اور اسے دوبارہ ہندوستان آنے اور صورت حال سنبھالنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی اپنی فوج لے کر ہندوستان وارد ہوا اور مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پہنچ گیا۔

۱۷۵۹ء میں عالمگیر ثانی کو ایک سازش کے تحت قتل کروا دیا گیا۔ اس کے بعد عالمگیر ثانی کے بیٹے نے کھتولی کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت افروز ہوا۔ شاہ عالم ثانی کا دور خون ریز جنگوں اور بغاوتوں سے پُر تھا۔ اسے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے علاوہ انگریزوں کی صورت میں ایک نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے بھی نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا جو بنگال میں جڑ پکڑتے جا رہے تھے اور دن بدن طاقتور ہوتے جا رہے تھے۔ شاہ عالم ۱۲ سال تک دہلی نہ آسکا اور بنگال میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سرکشی کو روکنے کے لیے جنگوں میں مصروف رہا۔ ادھر دہلی میں اس دوران ۱۷۶۱ء میں ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کو بہت بری شکست ہوئی۔ اس کے بعد ابدالی پنجاب اور دلی کے اثاثوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے دلی میں اپنے معتمد نواب نجیب الدولہ کو بادشاہ کا نائب چھوڑ کر خود اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔

ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کو دراصل ایسٹ انڈیا کمپنی کا ابتدائی نوآبادیاتی دور بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس عرصے میں انگریزوں نے بڑی چالاکی سے اپنے سب سے طاقتور یورپی حریف فرانسیسیوں کو ہندوستان کی تجارت اور مقبوضات سے بے دخل کر دیا۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں نے جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کو جبکہ ۱۷۶۴ء میں شاہ عالم کو بکسر میں شکست دی اور ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق حاصل کر لیے۔ ۱۷۷۲ء میں نجیب الدولہ کی وفات کے باعث شاہ عالم دہلی واپس آگیا۔ اسی دوران مرہٹے دوبارہ دہلی پر چھا گئے اور بادشاہ مرہٹہ سردار مادھوجی سندھیا کے سہارے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا کہ ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ نے دہلی پر قبضہ کر کے بادشاہ کو آنکھوں سے محروم کر دیا۔ اُدھر ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے ریاست میسور کے حکمران اور اپنے سب سے طاقتور حریف ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا۔ اس طرح اُن کے مدمقابل کوئی ایسا حریف باقی نہ رہا جو ڈٹ کر اُن کا مقابلہ کر سکے۔ [۲۳] وہ اپنی اس کامیابی کے نشے میں چور دہلی کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ آخر کار ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کر لیا اور شاہ عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک وظیفہ خوار بادشاہ بن کر رہ گیا۔ [۲۴]

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بہادر شاہ (۱۷۱۲ء) سے لے کر شاہ عالم تک کوئی بھی ہندوستان کی بادشاہت کا صحیح معنوں میں حق ادا نہ کر سکا۔ بادشاہوں کے کردار کی کمزوری، تعیش پرستی، اخلاقی گراوٹ، وزراء اور امراء کی درباری گروہ بندیاں اور سازشیں مغلیہ اقتدار کو لے ڈوبیں اور صرف نصف صدی کے اندر، اندر دکن سے دہلی تک پھیلی مغلوں کی عظیم الشان سلطنت یکے بعد دیگرے برطانوی تاجروں کی نوآبادیات کا حصّہ بننے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ کو انگریزوں کا وظیفہ خوار بننا پڑا۔

اٹھارہویں صدی کے ان حالات میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی پے درپے کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دیں تو ان کی سیاسی حیثیت بھی مستحکم ہونے لگی۔ *Countflows to Colowalism: Indian Travellers and Settlers in Britain (1600-1857)* کا مصنف مائیکل ایچ فشر لکھتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں جب مغلوں کی حکومت برائے نام رہ گئی تو بہت سے انڈین باشندوں نے جن میں آرمینی اور پارسی تجارت پیشہ لوگوں کے علاوہ ہندوستانی دانشور، افسر، حکومتی نمائندے وغیرہ شامل تھے، نئی اُبھرتی ہوئی طاقت (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے ساتھ نہ صرف روابط قائم کرنے کی کوششیں کرنے لگے بلکہ اپنے مختلف مقاصد کی انجام دہی کے لیے انگلستان و یورپ کا سفر بھی اختیار کرنے لگے۔[۲۵] فشر کے مطابق اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی مقبوضات بڑھنے سے ہندوستان سے انگلستان جانے والوں کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اس دور میں برطانویوں نے کثیر تعداد میں انڈین ملازم، مالی، مالشی، باورچی، کلرک، منشی، مترجم اور آیا وغیرہ اپنے خدمت گاروں کے طور پر رکھے اور انگلستان جاتے ہوئے ان میں سے اکثر کو اپنے ساتھ لے جاتے۔[۲۶] اس طرح ۱۷۷۹ء تک انگلستان جانے والے ہندوستانی باشندوں (جن میں ملازم، ملاح، جہازران، عورتیں، بچے، دانشور، استاد، منشی اور حکومتی نمائندے وغیرہ شامل تھے) کی تعداد میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔[۲۷]

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان سے یورپ کی طرف سفر کرنے والوں میں ہمیں کچھ ایسے ہندوستانی باشندوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں جنہوں نے مختلف مقاصد کے تحت انگلستان و یورپ کا نہ صرف سفر اختیار کیا بلکہ یورپ سے متعلق اپنے سفر کے حالات و واقعات اور مشاہدات کو سفر ناموں کی صورت میں بھی قلمبند کیا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے یہاں (برصغیر میں) یورپ سے متعلق سفر نامے لکھنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز دراصل ہندوستان میں برطانوی ابتدائی نوآبادیاتی دور سے شروع ہوتا ہے۔

اب تک ہمیں اٹھارہویں صدی کے جن سفر نامہ نگاروں اور سفر ناموں کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں

ہیں ان میں سب سے پہلے محمد عبد اللہ نامی شخص کا ذکر آتا ہے۔ محمد عبد اللہ نے تقریباً ۱۷۷۰ء میں روس و چین کی سیاحت کی اور روس و چین کی سیاحت پر مبنی ایک سفر نامہ بھی تحریر کیا۔[۲۸] ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس سفر نامے کے فارسی مخطوطے کے عکس کا جو برٹش لائبریری سے حاصل کیا گیا تھا اردو میں ترجمہ کیا اور اس پر ایک جامع تعارف تحریر کر کے سفر نامۂ روس و چین کے عنوان سے اسے تحقیقی مجلے بازیافت میں ۲۰۱۴ میں شائع کرایا۔اس کے بعد یورپ جانے والے اور یورپ کے سفر سے متعلق سفر نامے تحریر کرنے والے جن اشخاص کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے پہلے بنگال کے رہائشی منشی اسماعیل کا نام آتا ہے۔ منشی اسماعیل نے ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۳ء کے دوران اپنی مالی مشکلات کے پیش نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر مسٹر کلاڈر سل کے منشی کی حیثیت سے انگلستان کا سفر کیا اور اپنے سفری مشاہدات و تجربات پر مبنی ایک سفر نامہ تاریخ جدید کے عنوان سے فارسی زبان میں تحریر کیا۔[۲۹] ڈاکٹر نجیبہ عارف کی ذاتی کوششوں اور دلچسپی کی بنا پر ڈاکٹر جواد ہمدانی کے تعاون سے اس نادر و نایاب سفر نامے کا ترجمہ کیا گیا اور ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس پر ایک جامع تعارف تحریر کر کے ۲۰۱۴ء میں اسے ایک تحقیقی مجلے بنیاد میں شائع کروایا۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان سے یورپ کی طرف سفر کرنے والے ہمارے اگلے ہندوستانی باشندے منشی اعتصام الدین ہیں۔ انہوں نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان شاہ عالم بادشاہ کے ایلچی کپتان سوئنٹین کے ساتھ بطور معاون اور ماہر فارسی دان منشی کی حیثیت سے انگستان کا سفر کیا۔انہوں نے انگلستان کے ساتھ ساتھ یورپ کے کچھ دوسرے ممالک جیسے کہ فرانس اور اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں بھی کچھ وقت گزارا اور یورپی تہذیب و تمدن کا بغور مشاہدہ کیا۔ ۱۷۸۵ء میں انہوں نے یورپ سے متعلق اپنی سفری روداد کو سفر نامہ کی صورت شگرف نامۂ ولایت کے عنوان سے فارسی زبان میں تحریر کیا۔[۳۰] میر حسن نورانی نے ۱۹۹۳ء میں اس سفر نامہ کو فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

اٹھارہویں صدی میں یورپ کا سفر کرنے والے ہمارے اگلے سفر نامہ نگار میر محمد حسین لندنی ہیں۔انہوں نے ۱۷۷۵ء میں یورپ کا سفر کیا اور یورپ کے متعلق اپنے مشاہدات (سائنسی ترقی وایجادات اور علم فلکیات کے جدید نظریات) پر مبنی ایک رسالہ جسے دراصل سفر نامہ ہی تصور کیا جاتا ہے پہلے عربی اور پھر فارسی زبان میں تحریر کیا۔[۳۱] حکیم سید محمود احمد برکاتی نے اس سفر نامے کے عربی متن کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اسے مشاہدات فرنگ کے عنوان سے شائع کروایا۔

ان کے علاوہ اٹھارویں صدی میں دو ہندوستانی باشندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے سفر نامے انگریزی زبان میں تحریر کیے۔ ان میں جوزف امین(Joseph Emin)،(1726-1809) نے جو آرمینی عیسائی تھا

لندن میں ۱۷۹۲ء میں life and Adventures of Joseph Emin ,an Armenian, written in English by himself کے عنوان سے اپنا سفر نامہ شائع کروایا۔ جب کہ شیخ دین محمد (Sake Dean Mahomet1759-1851) جو اسلام سے انگلیسائی عیسائیت میں داخل ہو گیا تھا اس نے ۱۷۹۴ میں دو جلدوں پر مشتمل اپنا سفر نامہ *The Travels of Dean Mahomet* کے عنوان سے کارک (آئر لینڈ) سے شائع کروایا۔[۳۲] ان سفر ناموں کو اب تک اردو زبان میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔

مرزا ابو طالب اصفہانی کا سفر نامہ اگرچہ انیسویں صدی میں (یورپ میں ۱۸۱۰ء اور فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام ہندوستانی پریس کلکتہ سے) شائع ہوا مگر انہوں نے اپنے سفر کا آغاز ۱۷۹۹ء یعنی اٹھارہویں صدی کے اختتام پر کیا اور انہیں اٹھارہویں صدی کی ہندوستانی اشرافیہ میں چونکہ خاص اہمیت بھی حاصل تھی۔ لہذا یہاں اُن کے سفر نامہ کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ابو طالب نے ۱۷۹۹ء سے ۱۸۰۴ء تک انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک کا سفر کیا۔ بعد ازاں ہندوستان واپس آ کر انہوں نے اپنے یورپ سے متعلق سفری مشاہدات و تجربات کو مسیر طالبی فی بلاد افرنجی کے عنوان سے سفر نامے کی صورت میں فارسی زبان میں ترتیب دے دیا۔ مرزا ابو طالب کی طرح ان کے سفر نامہ کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریزی زبان میں بھی اس سفر نامے کا ترجمہ کیا گیا جبکہ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۱۴ء میں بالترتیب فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں اس سفر نامے کا خلاصہ شائع کیا گیا۔ اردو زبان میں اس سفر نامے کا ترجمہ ڈاکٹر ثروت علی نے کیا اور ۱۹۸۴ء میں اسے قومی کونسل برائے اردو زبان ہندوستان سے شائع کروایا۔[۳۳]

۳۔ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر کی گئی سابقہ تحقیقات کا تعارف اور تنقیدی جائزہ:

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشائی باشندوں کے تحریر کردہ سفر نامے جن کا پیچھے ذکر کیا گیا ہے چونکہ ہندوستان میں برطانوی (ایسٹ انڈیا کمپنی کے) ابتدائی نوآبادیاتی دور میں تحریر کیے گئے تھے لہٰذا خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سفر ناموں کو تحریر کرنے والے تقریباً تمام ہندوستانی باشندے ایسٹ انڈیا کمپنی یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں کے ساتھ کسی نہ کسی طور پر وابستہ رہے لہٰذا ان سفر ناموں کے مصنفین بعض تاریخی، سیاسی و سماجی صداقتوں اور واقعات کے عینی شاھدین بھی تھے جن کا ذکر انہوں نے اپنے سفر ناموں میں بھی کیا۔ اس طرح اٹھارہویں صدی کے ان سفر ناموں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور ان سفر ناموں کا مطالعہ کئی پہلوؤں سے معنی خیز اور دلچسپ ثابت ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور میں اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ان پر مختلف پہلوؤں سے تحقیقی کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ تحقیق زیادہ تر انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ اردو میں انیسویں صدی کے یورپ سے متعلق لکھے گئے سفر ناموں پر تو مختلف حوالوں سے تحقیقی کام کیے جا چکے ہیں مگر اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں پر کوئی باقاعدہ تحقیقی کام ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکا ہے۔ لٰہذا مجوزہ تحقیقی موضوع اٹھـــــارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفرناموں میں تصورِ یورپ: نوآبادیاتی مطالعہ اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے پہلا منفرد اور مفید تحقیقی کام ثابت ہوگا۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنے تحقیقی موضوع کے مطابق اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگار اور سفر ناموں کے تعارف اور تفصیلی بحث کا آغاز کریں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان سفر ناموں پر انگریزی اور اردو میں کی جانے والی سابقہ اور متعلقہ تحقیقات کا بھی ایک سرسری جائزہ لے لیا جائے تاکہ ان سفر ناموں پر کی جانے والی سابقہ تحقیقات کی مختلف جہات کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اس طرح مجوزہ تحقیقی کام کی ضرورت، انفرادیت اور اہمیت کو اجاگر کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ اس ضمن میں سب سے پہلے اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی باشندوں کے یورپ سے متعلق لکھے گئے سفر ناموں پر انگریزی میں کی گئی سابقہ و متعلقہ تحقیقات کا مختصر تعارف و تنقیدی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

ا۔ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر کی گئی سابقہ و متعلقہ انگریزی تحقیقات کا تعارف و تنقیدی جائزہ:

انگریزی میں اگر ہندوستانی باشندوں کے یورپ کے حوالے سے لکھے گے سفر ناموں پر کیے گئے تحقیقی کاموں کی بات کی جائے تو کچھ محققین نے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اہلِ مشرق خاص کر برصغیر کے باشندوں کے دیارِ مغرب کی طرف ہجرت، قیام، ان کے احوال اور یورپ کے بارے میں ان کے تاثرات پر مبنی اپنا تحقیقی کام پیش کیا ہے لیکن اگر بطورِ خاص اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کے حوالے سے بات کی جائے تو ان پر کیے گئے تحقیقی کام زیادہ نہیں ہیں۔ یہاں بہرحال انگریزی میں کیے گئے اُن چند تحقیقی کاموں کا تعارف و تنقیدی جائزہ پیش کیا جارہا ہے جو میرے مجوزہ تحقیقی موضوع سے متعلق اور اہمیت کے حامل ہیں۔

گلفشاں خان کی وقیع کتاب *Indian Muslim Perception of the West during the Eighteenth Century* اس حوالے سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب دراصل گلفشاں خان کا ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے حصول کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ جدید تاریخ کے لیے لکھا

جانے والا مقالہ ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۹۳ء میں مکمل کیا گیا۔ [۳۴]

اس مقالے میں اٹھارہویں صدی میں برصغیر کا منظر نامہ، تاج برطانیہ کی گرفت اور اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی مغرب اور خاص کر انگلستان کے بارے میں لکھی جانے والی تحریروں سے مغرب کے بارے میں اُن کے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کی کوشش کی گی ہے۔ اس ضمن میں اٹھارہویں صدی میں لکھے گئے سفر ناموں کے متون کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی تحریر کردہ ان تصانیف کے ذریعے یورپ کی سماجی زندگی، مذہب، سیاسی اداروں اور سائنسی ایجادات کے بارے میں ان مصنفین کے تاثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ محققہ نے ان تمام چیزوں کا مطالعہ اٹھارہویں صدی کے ثقافتی پہلو کے تناظر میں کیا ہے۔ محقق کے اپنے الفاظ میں:

> .... It attempts to increase the existing knowledge of a relatively un-researched period by exploring the cultural paradigm of the eighteenth century...[۳۵]

یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب سے پہلے ابتدائیہ میں ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں مغلیہ سلطنت میں سیاسی اور ثقافتی انتشار و زوال کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں فارسی اور اردو زبان کی اہمیت اور استعمال کے ساتھ ساتھ ادب کی مختلف اصناف کا مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مغل انتظامیہ اور بیورو کریسی کے نظام، کارکردگی نیز اٹھارہویں صدی کی بدلی ہوئی سیاسی فضا میں ہندوستانی باشندوں کی انگریز سرکار کی ملازمت اختیار کرنے اور ان ملازمتوں کی نوعیت بیان کرنے پر توجہ دی گئی ہے۔ [۳۶]

مقالے کے پہلے باب Indian perception of Europe's Political Expansion میں یورپ کے متعلق ہندوستانی باشندوں کے روایتی قسم کے خیالات کو بیان کیا گیا ہے جو ہندوستان میں باقاعدہ برطانوی نوآبادیاتی دور شروع ہونے سے پہلے یورپ کے متعلق ہندوستانی باشندوں کی مجموعی معلومات کا احاطہ کرتے ہیں۔ برطانیہ اور فرانس کی مصر میں چپقلش اور ایران میں برطانوی رسائی پر بحث کرتے ہوئے امریکہ کی جنگِ آزادی اور انقلابِ فرانس کا ہندوستان اور اسلامی دنیا پر بحیثیت مجموعی اثرات کا جائزہ اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی مصنفین کے نقطۂ نظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے مصنفین میں سے خاص طور پر ابو طالب، عبد اللطیف اور احمد بن محمد کے حوالے سے غیر یورپی تہذیبوں پر یورپی یلغار کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی و سیاسی حیثیت نیز کمپنی کی انتظامی پالیسی، اور اس کے سماجی و معاشی زندگی خاص کر بنگال پر اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ [۳۷]

دوسرے باب The Observer میں اٹھارہویں صدی کے مصنفین اور سفر نامہ نگاروں اعتصام الدین، مرتضیٰ حسین بلگرامی، غلام حسین خان طبائی، میر محمد حسین، ابو طالب اور عبد اللطیف کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ مصنفین کی سماجی حیثیت، تعلیمی پس منظر اور ان کی پیشہ ورانہ زندگی کے حوالے سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔[۳۸]

تیسرے باب The World View of the Eighteenth Century Writers میں اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی مصنفین کی معلومات کے پیش نظر یورپ کی جغرافیائی تقسیم، ترقی کے اسباب، امریکہ کی دریافت اور اس کی اہمیت پر دلائل پیش کئے گئے ہیں۔[۳۹]

چوتھے باب Religion میں اٹھارہویں صدی کے مصنفین کے نقطۂ نظر سے عیسائیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنفین کے نقطۂ نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحریکِ اصلاح کا جائزہ لیا گیا ہے اور مغرب میں بڑھتی ہوئی بے اعتقادی، مادیت پرستی اور لامذہبیت جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان بعض متنازعہ موضوعات اور برطانیہ میں پادریوں کے سماجی کردار پر بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔[۴۰]

پانچویں باب Observations on British Life میں مصنفین کے نقطۂ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے برطانوی سماج کے مختلف پہلوؤں مثلاً خاندانی زندگی، خوراک، لباس، رسم و رواج، وغیرہ جیسے موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انگلش، آئرش اور سکاٹش باشندوں کے درمیان انفرادی اختلافات کو بیان کیا گیا ہے۔[۴۱]

چھٹے باب Education andOrientalism میں یورپی اور خاص طور پر برطانوی نظام تعلیم نیز مستشرقین کی مشرقی علوم اور زبانوں خاص کر فارسی زبان و ادب میں دلچسپی کی وجوہات مصنفین کے نقطۂ نظر کے مطابق قلمبند کی گئی ہیں۔[۴۲]

ساتویں باب Scientific and Technical Development in Europe میں یورپ کی سماجی اور فکری ترقی پر بحیثیت مجموعی اور برطانیہ پر بالخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔ مغرب میں دیگر سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ پرنٹنگ کی ایجاد اور اس کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سائنسی ایجادات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مصنفین کے لیے تجسس کا باعث بنیں۔[۴۳]

آٹھویں باب Political institution in Britain میں برطانیہ کی سیاست اور سیاسی اداروں سے متعلق اٹھارہویں صدی کے مصنفین کی آراء کو پیش کیا گیا ہے۔[۴۴]

مقالے کے اختتام پر برطانیہ کے متعلق ہندوستانی تصورات میں تسلسل اور تبدیلیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

گلفشاں خان کے اس تحقیقی کام کا اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو بے شک اپنی نوعیت کا مختلف، دلچسپ اور معلوماتی تحقیقی کام ہے۔ محقق نے اٹھارہویں صدی کے جن مصنفین و سفر نامہ نگاروں کی مغرب کے بارے میں آراء سے استفادہ کیا ان میں اعتصام الدین، محمد حسین، ابو طالب، مرتضیٰ حسین بلگرامی، غلام حسین خان طباطبائی، احمد بن محمد اور عبداللطیف شامل ہیں۔ محقق کے مصنفین میں سے اعتصام الدین، محمد حسین اور ابو طالب نے براہِ راست سفرِ یورپ اختیار کیا تھا اور یورپی تہذیب و تمدن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جبکہ بقیہ تمام افراد نے ہندوستان میں رہتے ہوئے ہی یہاں برطانوی اقتدار کو مستحکم ہوتے دیکھا تھا۔ ان میں احمد بن محمد کے سوا تقریباً تمام ہی حکومتی عہدوں پر فائز رہے۔ یوں انہیں انگریزوں کے ساتھ رہنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔[۴۵] یوں دیکھا جائے تو گلفشاں خان نے اپنے اٹھارہویں صدی کے تقریباً تمام مصنفین کے حالاتِ زندگی، سفرِ یورپ کے احوال (ان کے جنہوں نے سفرِ یورپ اختیار کیا) مغرب کے بارے میں مصنفین کی آراء و تاثرات کو جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے مگر انہوں نے اپنی تحقیق میں اٹھارہویں صدی کے ایک اہم سفر نامہ نگار منشی اسماعیل کو اپنے مصنفین میں نہ تو شامل کیا ہے نہ ان کے سفر نامہ تاریخ جدید کا کوئی تذکرہ کیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مذکورہ محقق منشی اسماعیل سے ناواقف تھیں کیونکہ انہوں نے اعتصام الدین کے تعارف میں منشی اسماعیل کا ذکر چند سطور کے اندر کیا ہے مگر ان کے سفرِ انگلستان اور سفر نامہ کو بہر حال بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

سمونتی سین (Simonti Sen) کی کتاب *Travels to Europe: Self and other in Bengali-Travel Narratives 1870-1910* اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں کے حوالے سے مرا اگلا منتخب کردہ تحقیقی کام ہے۔ اس تحقیقی کام کے ذریعے ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء تک یورپ جانے والے ہندو بنگالی سفر نامہ نگاروں کے سفری احوال کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے۔ یہ تحقیقی کام دراصل ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھا جانے والا تحقیقی مقالہ ہے جسے ۱۹۹۵ء میں مکمل کیا گیا۔ بعد ازاں اضافہ و ترمیم کے ساتھ ۲۰۰۵ء میں اسے پہلی مرتبہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔[۴۶]

یہ تحقیقی کام اگرچہ میرے موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں ہے کیونکہ اس میں اٹھارہویں صدی کی بجائے اُنیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے پہلے عشرہ تک یورپ سے متعلق بنگالی ہندوؤں کے سفر ناموں کا امپریل اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم اس مقالے کے پہلے باب Another East and Another West میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ۱۸۷۰ء تک یورپ جانے والے

سفر نامہ نگاروں کے حالاتِ زندگی اور ان کے سفرِ یورپ کے متعلق تجربات و مشاہدات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں اس تحقیقی مقالے کی ذیل میں اسی متعلقہ حصّے کو زیرِ بحث لایا جا رہا ہے۔

مجموعی طور پر یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابواب سے پہلے تعارف اور آخر میں تحقیقی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ تعارف میں قدیم ہندی ادبی روایت میں سفر کے حوالے سے پائے جانے والے اندیشوں اور خطرات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء تک یورپ جانے والے بنگالی سفر نامہ نگاروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔[۴۷]

اب اگر بات کریں کتاب کے پہلے باب Another East and Another West کی تو اس میں ۱۸۷۰ء تک یورپ جانے والے سفر نامہ نگاروں کا مختصر سا تعارف اور ان کے یورپ کے بارے میں مشاہدات و تاثرات پر مختصر سا تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ ان سفر نامہ نگاروں میں مرزا شیخ اعتصام الدین، مرزا ابو طالب خان، مرزا ابو الحسن خان، یاناگا واسا کیو (Yanagawa Masakiyo)، ارداسیر کرسیت جی (Ardaseer Cursetjee)، جہانگیر نورو جی اور ہر جی بھوئے مروان جی (Hirjeeboy Merwanjee) شامل ہیں۔

ان میں صرف مرزا اعتصام الدین اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگار ہیں جبکہ بقیہ تمام سفر نامہ نگاروں نے انیسویں صدی میں ۱۸۷۰ء تک یورپ کا سفر کیا۔ اس باب میں تمام سفر نامہ نگاروں کے بحری سفر کے مشاہدات و تجربات کو بیان کیا گیا ہے۔ اعتصام الدین، ابو طالب اور دوسرے سفر نامہ نگاروں کے نقطۂ نظر سے کیپ ٹاؤن، لندن اور دوسرے شہروں کی عمارتوں، سکولوں اور کالجوں وغیرہ کے متعلق مشاہدات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے اور سفر ناموں سے چند ایک ایسے اقتباسات کو پیش کیا گیا ہے جس سے سفر نامہ نگاروں کی یورپ کی سائنسی و تکنیکی ترقی سے خاص دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ انگلستان کی معاشرت کے چند ایک پہلوؤں کے متعلق سفر نامہ نگاروں کی آراء کو بیان کیا گیا ہے۔[۴۸]

کتاب کے بقیہ ابواب میں انیسویں صدی میں ۱۸۷۰ء تک یورپ جانے والے بنگالی اشرافیہ کے سفرِ یورپ کے تجربات، تاثرات وغیرہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور آخر میں تحقیقی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ اب اگر ہم سمونتی سین کی کتاب کے تنقیدی جائزہ کی طرف بڑھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ محقق کا تحقیقی موضوع ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء تک یورپ جانے والے بنگالی ہندو سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کے تحقیقی جائزہ پر مشتمل ہے۔ تاہم محقق نے خود اپنی کتاب کے پہلے باب Of Another East and Another West میں The Precolonial Travellers کی ذیل میں اٹھارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی میں ۱۸۷۰ء تک یورپ جانے والے سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کا جائزہ بھی لینا چاہا ہے۔ مگر سمونتی سین نے اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگاروں میں

صرف ایک سفر نامہ نگار اعتصام الدین اور ان کے سفر نامے کو ہی موضوع بحث بنایا ہے جبکہ بقیہ دو اہم سفر نامہ نگار منشی اسماعیل اور میر محمد حسین لندنی اور ان کے سفر ناموں بالترتیب تاریخ جدید اور مشاہدات فرنگ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ محقق اپنے اس ایک باب میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سب سفر نامہ نگاروں کا تفصیلی تعارف اور ان کے سفر ناموں کے حوالے سے تفصیلی معلومات و تبصرہ پیش نہیں کر سکیں۔

مائیکل ایچ فشر (Michael H.Fisher) کی کتاب *Counter flows to Colonialism: Indian Travellers and Settlers in Britain 1600-1857* میرا اگلا منتخب کردہ تحقیقی کام ہے۔ یہ کتاب اگرچہ میرے تحقیقی موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں ہے اور اس تحقیقی کام کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب ہندوستانی باشندوں کے انگلستان یا یورپ سے متعلق لکھے گئے سفر ناموں کا جائزہ پیش نہیں کرتی۔ یہ کتاب دراصل ایک وسیع پراجیکٹ کا شاخسانہ ہے۔ اس کتاب میں ۱۶۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کے دورانیہ یعنی ہندوستان میں نوآبادیاتی دور سے پہلے، ابتدائی نوآبادیاتی دور اور نوآبادیاتی دور کے باقاعدہ آغاز تک ہندوستان سے انگلستان جانے والے باشندوں (بچوں، عورتوں، غلاموں، نوکروں، منشیوں، عالموں، ملاحوں، تاجروں اور شاہی افسروں وغیرہ) کا ایک طرح سے ریکارڈ فراہم کیا گیا ہے۔

یہ جاننے کے لیے کہ محقق نے اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کو کس ذیل میں رکھتے ہوئے ان کے بارے میں کیا معلومات فراہم کی ہیں؟ راقم الحروف نے اس کتاب کو بھی اپنے جائزہ میں شامل کیا ہے۔ یہ کتاب مجموعی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے جو دس ابواب پر مشتمل ہیں۔ ابواب سے پہلے تعارف جبکہ آخر میں تحقیقی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ میرے تحقیقی موضوع کا دورانیہ چونکہ اٹھارہویں صدی تک محدود ہے للذا یہاں منتخب کردہ کتاب کے پہلے اور دوسرے حصّے کو (اٹھارہویں صدی تک) زیرِ بحث لایا جائے گا۔

کتاب کے تعارف میں ۱۶۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک برطانویوں اور ہندوستانی باشندوں کی ایک دوسرے کے متعلق معلومات، آپس کے تعلقات (تجارتی اور سیاسی) تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی (۱۸۵۷ء) کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ برطانوی مردوں کی ہندوستانی عورتوں سے شادیاں، اولاد نیز ان کے طبقات کو بھی مختصراً زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ [۴۹]

کتاب کے پہلے باب *Early Interaction: Indian, Britains and the Company 1600-1750* میں ۱۶۰۰ء سے ۱۷۵۰ء تک ۱۵۰ سالہ دور یعنی ہندوستان میں نوآبادیاتی دور شروع ہونے سے پہلے ہندوستان سے برطانیہ جانے والے ہندوستانی باشندوں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ معلومات ہندوستانی باشندوں کی سماجی حیثیت، ان کی ذات پات، ان کی انگلستان جانے کی وجوہات، انگلستان میں ان کا قیام، کمپنی سے ان کے تعلقات وغیرہ کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس حصّے میں مغل دربار سے وابستہ خاتون (مریم)، آرمینی اور

پارسی تاجروں، ہندوستانی ملاحوں کشتی بانوں اور غلاموں کے **متعلق معلومات** فراہم کی گئی ہیں جو اس عرصہ میں ہندوستان سے انگلستان کی طرف گئے۔ انگریز مالکوں کا ہندوستانی خریدے گئے غلاموں کے ساتھ رویہ انہیں عیسائیت میں داخل کرنے کے حوالے سے مالکوں کا کردار اور کمپنی کی انگلستان میں ہندوستانی غلاموں کی خرید و فروخت کے حوالے سے بھی مختصر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ [۵۰]

کتاب کے دوسرے باب *Indian in Britain as British Colonial Conquests Begin 1750-1790* میں ۱۷۵۰ء سے ۱۷۹۰ء تک ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے ابتدائی منظر نامہ میں مغلیہ سلطنت کے زوال، انگریزوں کی ہندوستان پر بڑھتی ہوئی گرفت اور سیاسی و تجارتی سرگرمیوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے ۱۷۵۰ء سے ۱۷۹۰ء تک کے عرصہ میں انگلستان جانے والوں میں منشی اعتصام الدین کو مغل دربار سے جانے والوں کی ذیل میں شامل کرتے ہوئے ان کے بارے میں **مختصر معلومات** فراہم کی گئی ہیں۔ منشی اعتصام (۱۷۳۰ء۔ ۱۸۰۰ء) کے انگلستان جانے کے مقصد، مقصد میں ناکامی اور پھر ان کی تحریر کردہ کتاب شگرف نامۂ ولایت پر مختصر سا تبصرہ ملتا ہے۔ [۵۱]

کتاب کے تیسرے باب Indian Scholars and Teachers میں ہندوستان میں کمپنی کے مقبوضہ رقبے اور ہندوستانی دانشوروں، عالموں، استادوں جو فارسی ادب، اسلامی سائنس اور مغل انتظامی تکنیکوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے انگلستان جانے کے **متعلق معلومات** فراہم کی گئی ہیں۔ محقق نے ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کو انڈین عالموں اور استادوں کی ذیل میں رکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان استادوں میں منشی اعتصام الدین ۱۷۶۶ء۔۱۷۶۸ء میں مغل بادشاہ کا مقدمہ لے کر انگلستان گئے۔ منشی اسماعیل، فارسی زبان کے ماہر ۱۷۷۲ء میں کلاڈ رسل کے ہمراہ انگلستان گئے، میر محمد حسین ابن عبد الاعظیم اصفہانی ۱۷۷۵ء۔۱۷۷۶ء میں ایلیٹ (Elliot) کے ہمراہ انگلستان گئے۔ مرزا ابو طالب خان اصفہانی ۱۷۹۹ء۔ ۱۸۰۲ء کے درمیان ڈیوڈر چرڈسن کے ہمراہ انگلستان گئے۔ محقق کے مطابق ان چاروں ہندوستانی باشندوں نے فارسی اور عربی میں انگلستان سے متعلق اپنے مشاہدات اور تجربات کو اپنی کتابوں میں قلمبند کیا۔ محقق نے ان سفر نامہ نگاروں کے مشاہدات کو بغیر تخصیص کے بحیثیت مجموعی مختصراً بیان کر دیا ہے۔ صرف ابو طالب کے سفر نامے سے ایک آدھ اقتباس کو بطور مثال پیش کر دیا ہے۔ اس باب میں انیسویں صدی میں انگلستان میں بھرتی شدہ سول سرونٹ اور ملٹری کیڈٹس کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کی خاطر قائم کردہ دو کالجوں ہلبری (Halbury, 1806) اور دوسرا کالج جو ۱۸۰۹ء میں لندن کے جنوب میں Addiscomb میں قائم کیا گیا، میں آنے والے اساتذہ (ہندوستانی اور انگریز) کی قابلیت، عہدوں، تنخواہوں وغیرہ پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ [۵۲]

اس کتاب کے بقیہ ابواب انیسویں صدی میں ہندوستان کے مختلف طبقات اور پیشوں (ملاح، ملازم، نوکر، سفیر وغیرہ) سے تعلق رکھنے والے باشندوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں اور ابواب کے آخر میں تحقیقی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ اب اگر ہم مائیکل ایچ فشر کی اس کتاب کے تنقیدی جائزہ کی طرف بڑھیں تو جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا تھا کہ یہ کتاب ۱۶۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک یعنی ہندوستان میں نوآبادیاتی دور سے پہلے اور ابتدائی نوآبادیاتی دور میں ہندوستان سے انگلستان جانے والے باشندوں (ملاحوں، منشیوں، استادوں، عالموں، تاجروں، سفیروں، غلاموں اور عورتوں وغیرہ) کا ایک طرح سے ریکارڈ فراہم کرتی ہے۔ یوں اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ ایک منفرد، مفید اور معلوماتی تحقیقی کام ہے۔

اس کتاب میں محقق نے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان سے انگلستان جانے والے باشندوں کو بھی مختلف طبقات (جیسے کے انڈین ملازم، غلام، سفیر، تاجر، عالم اور استاد وغیرہ) میں تقسیم کر کے ان کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کا تذکرہ باب Indian Scholars and Teachers during early Colonialism کی ذیل میں کیا گیا ہے۔ محقق نے ان ہندوستانی باشندوں جن میں اعتصام الدین، منشی اسماعیل، میر محمد حسین ابن عبدالعظیم اصفہانی، منشی محمد سمیع اور مرزا ابوطالب خان اصفہانی شامل ہیں، کا تذکرہ صرف نام لینے کی حد تک کیا ہے اور ان کے متعلق یا ان کے سفر یورپ کے مقاصد کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ محقق نے اس بات کی طرف تو اشارہ کیا ہے کہ متذکرہ بالا باشندوں میں سے چار باشندوں نے عربی اور فارسی زبان میں انگلستان کے متعلق اپنے مشاہدات کو بیان کیا ہے مگر محقق نے ان تصانیف کا نام یا ان کے متعلق کوئی معلومات بھی فراہم نہیں کیں۔ ابوطالب کے سفر نامے کے حوالے سے ایک آدھ اقتباس نقل کر دیا گیا ہے۔[۵۳] ہاں البتہ دوسرے باب میں Indian Envoys from the Mughal Empire میں منشی اعتصام الدین اور ان کے سفر نامہ شگرف نامۂ ولایت کے متعلق مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔[۵۴]

مائیکل ایچ فشر کا ہی تحریر کردہ مقالہ *From India to England and Back: Early Indian Travel Narratives for Indian Readers* اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کے حوالے سے میرا منتخب کردہ اگلا تحقیقی کام ہے۔ یہ مقالہ ۲۰۰۷ء میں یونیورسٹی آف پنسلوینیا پریس کی جانب سے Huntington Library Quarterly جرنل میں شائع کرایا گیا۔ اس مقالہ میں اٹھارہویں صدی کے چار ہندوستانی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین، میر محمد حسین اور مرزا ابوطالب خان اصفہانی

کے سفر ناموں سے ان کے انگلینڈ سے متعلق مشاہدات پر مختصر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اب اگر ہم اس مقالے کے تنقیدی جائزہ کی طرف بڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فشر نے اگرچہ اپنے اس مختصر مقالہ میں انگلینڈ سے متعلق تو چاروں سفر نامہ نگاروں کے مشاہدات و تاثرات کو مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان سفر ناموں میں بقیہ یورپی اقوام اور ممالک کے متعلق سفر نامہ نگاروں کی آراء نیز منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل کے سفر نامے میں ہندوستانی نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ حقائق پر بھی کوئی تبصرہ و تجزیہ پیش نہیں کیا گیا۔[۵۵]

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا تحریر کردہ مقالہ بعنوان *The West in South Asian Muslim Discourse A Study of Indian Muslims: Travels to the West 1757 to 1857* میرا منتخب کردہ آخری تحقیقی کام ہے۔یہ مقالہ جرنل آف انڈولوجی اینڈ ساؤتھ ایشین سٹڈیز میں ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے یورپ اور خاص کر انگلستان کے متعلق لکھے گئے سفر ناموں کے متعلق مختصر معلومات پیش کرتا ہے۔اس مقالے میں سفر نامہ نگاروں کے مراتب، پیشے، سفرِ یورپ کے مقاصد، سفر ناموں کی زبان اور اس کے علاوہ یورپ کے بارے میں ان کے تاثرات کے حوالے سے مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس مقالے میں اٹھارہویں صدی کے تین جبکہ انیسویں صدی کے (۱۸۵۷ء تک) پانچ سفر ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں منشی اسماعیل کے سفر نامے تاریخِ جدید (۱۷۷۳ء)، مرزا اعتصام الدین کے سفر نامہ شگرف نامۂ ولایت (۱۷۸۵ء) اور میر محمد حسین کے مختصر رسالے رسالۂ احوالِ ملکِ فرنگ و ہندوستان کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔انیسویں صدی کے سفر ناموں میں مرزا ابوطالب کے سفر نامے مسیرِ طالبی (۱۸۰۶ء)، یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے تاریخِ یوسفی، اس کے علاوہ نواب کریم خان جو ۱۸۴۰ء میں انگلستان گئے، لطف اللہ جو ۱۸۴۴ء میں انگلستان گئے اور مسیح الدین علوی کے سفر نامے تاریخِ انگلستان کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس مقالہ میں سفر نامہ نگاروں کا مختصر تعارف، ان کے انگلستان جانے کا مقصد، انگلستان اور یورپ کے متعلق ان کے مشاہدہ کردہ موضوعات جیسے کہ یورپ کی سیاسی و سماجی زندگی، آرائش و زیبائش، سائنسی ایجادات و سائنسی ترقی، عورتوں کی خوبصورتی وغیرہ جیسے موضوعات پر انتہائی اختصار کے ساتھ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔آخر میں تحقیقی نتائج بیان کیے گئے ہیں۔[۵۶]

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے تحریر کردہ مقالے پر اگر ایک تنقیدی نگاہ دوڑائی جائے تو اس میں ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء

تک مغرب سے متعلق جنوب ایشیائی سفر ناموں کی نہ صرف نشاندہی کی گئی ہے بلکہ ان کے متعلق مختصر مگر مفید و جامع معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں مگر اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں کے متعلق محقق کی فراہم کردہ معلومات اور تبصرہ انتہائی مختصر اور ناکافی ہے۔

ب۔ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر کی گئی سابقہ اردو تحقیقات کا تعارف و تنقیدی جائزہ:

اردو میں سفر نامے کی صنف پر اب تک جو تحقیقی کام ہوا ہے وہ زیادہ تر سفر نامے کے فن، اردو سفر نامے کی تاریخ، حج کے سفر ناموں یا انیسویں و بیسویں صدی میں مشرق و مغرب کے ممالک پر لکھے گئے سفر ناموں کے جائزہ پر مبنی ہے۔ اردو ادب میں اٹھارہویں صدی کے یورپ کے سفر ناموں پر اول تو باقاعدہ کوئی تحقیقی کام ہوا ہی نہیں ہے اور اگر ہوا بھی ہے تو اس کی نوعیت تعارفی قسم کی ہے۔ اس حوالے سے اگر سب سے پہلے سفر ناموں کی تاریخ پر لکھی گئی کتب پر نظر ڈالی جائے تو ان میں اٹھارہویں صدی میں یورپ کے حوالے سے لکھے جانے والے سفر ناموں کو زیادہ تر زیر بحث نہیں لایا گیا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کی کتاب اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ اس حوالے سے پہلی مثال ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں بھارت سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب پانچ ابواب سفر اور اس کی اہمیت، سفر نامے کا فن اور تاریخی ارتقاء، اردو سفر نامے کا ابتدائی دور (آغاز سے انیسویں صدی کے اختتام تک)، اردو میں سفر نامہ (۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک) اور عصرِ حاضر میں اردو سفر ناموں کی سمت و رفتار کا جائزہ پر مشتمل ہے۔[۵۷]

اس کتاب کے تیسرے باب اردو سفر نامے کا ابتدائی دور (آغاز سے انیسویں صدی کے اختتام تک) میں اٹھارہویں صدی کے صرف ایک سفر نامہ نگار شیخ اعتصام الدین کے سفر نامے شگرف نامۂ ولایت مختصر سا تعارف پیش کیا گیا ہے جبکہ اٹھارہویں صدی کے کسی اور سفر نامے کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی کے سفر نامہ نگار ابو طالب خان اصفہانی کے سفرنامہ مسیر طالبی فی بلاد افرنجی کا بھی مختصر سا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد انیسویں صدی میں اردو میں لکھے گئے سفر ناموں کے حوالے سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔[۵۸]

ڈاکٹر قدسیہ قریشی کی وقیع کتاب اردو سفرنامے انیسویں صدی میں دراصل ان کا پی۔ایچ۔ڈی۔ کا مقالہ تھا جسے اپنے موضوع کی افادیت اور اہمیت کی بناپر ۱۹۸۷ء میں دہلی یونیورسٹی کی اجازت سے

کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں تحقیق کے موضوع کے مطابق انیسویں صدی کے سفر ناموں کو ہی مختلف عنوانات کے تحت جیسے کہ مذہبی سفر نامے، مقامی سفر نامے اور اسی طرح انیسویں صدی کے بعض اہم سفر نامہ نگار اور سفر نامے وغیرہ میں تقسیم کر کے مفصل معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ کتاب کے دوسرے باب میں یورپ کے سفر نامے کی سرخی کے تحت آغاز اردو کے پہلے سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے عجائباتِ فرنگ کے تعارف سے کیا گیا ہے جو انیسویں صدی میں تحریر کیا گیا جبکہ اٹھارہویں صدی کے کسی سفر نامہ نگار یا سفر نامے کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔[۵۹]

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی کتاب اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ (۱۹۹۹ء) میں منظرِ عام پر آئی۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سفر نامے کے فن، ہندوستان سے متعلق غیر ملکی اقوام کے لکھے گئے قدیم سفر ناموں اور ان کے تراجم کے علاوہ حج ناموں اور جدید دور کے سفر ناموں کے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں لیکن مصنف نے یورپ کے حوالے سے لکھے گئے سفر ناموں کے حوالے سے آغاز انیسویں صدی میں تحریر کیے گئے یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے تاریخِ یوسفی (۱۸۴۷ء) سے ہی کیا ہے اور اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگاروں اور ان کے سفر ناموں کے متعلق کسی قسم کی معلومات فراہم نہیں کیں۔[۶۰]

اردو سفر ناموں کی تاریخ کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اور اہم، مفید اور معلوماتی کتاب ڈاکٹر انور سدید کی اردو ادب میں سفرنامہ ہے۔ یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سفر نامے کی فنی حیثیت، قدیم غیر ملکی سیاحوں اور ان کے سفر ناموں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اردو سفر نامے کی ابتداء سے لے کر جدید دور میں بیسویں صدی (۱۹۸۷ء) تک اردو سفر نامہ نگاروں اور ان کے سفر ناموں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے تیسرے باب اردو سفر نامے کی ابتداء میں انیسویں صدی کی ابتداء میں چند ایسے ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے فارسی میں سفر نامے تحریر کیے۔ ان میں ابو طالب خان کے سفر نامے مسیر طالبی اور مصطفیٰ خان شیفتہ کے سفر نامے جذب القلوب کا ذکر کیا گیا ہے مگر اٹھارہویں صدی کے کسی فارسی سفر نامہ نگار کا تذکرہ بہر حال نہیں کیا گیا۔[۶۱]

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو سفر نامے کی تاریخ کے حوالے سے لکھی جانے والی یہ تمام کتب بلاشبہ اپنے موضوعات، مواد اور افادیت کی بنا پر بہت اہم ہیں مگر ان کتب میں چند ایک کے سوا باقی تمام کتب اپنی تاریخ یورپ کے حوالے سے لکھے جانے والے سفر ناموں میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے تاریخِ یوسفی سے شروع کرتی ہیں۔ یہ سفر نامہ انیسویں صدی میں تحریر کیا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے سفر نامے چونکہ اصلاً فارسی اور عربی زبان

میں تحریر کیے گئے تھے۔ شاید اسی لیے اردو سفر نامے کی تاریخ میں ان کے تذکرے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ بعض اہلِ علم اردو دان طبقے نے اٹھارہویں صدی کے ان سفر ناموں کی قدر و منزلت کا تعین کرتے ہوئے انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ان سفر ناموں کو فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی طرف توجہ دی۔ ان حضرات نے نہ صرف سفر ناموں کو اردو میں ترجمہ کیا بلکہ کتاب کے تعارف میں سفر نامہ نگاروں کے بارے میں معلومات اور سفر ناموں کے اہم نکات کو بھی مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگاروں اور ان کے سفر ناموں پر اگر ہمیں تحقیقی کام (جو اب تک کیا گیا ہے) ملتا ہے تو وہ اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں کے تراجم پر مبنی کتب میں موجود تعارفی قسم کے نوٹ کی صورت میں ہے۔

اٹھارہویں صدی کے سفر ناموں کے تراجم کے حوالے سے سب سے پہلے جس کتاب کا ذکر کیا جارہا ہے وہ ہے منشی اعتصام الدین کا سفر نامہ شگرف نامۂ ولایت، امیر حسن نورانی نے ۱۹۹۴ء میں اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کر کے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے اسے شائع کروایا۔ مترجم نے آغاز میں منشی اعتصام الدین کا تعارف اور ان کے سفر نامہ کے اہم نکات کو مختصراً بیان کیا ہے۔ مترجم نے منشی اعتصام الدین کو انگلستان کا پہلا سیاح اور ان کے سفر نامے کو انگلستان کے حوالے سے کسی ہندوستانی کی جانب سے لکھا جانے والا پہلا سفر نامہ قرار دیا ہے۔ [۱۲] شاید مترجم کو منشی اسماعیل کے سفر انگلستان اور ان کے سفر نامے کے بارے میں اس وقت تک کوئی معلومات نہ تھیں۔

سفر ناموں کے تراجم کے حوالے سے میری اگلی منتخب کردہ کتاب میر محمد حسین لندنی کا عربی رسالہ، رسالہ احوال ملک فرنگ و ہندوستان ہے۔ اسے اردو میں حکیم سید محمود احمد برکاتی نے ترجمہ کیا اور اسے مشاہدات فرنگ کا عنوان دیا۔ اس کتاب کی ترتیب اور تعارف لکھنے کا کام ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے کیا۔ اسے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور سے شائع کروایا گیا۔ اس کتاب میں میر محمد حسین لندنی کے سفر نامہ کے اردو ترجمہ کے علاوہ دیگر دس ابواب میں برصغیر پاک و ہند اور یورپ کے قدیم روابط، فرنگی واردان برعظیم (سیاح، ڈاکٹر وغیرہ) نیز مسافرانِ فرنگ کے بارے میں مختصر مگر جامع قسم کی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ انہی مسافران فرنگ میں مترجم نے منشی اعتصام الدین اور ان کے سفر نامہ کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔ [۱۳] بعد ازاں میر محمد حسین لندنی اور ان کی تصانیف کا مختصر سا تعارف پیش کرنے کے بعد میر محمد حسین کے عربی سفر نامہ کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں منشی اسماعیل یا ان کے سفر نامے کا تذکرہ نہیں ملتا۔

اٹھارہویں صدی کے دو نادر و نامعلوم سفر ناموں کو اردو ادب سے متعارف کرانے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف کا اہم کردار ہے۔ انہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی، کوشش اور محنت سے نہ صرف ان سفر ناموں کو تلاش کر کے ان کا فارسی

سے اردو میں ترجمہ کرایا بلکہ ان پر مفصل تعارف اور مفید حواشی کا اضافہ کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا۔ ان میں منشی اسماعیل کا سفر نامہ تاریخِ جدید (۱۷۷۳ء) اور محمد عبداللہ کا سفر نامہ روس و چین (تقریباً ۱۷۷۰ء) شامل ہیں۔

تاریخِ جدید ۲۰۱۴ء میں مجلہ بنیاد کی پانچویں جلد میں شائع ہوا جبکہ سفر نامہ روس و چین تحقیقی و تنقیدی مجلہ بازیافت میں ۲۰۱۴ء میں ہی شائع ہوا۔ ان سفر ناموں کے تعارف میں بھی نے اٹھارہویں صدی کے دوسرے سفر ناموں (شگرف نامۂ ولایت اور مشاہدات فرنگ) یا سفر نامہ نگاروں کا تو تذکرہ کیا نہیں ملتا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر بحیثیت مجموعی کوئی بھی باقاعدہ تحقیقی کام کسی بھی حوالے سے مجوزہ تحقیق سے پہلے نہیں کیا گیا۔

۴۔ مجوزہ تحقیق، ضرورت، اہمیت اور انفرادیت

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں پر سابقہ (اردو اور انگریزی میں کئے گئے) تحقیقی مطالعات کے تعارف و تنقیدی جائزہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام تحقیقی مطالعات کی جہات اور انداز ایک دوسرے سے اور میرے مجوزہ تحقیقی موضوع 'اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں تصورِ یورپ: نو آبادیاتی مطالعہ سے یکسر مختلف ہے۔

گلفشاں خان کا تحقیقی مقالہ اٹھارہویں صدی کے ثقافتی تناظر میں ہندوستانی اشرافیہ کی مغرب سے متعلق لکھی گئی تحریروں سے ان کے مغرب کے بارے میں تاثرات کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا تھا کہ اس مقالہ میں صرف یورپ کا سفر کرنے والے ہندوستانی باشندے ہی شامل نہیں بلکہ کچھ ایسے دانشوروں کی تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے یورپی یلغار اور تہذیب و تمدن کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کیا تھا۔

سمونتی سین کا پیش کردہ تحقیقی مقالہ *Travels to Europe self and other in Bengali-Travel Narratives, 1870-1910*، ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۰ء تک یورپ جانے والے صرف بنگالی ہندوؤں کے سفر ناموں کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ اس میں اٹھارہویں صدی کے صرف ایک سفر نامے کا مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مائیکل ایچ فشر کی کتاب *Counterflows to Colonialsim: Indian Travellers and Settlers in Britain 1600-1857* کا موضوع ہندوستان کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے ان باشندوں کا ریکارڈ فراہم کرنا ہے جنھوں نے ۱۶۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان سے انگلستان کا سفر کیا۔ اس لیے اس کتاب میں اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگاروں کے ذاتی تعارف یا ان کے سفر ناموں کے بارے میں جامع قسم کی معلومات فراہم کرنے کو ضروری خیال نہیں کیا گیا۔ اسی طرح فشر کے پیش کردہ مقالے *From India to England and Back:Early Indian Travel Narratives for Indian Readers* میں یورپ کے حوالے سے چار ہندوستانی باشندوں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین، میر محمد حسین اور ابو طالب کے تحریر کردہ سفر ناموں کا بحیثیت مجموعی مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے پیش کردہ تحقیقی مقالے *The West in South Asian Muslim Discourse: A Study of Indian Muslims Travels to the West 1757-1857* میں ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک جنوبی ایشیاء سے مغرب کی طرف سفر کرنے والے تقریباً تمام باشندوں کا (سوائے محمد عبداللہ کے) ذکر کیا گیا ہے اور ان کے مشاہداتِ یورپ پر مختصر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف اور فشر کے سوابقیہ محققین نے منشی اسماعیل اور ان کے سفر نامے تاریخ جدید کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ جب کہ ان دونوں محققین نے بھی اپنے مقالات کے اختصار کی بنا پر اس سفر نامے کا انتہائی مختصر جائزہ پیش کیا ہے اس طرح ہم اٹھارہویں صدی کے ایک اہم سفر نامہ نگار جس نے سب سے پہلے انگلستان کے سفر سے متعلق اپنا سفر نامہ تحریر کیا، کے قیمتی خیالات جاننے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح سوائے نجیبہ عارف کے کسی محقق نے اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی باشندے محمد عبداللہ اور اس کے سفر نامے سفر نامہ روس و چین کے متعلق بھی کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔

اردو میں جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے ہندوستانی باشندوں کے یورپ کے سفر ناموں پر بحیثیت مجموعی کوئی باقاعدہ تحقیقی کام کسی بھی حوالے سے ابھی تک پیش نہیں کیا گیا۔ تاہم مذکورہ بالا تمام تحقیقی کام اپنے موضوع کی اہمیت اور تحقیق کی جہت کے لحاظ سے مفید اور اہم ہیں۔ مگر اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامے بھی ادبی و تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے کہ یہ ہندوستان میں نو آبادیات کے ابتدائی دور میں تحریر کیے گئے تھے اور اس طرح انہیں تحریر کرنے والے وہ ابتدائی جنوب ایشیائی (ہندوستانی) باشندے کہلائے جنھوں نے نہ صرف سفرِ یورپ اختیار بلکہ آنکھوں دیکھی یورپی تہذیب و تمدن کے مشاہدات و تجربات کو سفر ناموں کی

صورت میں تحریر بھی کیا۔ نیز ان سفر ناموں میں ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور اور برطانوی نوآبادکاروں کے متعلق چند ایک ایسے حقائق اور واقعات بھی بیان کیے گئے تھے جو تاریخی اہمیت کے حامل ہیں جب کے انہیں بیان کرنے والے سفر نامہ نگار خود ان حقائق و واقعات کے عینی شاہدین تھے۔

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کی اہمیت اور اردو اور انگریزی میں کی جانے والی سابقہ تحقیقات کے جائزہ کے بعد یہ ضروری معلوم ہوا اور اہم بھی کہ اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگاروں کے بارے میں معلومات، ان کے سفر یورپ کے مقاصد، یورپی (برطانوی نوآبادکاروں کی) تہذیب و تمدن اور دیگر اہم پہلوؤں پر ان کے پیش کردہ مشاہدات و تصورات نیز اس حوالے سے سفر نامہ نگاروں کی پیش کردہ آراء میں اتفاق یا اختلافات کو زیادہ بہتر اور جامع انداز میں پیش کیا جائے اور ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور میں تحریر کیے گئے ادب کے حوالے سے ان سفر ناموں کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ علاوہ ازیں نوآبادیاتی تناظر میں ان سفر ناموں کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ کی مدد سے تحقیق کے میدان میں ان سفر ناموں کے مطالعہ کی ایک نئی جہت کو متعارف کرایا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان،تمــــــدن ہنـــــد،مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی(لاہور: مقبول اکیڈمی، سن ندارد)، ص۲۲۷۔

۲۔ انور سدید،اردو ادب میں سفرنامہ(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد)، ص۷۸۔

۳۔ قدسیہ قریشی،اردو سفرنامے انیسویں صدی میں(لکھنؤ: نصرت پبلشرز امین آباد، فروری ۱۹۸۷ء)، ص۳۱۔

۴۔ ایضاً، ص۳۳۔

۵۔ ایضاً، ص۸۳۔

۶۔ مرزا حامد بیگ،اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ(لاہور: کلاسیک، باراول دسمبر ۱۹۹۹ء)، ص۱۵۔

۷۔ مائیکل ایچ فشر، *Counterflows to Colonialism: Indian-Travellers and Settlers in Britain 1600-1857*(دہلی: پرمانٹ بلیک، ۲۰۰۴ء)، ص۲۰۔

۸۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی، مقدمہ مشاہدات فرنگ، مصنف میر محمد حسین، مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد)، ص۳۱۔۳۳۔

۹۔ سونتی سین، *Travels to Europe: Self and other in Bengali Travel Narratives, 1870-1910*(نئی دہلی: اورینٹ لانگ مین، ۲۰۰۵ء)، ص۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص۲۔۳۔

۱۱۔ بشیر الدین احمد،واقعات دار الحکومت دہلی(حصہ اول)(دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء)، ص۳۶۸۔۳۶۸۔

۱۲۔ مولانا محمد حسین آزاد،دربارِ اکبری(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ص۶۶۔۶۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص۶۸۔

۱۴۔ گلفشاں خان، *Indian Muslim Perception of the West during the Eighteenth Century*(پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مقالہ، یونیورسٹی آف آکسفورڈ، ۱۹۹۳ء)

۱۵۔ شکیل انور، *The Advent of Europeans in India the portiguese, the Dutch and the Danes*، http://www.jagranjosh.com/th..، اکتوبر ۲۰، ۲۰۱۷ء، تاریخ ملاحظہ جولائی ۱۵، ۲۰۱۸ء۔

۱۶۔ ایضاً۔

۱۷۔ مائیکل ایچ فشر، *Counterflows to Colonialism: Indian-Travellers and Settlers in Britain 1600-1857*، ص۲۰۔

۱۸۔ گلفشاں خان، *Indian Muslim Perception of the West during the Eighteenth Century*، ص ۴۴۔

۱۹۔ ڈاکٹر تاراچند، تاریخ تحریکِ آزادی ہند، جلد اوّل مترجم قاضی محمد عدیل عباسی (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۰ء)، ص ۷۵۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۷۶۔۷۷۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۲۲۔ عبدالغنی، "پس منظر" مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند: فارسی ادب سوم ۱۷۰۷ء۔۱۹۷۲ء، مرتبہ سید فیاض محمود اور سید وزیر الحسن عابدی (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)، جلد پانچویں: ۷۔

۲۳۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۳۶۔

۲۴۔ عبدالغنی، "پس منظر"، جلد پانچویں: ۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۲۶۔ مائیکل ایچ فشر، *Counterflows to Colonialism: Indian-Travellers and Settlers in Britain 1600-1857*، ص ۲۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۴۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۷۔

۲۹۔ نجیبہ عارف، "اٹھارہویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ روس و چین"، باز یافت، ش ۲۵ (۱۴۰۲ھ)، ص ۵۳۔

۳۰۔ جواد ہمدانی اور نجیبہ عارف، "جنوبی ایشیاء میں اوّلین سفر نامہ انگلستان: تاریخ جدید"، بنیاد، ش ۵ (۲۰۱۴ء): ۱۱۹۔

۳۱۔ منشی اعتصام الدین، شگرف نامہ ولایت ۱۷۶۶ء۔۱۷۶۹ء، مترجم امیر حسن نورانی (پٹنہ: خدا بخش اور ینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء)، ص ۱۔

۳۲۔ مائیکل ایچ فشر، *From Indian to England and Back: Early Indian Travel Narratives for Indian Readers*"، *Huntington Library Quarterly*، پنسلوینیا: یونیورسٹی آف پنسلوینیا پریس، جلد ۷، نمبر ۱ (۲۰۰۷)، ص

۳۳۔ میر محمد حسین لندنی، اٹھارہویں صدی مسیحی میں یورپ کا ایک علمی سفرنامہ مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی (لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، سن ندارد)، ص۔

۳۴۔ مرزا ابوطالب اصفہانی، سفر نامہ فرنگ، مترجم ڈاکٹر ثروت علی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۸۔

TH23914

۳۵۔ گلفشاں خان، Indian Muslim Perception of the West during the Eighteenth Century، ص ۴۴۔

۳۶۔ ایضاً۔

۳۷۔ ایضاً۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۷۷۔ ۱۳۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔۱۵۸۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۵۹۔۱۹۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔۲۷۱۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۷۲۔۲۹۵۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۹۶۔۳۶۶۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۶۷۔۴۰۲۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۴۷۔ سمونتی سین، Travels to Europe: Self and other in Bengali Travel Narratives, 1870-1910، ص vi۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۔۴۲۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۵۔۵۷۔

۵۰۔ مائیکل ایچ فشر، Counterflows to Colonialism: Indian-Travellers and Settlers in Britain 1600-1857، ص ۱۔۱۹۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۰۔۴۹۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۵۰۔۱۰۲۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔۱۱۲۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۴۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۸۷۔۹۰۔

۵۶۔ نجیبہ عارف، The west in South Asian-Muslim Discourse: A Study of Indian Muslims Travel to the West 1757-1857، جرنل آف انڈولوجی اینڈ ساؤتھ ایشین سٹڈیز، ش ۳۰ (۲۰۱۳ء):۲۱۔۴۰۰۔

۵۷۔ خالد محمود، اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۱ء)، ص ۵۔۶۔

۵۸۔ ایضاً، ص۸۹۔۹۱۔

۵۹۔ قدسیہ قریشی، اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، ص۲۰۔

۶۰۔ بیگ، ص۴۴۔

۶۱۔ انور سدید، اردو ادب میں سفرنامہ، ص۱۰۷۔۱۰۸۔

۶۲۔ نورانی، ص۱۔

۶۳۔ برکاتی، ص۶۹۔۱۶۸۔

بابِ اوّل

نوآبادیات: تعارف، اہم مباحث اور نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برِصغیر میں نوآبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ

باب اوّل:

نوآبادیات: تعارف، اہم مباحث اور نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برصغیر میں نوآبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ

ا۔ تعارف

دنیا کی تاریخ میں نوآبادیوں کا قیام، پھیلاؤ اور وسعت جدید یورپ کا طرّہ امتیاز رہا ہے۔ نوآبادیات کا قیام اور منتقلی کا سلسلہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ نوآبادیاں قائم کرنے کے اس تاریخی اقدام میں نہ صرف نوآبادیاتی طاقت کے حقیقی علمبردار اسپین اور انگلستان نے بلکہ بعد میں آنے والوں جیسے کہ جرمنی نے بھی حصّہ لیا۔ اس طرح یورپیوں نے دنیا کے مختلف حصّوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرکے بڑے فیصلہ کن انداز میں ایک نئی تاریخ تشکیل دی اور نہ صرف تشکیل دی بلکہ دنیا پر اپنی اصلیت بھی ظاہر کی۔

دنیا کی تاریخ میں کسی برّاعظم نے تہذیبی مشن (Civilizing Mission) کی آڑ میں اتنی زیادہ تعداد میں نوآبادیوں کو اپنے زیرِ تسلط نہ رکھا جتنا کہ جدید یورپ نے اس طرف توجہ دی۔ دنیا پر یورپی اجارہ داری کی ابتداء تو اس وقت سے ہی شروع ہو گئی تھی جب اسپین اور پرتگال کے درمیان ۷ جون ۱۴۹۴ء کو Treaty of Tordesillas [1] طے پایا اور انہوں نے اصل معنوں میں دنیا پر یورپی قیادت کا اعلان کیا۔ جدید دور میں امریکہ اور جاپان بھی نوآبادیات قائم کرنے کی دوڑ میں شامل ہوئے، مگر فونیشیائی اور رومن تہذیبوں کی مانند یورپی توسیع کے رجحان کا نتیجہ بھی نوآبادیات کا قیام ہی رہا اور نوآبادیاتی باشندوں کی ترقی کو پس پشت ڈالا گیا۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی استعماری تقسیم میں تمام یورپی ممالک بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک رہے۔ یورپیوں نے The Treaty of Tordesillas کے بعد استعماریت کے قیام اور احیاء کو نہ صرف اپنا سیاسی، معاشی اور ثقافتی حق جانا بلکہ اسے تہذیبی مشن کے فریضہ کے طور پر انجام دیا جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کی صورت میں اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ اس لیے یورپی تاریخ میں یہ دو تاریخیں (۱۴۹۴ء اور ۱۹۴۷ء) یعنی استعماریت کی ابتداء اور اختتام خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ یورپی استعماریت کے حوالے سے یہ بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ نوآبادیوں کے اندر یورپی استعماریت کے استحکام میں ان کی جابرانہ خود مختاری، خود سری اور لاقانونیت نے اہم کردار ادا کیا۔

عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یورپی اقوام نے بلا شرکتِ غیرے اپنی سلطنتیں خود فتح کیں۔ ان فتوحات

کے پیچھے دراصل کچھ ان جانے خطوں کو تلاش کرنے کی وہ یورپی جستجو تھی جس کی بدولت کرسٹوفر کولمبس (۱۴۵۱ء۔۱۵۰۶ء)امریکہ دریافت کرنے اور واسکوڈے گاما(۱۴۶۰ء۔۱۵۲۴ء)ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ ان کی کامیابی نے یورپی اقوام کو امریکہ اور برصغیر کی طرف نہ صرف پیش قدمی کی راہ دکھائی بلکہ وہ وہاں اپنی نوآبادیاتی کالونیاں بنانے میں بھی کامیاب ہوگئے۔[۱۲]

۲۔نوآبادیاتی صورتِ حال:اہم نظریات ومباحث:

اردو ادب میں جدید تنقیدی نظریات و اصطلاحات میں نوآبادیات اور نوآبادیاتی صورتِ حال جیسی اصطلاحات نسبتاً نئی ہیں اور ان اصطلاحات کا نام لیتے ہی ہمارے ذہنوں میں مختلف قسم کے سوالات گردش کرنے لگتے ہیں مثلاً:

۱۔ نوآبادیاتی صورتِ حال آخر ہے کیا؟

۲۔ کن مقاصد کے حصول کے لیے اس صورتِ حال کو برپا کیا جاتا ہے اور کس طرح کامیابی سے اسے برقرار رکھا جاتا ہے؟

۳۔ نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان کیسا تعلق اور رویے پائے جاتے ہیں؟

زیرِ نظر تحقیق کے باب اوّل میں نوآبادیاتی صورتِ حال:اہم نظریات ومباحث کی ذیل میں ان سوالات کے تسلی بخش جوابات تلاش کرتے ہوئے نوآبادیاتی فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ مگر ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے ہمیں بیسویں صدی کی چند ایسی شخصیات کے پیش کردہ نظریات سے استفادہ حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی جنھوں نے نہ صرف جنگِ عظیم دوم کے حالات وواقعات اور تباہ کاریوں کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا بلکہ انھیں بالواسطہ یا بلاواسطہ نوآبادیاتی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ان شخصیات میں فرانز فینن،البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تنقید کے حوالے سے ان تینوں مفکرین وناقدین کا کام اساسی نوعیت کا حامل ہے۔

نامور شمالی افریقی مصنف البرٹ میمی(Albert Memmi)۱۹۲۰ء میں تیونس میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں اسے اپنے دو سوانحی ناولوں *Pillar of Salt* اور *Stranger* لکھنے پر خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ ناول ایک غالب مسلم معاشرے میں ایک یہودی کو اور یورپ میں ایک شمالی افریقن کو پیش آنے والی صعوبتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک اعلیٰ پائے کا سوشیالوجسٹ ہونے کے ناطے میمی نے نسل پرستی اور افریقہ میں نوآبادیاتی ورثہ کے

موضوع پر کثیر تعداد میں کتب تصنیف کیں۔ میمی کی پہلی غیر افسانوی کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ آٹھ سال بعد اس کتاب کا انگریزی میں *The Colonizer and the colonized* کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا۔[۳] میمی کی یہ کتاب مابعد نوآبادیاتی تھیوری پر پیش کیے گئے بنیادی متون میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شمالی افریقہ سے ردِ نوآبادیات کے ردّ عمل میں لکھی گئی۔ اس وقت تک تیونس اور الجزائر بھی فرانس سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میمی نے اس کتاب میں شمالی افریقہ کے نوآبادیاتی نظام کو مد نظر رکھتے ہوئے بہت سے واقعات کو اپنی مثالوں کی بنیاد بنا کر نوآبادیاتی نظام کے متعلق بہت سے حقائق وضع کیے مگر وہ ان اخذ کردہ حقائق کو تمام نوآبادیاتی معاشروں پر یکساں طور پر لاگو کرتا ہے۔ اس کتاب میں میمی نے نوآبادیاتی ڈرامہ کے دو اہم کرداروں (نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندوں) کی نہ صرف تصویر کشی کی ہے بلکہ ان کے آپس کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں یہ کتاب نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں پر نوآبادیات کے نفسیاتی اثرات کا جائزہ بھی پیش کرتی ہے۔[۴]

نفسیات دان، ماہر لسانیات، فلسفی اور انقلابی فرانز فینن (Frantz Fanon) ۱۹۲۵ء میں ایک فرانسیسی نوآبادی Martinique میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤاجداد کا تعلق افریقی غلاموں کی نسل سے تھا۔ جنگِ عظیم دوم کے آخری سال فینن نے جنگ میں حصّہ لیا اور فرانس کے لیے لڑا۔ جنگ کے دوران فینن کو اپنے ہم رُتبہ سفید یورپیوں کی طرف سے شدید قسم کی نسل پرستی کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے بعد فینن انتہائی مختصر عرصہ کے لیے Martinique واپس لوٹا اور اس دوران اس نے نیگریٹیوڈ[۵] (Negritude) تحریک کے بانی Aime Cesaire کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس تحریک کے ذریعے ایسا ادب پیدا کیا گیا جس میں دنیا بھر میں پھیلے بے گھر سیاہ فام افریقیوں کی الگ شناخت کا نعرہ بلند کیا گیا۔ فینن نے اس تحریک کی تفصیلات اپنی کتاب *The Wretched of the Earth* میں بھی پیش کی ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں جب فینن فرانس میں تھا تو اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب لکھی جس کا ترجمہ ۱۹۶۷ء میں Black Skin White Masks کے عنوان سے کیا گیا۔ اس کتاب میں فینن نے نوآبادیاتی سیاق میں سیاہ فام افریقی باشندوں کی نفسیاتی کیفیات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح نسلیت پرستی کے بُرے اثرات نے سیاہ فام افریقی باشندوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے ان کی نفسیات کو متاثر کیا۔ فینن کی ایک اور مشہور کتاب *The Wretched of the earth* نوآبادیات کی فطرت اور افریقی نیگرو باشندوں پر فرانسیسی فوجیوں کے مظالم پر روشنی ڈالتی ہے۔[۶]

ایڈورڈ سعید (Edward Said) (۱۹۳۵۔۲۰۰۳ء) فلسطین کا پیدائشی تھا۔ امریکن پروفیسر، ادبی نظریہ ساز اور معلم کی حیثیت سے اُس نے ادبی تنقید، موسیقائی تنقید اور مابعد نوآبادیات کے موضوع پر بہت سی کتب

تصنیف کیں۔ ایڈورڈ سعید اُن با اثر امریکی آوازوں میں سے ایک تھا جنہوں نے فلسطین کے سیاسی حقوق اور آزادی کے حق میں آواز بلند کی اور اس طرح وہ فلسطین، امریکن لٹریری تھیوری کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والی اس کی کتاب *Orientalism* اس کی عالم گیر شہرت کا باعث بنی۔ مابعد نوآبادیاتی تھیوری کے حوالے سے اس کتاب کو اہم تصنیف جانا جاتا ہے اور بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں وہ مغربی دنیا کے قائم کردہ اُن مفروضوں پر روشنی ڈالتا ہے جنہوں نے مشرق اور خاص طور پر مشرقِ وسطیٰ کے بعض ثقافتی رموز کی غلط تعبیر پیش کی ہے۔[۷]

اردو ادب کو نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی تھیوری سے متعارف کروانے میں پاکستانی مضمون نگار اور مشہور نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ناصر عباس نیّر ۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ وہ اب تک شاعری، ادبی تھیوری اور اردو ادب کے مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کے حوالے سے قابل قدر کتب تصنیف کرنے کے ساتھ ساتھ ساختیات اور مابعد جدیدیت پر چند ایک اہم کتب بھی تصنیف کر چکے ہیں۔ مابعد نوآبادیاتی تھیوری کے حوالے سے ان کی کتب مابعدنوآبادیات (اردو کے تناظر میں) اور اردو ادب کی تشکیلِ جدید اردو تنقید کا گراں قدر سرمایہ تصور کی جاتی ہیں۔[۸]

آیئے اب متذکرہ بالا ناقدین و مفکرین کے پیش کردہ نظریات کی مدد سے نوآبادیاتی صورتِ حال کے متعلق حقائق جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم سب اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ دنیا میں طاقت ور قومیں ہمیشہ سے اپنے سے نسبتاً کمزور قوموں کو مغلوب و محکوم کرتی چلی آئیں ہیں۔ طاقتور قوموں کی اسی سائیکی نے دنیا کے مختلف خطوں میں نوآبادیاتی صورتِ حال کو جنم دیا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوآبادیاتی صورتِ حال فطری نہیں بلکہ طاقتور اقوام اسے خاص مقاصد کے حصول کے لیے خود پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح اس صورتِ حال کو پیدا کرنے والے افراد نوآبادکار کہلاتے ہیں۔ نوآبادکار جس آبادی کو مغلوب و محکوم کر کے وہاں اپنی نوآبادیات قائم کرتے ہیں انہیں نوآبادیاتی باشندے اور اس ساری صورتِ حال کو نوآبادیاتی صورتِ حال کہتے ہیں۔[۹]

فینن کہتا ہے کہ نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کی دنیا الگ الگ ہوتی ہے۔ نوآبادکار کی دنیا ظاہر ہے کہ اسی کی طرح اعلیٰ، بہترین اور حسین ہوتی ہے اور سہولیات زندگی سے معمور ہوتی ہے جب کہ نوآبادیاتی باشندوں کی دنیا انہی کی طرح ادنیٰ، بدترین اور بدشکل ہوتی ہے جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات بھی میسر نہیں ہوتیں۔

فینن کہتا ہے کہ نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کو اپنا تابع فرمان بنانے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ اپنے جدید ہتھیاروں اور نوآبادیوں میں پولیس چوکیاں اور فوجی چھاؤنیاں قائم کر کے کرتا ہے۔ نوآبادکار، نوآبادیاتی اقوام کی تہذیب و ثقافت، ادب اور علوم و فنون کو اپنے کلامیوں میں فرسودہ قرار دے کر انہیں نوآبادیاتی اقوام کے زوال کا باعث قرار دیتا ہے۔[۱۰] اس طرح نوآبادکار اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، سیاسی نظریات اور فنون کو نوآبادیاتی باشندوں کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے مگر نوآبادکار اپنی رہائش گاہوں اور دفاتر وغیرہ کو مقامی باشندوں کی پہنچ سے دور رکھتا ہے اور اس طرح نوآبادکار اپنے منفرد اور ممتاز ہونے کا تصور نوآبادیاتی باشندوں کے ذہن میں ابھارتا ہے نتیجتاً نوآبادیاتی باشندے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی محرومی کا احساس شدّت سے ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی اس محرومی کو دو طرح سے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ نوآبادکار کو اپنا 'آئیڈیل' تصور کر لیتے ہیں اور ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہوتی ہے کے نوآبادیاتی باشندے، نوآبادکار کو اپنی محرومیوں کا سبب اور ذمہ دار ٹھہرا کر اُن کے خلاف بغاوت کی کوشش کرتے ہیں مگر دونوں صورتوں میں ہی وہ نوآبادکار کی دنیا کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتے۔

نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادیاتی باشندوں کی ایسی بھیانک تصویر کشی کی جاتی ہے جو دراصل نوآبادیاتی نظام کی برقراری میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ البرٹ میمی کے مطابق نوآبادکار، مقامی باشندوں کا ایسا نقشہ کھینچتا ہے جس میں انہیں انتہائی سست اور ایسی ماورائی مخلوق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جنہیں علوم و فنون سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔[۱۱] جب کے فرانز فینن کا کہنا ہے کہ نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کو انسانیت کے درجے سے بھی گرا دیتا ہے اور ان کے لیے حیوانیات کے اصطلاحیں استعمال کرتا ہے، جنونی عوام، ناکارہ وجود نوآبادیاتی نظام میں نوآبادیاتی باشندوں کے لیے استعمال ہونے والی عام اصطلاحیں ہیں۔[۱۲] لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مقامی باشندے نہ صرف نوآبادکار کے دیئے گئے تصورِ ذات کو اپنے متعلق درست خیال کر لیتے ہیں بلکہ اس کے مطابق جینا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید تینوں کے مطابق نوآبادیاتی باشندے جب نوآبادکار کے دیئے گئے تصورِ ذات کو قبول کر لیتے ہیں تو دراصل وہ نوآبادیاتی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے خود ہی نوآبادکار کے معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔[۱۳]

نوآبادکار آئیڈیالوجی اور ڈسکورس کے ذریعے اپنی مقتدر حیثیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈسکورس دراصل ایسا کلامیہ ہوتا ہے جو سچائی کے مقابلے میں طاقت کو اہمیت دیتا ہے، یعنی کسی شے کا علم یا سچائی وہی ہے جسے ڈسکورس کے قوانین سچائی اور علم کا درجہ دیں۔ لوگ بھی صرف اس کو سچائی تسلیم کرتے ہیں جسے اس عہد کی

سیاسی یادانش ورانہ مقتدرہ نے سچائی قرار دیا ہو۔[۱۴]

البرٹ میمی کے مطابق نوآبادکار کی پیدا کردہ نوآبادیاتی دنیا میں نوآبادیاتی باشندے کے سامنے اختیار کرنے کے لیے دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت انجذاب ہے یعنی نوآبادیاتی باشندہ یا تو نوآبادکار کی تہذیب و ثقافت، زبان اور شخصیت کو اپنے اندر جذب کر کے اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے یا پھر ان سب چیزوں کو رد کر کے اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتا ہے مگر نوآبادیاتی نظام میں ان دونوں میں سے کسی صورت کو اختیار کرنے کا مجاز نوآبادیاتی باشندہ نہیں بلکہ خود نوآبادیاتی صورتِ حال ہوتی ہے۔ان دونوں صورتوں کو اگر ملا دیا جائے تو ایک تیسری صورت یعنی آفاقیت جنم لیتی ہے۔ آفاقیت کے تئیں نوآبادکار کی ثقافت کو بھی جذب کیا جاتا ہے اور اپنی ثقافتی پہچان کو بھی قائم رکھا جاتا ہے۔ ان تینوں صورتوں کو اختیار کرنے کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ انجذاب کی صورت میں مغربیت، بغاوت کی صورت میں علاقائیت جبکہ دونوں کے امتزاج کی صورت میں آفاقیت کو فروغ ملتا ہے۔

فرانز فینن اور البرٹ میمی کا موقف یہ ہے کہ نوآبادیاتی صورتِ حال میں ان تینوں صورتوں کو مکمل طور پر اختیار کرنا ناممکن ہوتا ہے۔[۱۵] نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادکار کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ نوآبادیاتی باشندہ چاہے انجذاب کا عمل اختیار کرتے ہوئے نوآبادکار کی زبان، لباس اور ثقافت کو مکمل طور پر اپنا بھی لے تب بھی آقا اور غلام کا فرق مٹ نہیں پاتا اور یہی فرق نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اپنی ثقافت سے دوری اگرچہ نوآبادیاتی باشندے کو جذباتی و نفسیاتی سطح پر متاثر کرتی ہے مگر وہ نوآبادکار جیسا بننے کی چاہ میں کسی چیز کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔[۱۶]

نوآبادیاتی صورتِ حال میں بغاوت کا عمل براہِ راست اور بالواسطہ ہوتا ہے۔ براہِ راست بغاوت نوآبادکار کے خلاف ہوتی ہے جب کہ بالواسطہ بغاوت اس طبقے کے خلاف ہوتی ہے جو نوآبادکار کا حامی ہوتا ہے۔ بغاوت کے ذریعے ماضی کی طرف لوٹنے کی کوشش کی جاتی ہے یعنی ماضی کے ایک خاص حصّے کو مثالی قرار دے دیا جاتا ہے اور اس کے احیا کی کوششیں یہ سوچے سمجھے بغیر کی جاتی ہیں کہ وہ مثالی دور جن تاریخی اور سیاسی حالات کی پیداوار تھا اب اس کا حصول ممکن نہیں۔ اس لیے کہ ثقافت کوئی منجمد شے نہیں بلکہ تحرک پذیر ہوتی ہے لیکن قومی ثقافت کے احیاء میں نوآبادیاتی باشندوں کی طرف سے زمانی و مکانی اور ثقافتی اختلافات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔[۱۷]

نوآبادیاتی باشندوں کی یہ تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔اس لیے کہ ایک تو ان کی یہ کوشش ڈسکورس کا درجہ اختیار نہیں کر پاتیں کیونکہ وہ نوآبادکار کی طرح مقتدر طبقہ سے نہیں بلکہ محکوم و مغلوب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرا اس لیے کہ جب نوآبادیاتی باشندے اپنے زمانے کی زندہ سچائیوں کو بالائے طاق رکھ کر عہدِ ماضی کے احیاء کی

کوشش کرتے ہیں تو نتیجتاً انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آفاقیت کے نقطۂ نظر کے تحت نوآبادکار اور نوآبادیاتی دنیاؤں کے فرق کو ختم کرنے کے لیے ان میں تہذیبی و ثقافتی مماثلتوں کو ڈھونڈا جاتا ہے اور ان کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن یہ کوششیں چونکہ نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادیاتی باشندوں کی طرف سے کی جارہی ہوتی ہیں۔ لہٰذا دونوں دنیاؤں کا فرق ختم نہیں ہو پاتا۔ دونوں کے امتزاج میں ایک کا اعلیٰ اور دوسرے کا ادنیٰ ہونا لازم ہے۔ ذولسانیات اس مظاہرہ کی بہترین مثال ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نوآبادکار کی زبان اسی کی طرح برتر اور شائستہ کہلائے گی جبکہ نوآبادیاتی باشندوں کی زبان انہی کی طرح کم تر اور غیر مہذب کہلائے گی۔[۸]

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر اپنی کتاب لسانیات اور تنقید میں نوآبادیاتی مباحث کے حوالے سے ایک اہم نکتہ کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں کہ آخر کیسے ایک تاریخی اور جبری صورتِ حال میں رہتے ہوئے کچھ لوگ آزادی کی نعمت یا نجات پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں؟۔[۹] اس سوال کا جواب ہمیں دراصل انسانی ذات یا نفسیات پر اثر انداز ہونے والے سماجی معروض کے اثرات کے مطالعہ سے کسی حد تک حاصل ہو سکتا ہے۔

انسانی ذات کی تشکیل دراصل سماج کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور سماجی معروض اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں اس طرح کوئی شخص مکمل آزاد نہیں ہوتا۔ ہر عہد کے اپنے سماجی معروض ہوتے ہیں اور ہم ان کے انتخاب میں بھی آزاد ہوتے ہیں تاہم ساخت کے اعتبار سے ان کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ یہ ساخت آئیڈیالوجی، ڈسکورس اور اے پس ٹیم پر مشتمل ہوتی ہے اور انہی کے ذریعے انسانی ذات کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔

آئیڈیالوجی اور ڈسکورس خود ساختہ ہوتے ہیں اور غیر فطری ہونے کے باوجود انہیں فطری صداقتوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے مقابلے میں اے پس ٹیم کو انسانی فکر کے ارتقاء اور اپنے عہد کی مجموعی علمی سرگرمیوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے افراد جن کی ذات کی تشکیل آئیڈیالوجی اور ڈسکورس کے ہاتھوں ہوتی ہے وہی دراصل غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہی حقیقتوں کا ادراک کرتے ہیں جو آئیڈیالوجی اور ڈسکورس کو مطلوب و مقصود ہوتی ہیں۔ دوسری طرف ایسے افراد جن کی ذات کی تشکیل اے پس ٹیم کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ وہی حقیقت میں فری سیلف ہوتے ہیں۔ وہ آئیڈیالوجی اور ڈسکورس کی پیش کردہ حقیقتوں کو خاطر میں لائے بغیر نوآبادکار کی ثقافت کا براہِ راست علم حاصل کرتے ہیں۔ دونوں ثقافتوں کی خوبیوں اور خامیوں پر گہری نظر رکھ کر اُن سے براہِ راست ربط وضبط قائم رکھنے کی وجہ سے وہ حقیقی آفاقی نقطۂ نظر اختیار کرنے کی اہلیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ نوآبادیاتی آئیڈیالوجی کا غلام بننے کی بجائے حقیقی انسانی علم کا ادراک حاصل کرکے آزادانہ ذہنی عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کامیابی

سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ [۲۷]

نوآبادیاتی صورتِ حال کے حوالے سے نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مفکرین کے پیش کردہ اہم نظریات و مباحث کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ اب ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ اپنے سوالات کے جوابات آسانی سے اخذ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک بات ہے میرے پہلے سوال کی کہ نوآبادیاتی صورتِ حال ہے کیا؟ تو نوآبادیاتی نظریات کے مطالعہ کے بعد ہم اس سوال کے جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ نوآبادیاتی صورتِ حال فطری نہیں بلکہ طاقتور انسانوں کا ایک مخصوص گروہ اپنے خاص مقاصد کے حصول یا تکمیل کے لیے اسے اپنے سے عسکری، سیاسی یا ثقافتی اعتبار سے نسبتاً کمزور انسانوں پر طاقت کے ذریعے مسلط کرتا ہے اور اس خطہ زمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے وہاں رہنے والے باشندوں کو مغلوب و محکوم بنالیتا ہے۔

جہاں تک بات ہے ہمارے دوسرے سوال کی کہ کن مقاصد کے حصول کے لیے اس صورت حال کو برپا کیا جاتا ہے اور کس طرح کامیابی سے برقرار رکھا جاتا ہے؟ نوآبادیاتی صورتِ حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس سوال کا یہ جواب دے سکتے ہیں کہ نوآبادیاتی صورتِ حال کو برپا ہی مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ مقاصد مختلف نوعیت کے ہو سکتے ہیں جیسے کہ سیاسی، معاشی، ثقافتی، تجارتی یا اقتصادی وغیرہ۔ اب اگر سوال کے دوسرے حصے کی جانب بڑھیں کہ نوآبادیاتی صورتِ حال کو کس طرح کامیابی سے برقرار رکھا جاتا ہے؟ تو اس حوالے سے ہمارے نظریہ سازوں (فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید) نے بڑے واشگاف الفاظ میں نوآبادکاروں کے بارے میں کچھ ایسے نظریات پیش کیے ہیں جنہیں دراصل کسی نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادکاروں کی اختیار کردہ حکمتِ عملیاں قرار دیا جاسکتا ہے جن پر عمل کر کے کسی نوآبادیاتی صورتِ حال کو کامیابی سے برقرار رکھا جاسکتا ہے مثلاً

نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کو ڈرانے، دھمکانے اور اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ پولیس چوکیاں، فوجی چھاؤنیاں بناتا ہے اور ہتھیاروں کا استعمال کرتا ہے۔ نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کے لیے حیوانیات کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں انہیں ایسے سست اور کاہل انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے جنہیں علم و ہنر سے کوئی لین دین نہیں ہوتا۔

اس طرح نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور ادب وغیرہ کو گھٹیا، دقیانوسی اور زوال پسند قرار دے کر ان چیزوں کو اُن کی ترقی کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ نوآبادکار ایسا اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ نوآبادیاتی باشندوں کی زندگی میں ایک ایسے خلا کا تعین کر سکے جسے نوآبادکار کی تہذیب و ثقافت،

زبان و ادب اور لباس وغیرہ کو اپنا کر پُر کیا جاسکتا ہے اور اس طرح نوآبادکار دراصل اپنے لیے نوآبادیاتی باشندوں کی ایک ایسی جماعت کو تیار کرنے کا جواز پیدا کرلیتا ہے جو فکری لحاظ سے نوآبادکار کی ہمنوا اور نوآبادیاتی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے اس کی معاون بن جاتی ہے۔

اب باری آتی ہے ہمارے تیسرے سوال کی کہ نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان کیسا تعلق اور رویے پائے جاتے ہیں؟ جہاں تک بات ہے نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان تعلق کی تو جیسا کہ ہم دوسرے سوال کے جواب میں پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کو علم و ہنر سے بے بہرہ قرار دے کر اُن کے لیے حیوانیات کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے اور اس طرح انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر کے اُن پر اپنی تہذیب و ثقافت اور سوچ کو مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یعنی کسی نوآبادیاتی نظام میں نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان آقا اور غلام جیسا تعلق پایا جاتا ہے اور اس طرح اِس تعلق کے نتیجے میں نوآبادیاتی باشندوں کی طرف سے تین طرح کے رویوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ رویے انجذابی، بغاوتی اور آفاقی کہلاتے ہیں۔

انجذابی رویے میں نوآبادیاتی باشندوں کے بعض گروہ نوآبادکار کی مقتدر حیثیت کو قبول کر لیتے ہیں اور نوآبادکار کی طرح بننے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لیے وہ اپنی تہذیب و تمدن کو ردّ کرتے ہوئے نوآبادکار کی تہذیب و تمدن کو اپناتے اور جذب کرتے ہیں۔

بغاوتی رویے میں نوآبادکار اور اس کی تہذیب و تمدن کے خلاف عَلم بغاوت بلند کیا جاتا ہے۔ بغاوت کا یہ عمل براہِ راست اور بالواسطہ ہوتا ہے۔ براہِ راست بغاوت نوآبادکار کے خلاف جبکہ بالواسطہ بغاوت اس طبقے کے خلاف ہوتی ہے جو نوآبادکار کی ثقافت کے انجذاب کا حامی ہوتا ہے۔ اس طرح بغاوت کے ذریعے اپنے زمانے کی زندہ سچائیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور ماضی کے خاص حصے کو مثالی قرار دے کر اس کے احیاء کی کوشش کی جاتی ہے مگر بغاوت کے اس عمل میں چونکہ نہ صرف علاقائی اور ثقافتی اختلافات کو نظرانداز کیا جاتا ہے بلکہ تاریخ کے تحرک کے اصول کو بھی پس پشت ڈالا جاتا ہے۔ نتیجتاً نوآبادیاتی باشندوں کو ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آفاقی رویے میں نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندے کی دنیا کے اقداری فرق کو ان میں تاریخی، مذہبی، اخلاقی اور ثقافتی اشراکات کو ڈھونڈ کر ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر یہ کوشش چونکہ نوآبادیاتی باشندوں کی جانب سے کی جا رہی ہوتی ہے لہٰذا اس امتزاج میں بھی ایک کا اعلیٰ اور دوسرے کا ادنیٰ ہونا لازم ہوتا ہے۔ ہاں البتہ نوآبادیاتی صورتِ حال میں کچھ ایسے آزاد ذہن ہوتے ہیں جو اپنی ثقافت سے بیگانہ ہوئے بغیر نوآبادکار کی ثقافت کا علم براہِ راست حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دونوں ثقافتوں کی خوبیوں اور خامیوں پر گہری نظر رکھتے ہوئے حقیقی آفاقی نقطۂ نظر

اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی لوگ دراصل فری سیلف ہوتے ہیں کیونکہ ان کی ذات کی تشکیل اے پس ٹیم کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہے۔ اے پس ٹیم اپنے عہد کی مجموعی علمی سرگرمیوں کے علاوہ انسانی فکر کے ارتقاء سے تعلق رکھتی ہے جبکہ دوسری طرف وہ لوگ جو غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اُن کی ذات کی تشکیل آئیڈیالوجی اور ڈسکورس کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہے۔ آئیڈیالوجی اور ڈسکورس میں چونکہ طاقت کے غلبے کی شدید خواہش پائی جاتی ہے لہٰذا ایسے افراد نوآبادیاتی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف انہی حقیقتوں کا ادراک حاصل کر پاتے ہیں جو آئیڈیالوجی اور ڈسکورس کو مطلوب و مقصود ہوتی ہیں۔ کسی نوآبادیاتی نظام میں تعداد میں کمی و بیشی کے ساتھ دونوں طرح کے افراد پائے جاتے ہیں۔

۳۔ نوآبادیاتی ادوار

نوآبادیاتی صورتِ حال کے چند بنیادی نظریات و مباحث سے واقفیت حاصل کر لینے کے بعد ہمارے لیے اس بات کا جاننا بھی اہم ہے کہ کن یورپی طاقتوں نے کب کب دنیا کے کن ممالک کو اپنی سامراجیت کا شکار بنایا؟ دنیا میں جدید دور میں سامراجی تسلط کے تین ادوار مشہور ہوئے۔ ان ادوار میں یورپی نوآبادکاروں نے دنیا کے بہت سے ممالک پر قبضہ کیا اور نوآبادیاتی صورتِ حال کو اُن پر مسلط کیا۔

۱۴۹۲ء سے وسط اٹھارہویں صدی تک مختلف یورپی نوآبادیاتی طاقتوں جیسے کے اسپین، پرتگال، انگلینڈ، فرانس اور نیدرلینڈز نے امریکہ، ایسٹ انڈیز اور ہندوستان پر اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ انیسویں صدی سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور دوسری قوموں کے درمیان دنیا پر اپنی نوآبادیات قائم کرنے کی دوڑ شروع ہوئی۔ انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، سوڈان، ساؤتھ افریقہ، برما اور سوڈان جیسے علاقے برطانیہ کے مقبوضات میں شامل ہو چکے تھے۔ اس طرح دنیا کی کل زمین کے پانچویں اور دنیا کی آبادی کے ایک چوتھائی حصے پر انگلستان کی نوآبادیات قائم ہو چکی تھی۔

انگلستان کے بعد فرانس دوسری بڑی سامراجی طاقت تھی۔ فرانس نے الجیریا، فرنچ ویسٹ افریقہ، استوائی افریقہ، انڈوچائنا (۱۸۸۷ء۔ ۱۹۴۷ء) کو اپنے زیرِ تسلط رکھا۔ انگلستان اور فرانس کی کامیابی کے بعد جرمنی، اٹلی اور جاپان بھی نوآبادیات قائم کرنے کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں بیلجیم نے وسطی افریقہ میں بلگین اور کونگور (۱۹۰۸ء) کو نوآبادیات میں شامل کیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس اور امریکہ کے درمیان سامراجی طاقت کے حصول کے لیے رسہ کشی ہوئی۔ خطۂ یورپ میں اٹھارہویں صدی کے بعد کا زمانہ زرعی اور صنعتی و سائنسی انقلاب کا زمانہ ہے۔ اس دور میں یورپی

طاقتوں کو اپنی صنعتوں کے لیے تجارتی منڈیوں کی ضرورت پڑی تو فرانس نے الجیریا، تیونس اور مراکش جب کے برطانیہ نے مصر اور سوڈان اور ولندیزوں نے انڈونیشیا اسی طرح اٹلی نے لیبیا اور روس نے وسطی ایشیا کی ریاستوں کو اپنی مقبوضات کا حصّہ بنایا۔ ایسٹ انڈیا کے توسط سے برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی نو آبادیات قائم کی۔ ۱۹۴۵ء میں نو آبادیاتی نظام اپنے اختتام کی جانب بڑھنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو آزادی ملی پھر چین آزاد ہو گیا۔ ۱۹۹۱ء میں سویت یونین کی طاقت منتشر ہو گئی اور امریکہ طاقت کا سرچشمہ بن گیا۔ [۲۱]

ان نو آبادیاتی ادوار پر نظر دوڑانے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تقریباً تمام بڑی یورپی طاقتیں دنیا پر اپنی نو آبادیات قائم کرنے کی دوڑ میں شامل تھیں اور ایک طویل عرصہ تک یورپی طاقتوں نے دنیا کے مختلف ممالک پر غاصبانہ قبضہ کر کے اُن پر نو آبادیاتی صورتِ حال کو مسلط کیے رکھا۔ یورپی نو آبادیاتی مطالعات کے حوالے سے ایک دلچسپ بات ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ یورپی نو آبادکاروں نے ہر ملک اور خطے کے زمینی حقائق اور مقامی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے الگ الگ مقاصد اور اہداف مقرر کیے۔ ان مقاصد اور اہداف کو حاصل کرنے کے لیے یورپی نو آبادکاروں نے مختلف طرح کی حکمت عملیاں اور تدابیر اختیار کیں۔ مثال کے طور پر کریبین پر نو آبادیاتی صورتِ حال اس لیے مسلط کی گئی کیونکہ ہسپانوی اور پرتگیزی وہاں سونا تلاش کرنا چاہتے تھے جبکہ ہندوستان میں مغربی اقوام تجارت کی غرض سے آئیں تھیں۔ کریبین میں طاقت کے بدترین استعمال کے ذریعے یورپی زبان، کلچر اور طرزِ عمل کو براہِ راست مسلط کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں ہندوستان میں نو آبادیاتی طاقت کا استعمال اور مظاہرہ ایک دوسری صورت میں ہوا۔ یہاں بھی اگرچہ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک مقامی آبادی کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا مگر صرف اس پر اکتفانہ کیا گیا اور نو آبادیاتی طاقت کو ہندوستان کے سماجی شعبوں (ثقافت، زبان، لباس وغیرہ) میں منتقل کر کے اپنے نو آبادیاتی تسلط کو استحکام بخشا گیا۔ [۲۲]

آیئے اب ہم بیان کردہ نو آبادیاتی نظریات و مباحث کی روشنی میں برصغیر میں نو آبادیاتی صورتِ حال کا مختصراً جائزہ لیتے ہیں اور اس طرح نو آبادیاتی صورتِ حال کو عملی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں برصغیر میں یورپی نوآبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ

نوآبادیاتی صورتِ حال کے حوالے سے پیش کردہ نوآبادیاتی نظریات کے مطابق جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ نوآبادکار کسی ملک یا خطے میں مخصوص مقاصد (سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور اقتصادی وغیرہ) کے حصول کے لیے نوآبادیاتی صورتِ حال کو مسلط کرتے ہیں۔[۳۳] تو آیئے اس نظریہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یورپی اقوام نے کب اور کن مقاصد کے حصول کے لیے برصغیر کی طرف رُخ کیا؟

ہندوستان قدیم زمانہ سے ہی اپنی زرخیزی اور قدرتی وسائل کی فراوانی کے باعث غیر ملکی اقوام کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یورپ نے بھی اس ملک کے افسانے سکندر کے زمانے سے سُن رکھتے تھے۔ یورپیوں کے لیے یہ ملک کسی جنت سے کم نہ تھا کیوں کہ یہاں انہیں وہ تمام چیزیں میسر آسکتی تھیں جو انہیں مطلوب و مرغوب تھیں جیسے کہ ریشم، مصالحہ جات، افیون، ہر نسل کے جانور اور ایسی بہت سی اشیاء جن کی تجارت سے وہ راتوں رات مالا مال ہو سکتے تھے۔ اسی لیے یورپی اس ملک کے ساحلوں تک پہنچنے کے لیے مدتوں بے چین اور بے تاب رہے اور اس کی سرحدوں کے تعین میں کوشاں رہے۔[۳۴] آخر یورپیوں کی برصغیر تک رسائی کیونکر ممکن ہوئی؟ یہ سوال ہمیں یورپی عہدِ دریافت میں لے جاتا ہے۔

ہند اور یورپ کے درمیان ایک عرصہ دراز تک تجارت تیسری قوم یعنی عربوں کے ذریعے ہوتی رہی۔ آٹھویں صدی تک مالا بار کی تجارت پر عربوں کی اجارہ داری قائم ہو چکی تھی۔ قاہرہ، تونس، بصرہ اور دوسرے عرب شہروں میں مالا بار کی پیداوار کی تجارت ہو رہی تھی۔ پہلے پہل یہ سامان تجارت خشکی کے راستے ایران سے حلب اور حلب سے اٹلی کی بندرگاہوں تک پہنچایا جاتا رہا۔ بعد ازاں ہندوستانی تجارتی مال خلیج فارس کی راہ سے حلب تک اور بحر احمر کی راہ سے یورپ تک پہنچایا جانے لگا۔ اس تجارتی لین دین نے اٹلی کی بندرگاہ وینس کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا اور اٹلی کے تاجر ایشیائی مصنوعات کو یورپ کے ہاتھوں مہنگے داموں فروخت کرنے لگے۔

یورپ میں نشاطِ ثانیہ کی بدولت یورپی اقوام نے خود کو جہالت کے اندھیروں سے نکالا اور یورپ میں علمی و ادبی اور سائنسی ترقی کا سورج طلوع ہوا۔ اس طرح یورپیوں میں دنیا کے اَن جانے خطوں کو دریافت کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ بادشاہوں کی سرپرستی میں دنیا کے مختلف خطوں کی طرف بحری مہموں کا آغاز کیا گیا ان میں سے کچھ مہمیں مشرق خاص کر ہند کو تلاش کرنے کی غرض سے جاری کی گئیں کیونکہ یورپ کے تمام دانش ور بادشاہ اہل ہند کے ساتھ براہِ راست تجارتی روابط قائم کرنا چاہتے تھے مگر وہ ابھی اس خطے تک پہنچ نہ پائے تھے۔

ا۔ پرتگالیوں کی دریافت اور ہندوستان آمد

ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے کے حوالے سے پرتگالی شہزادے ہنری کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ اس نے پرتگال سے براہِ راست ہندوستان تک سمندری راستہ تلاش کرنے کے لیے اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال صرف کیے۔[۲۵] اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے پرتگال میں ایک بحری سکول بھی جاری کیا۔ اس سکول میں تکنیکی مہارت اور سائنسی ایجادات کے ذریعے پرتگال اعلیٰ قسم کے بحری جہاز مثلاً The Carrak, Caravel اور Galleon وغیرہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔[۲۶] اگرچہ زندگی نے بادشاہ ہنری کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے خواب کو آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھ پاتا لیکن اس کی کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی وفات (۱۴۶۰ء) کے تقریباً ۳۸ سال بعد پرتگالی ہندوستان کا بحری راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جون ۱۴۹۸ء میں ایک پرتگیزی جہازی واسکوڈے گاما عرب جہازران احمد بن ماجد کی رہنمائی میں راس امید سے مالا بار کے ساحل پر کالی کٹ پہنچ گیا۔[۲۷]

ہندوستان میں تین ماہ قیام کرنے کے بعد واسکوڈے گاما جب وطن واپس جانے لگا تو اپنے ساتھ ہندوستان کی بہت سی مصنوعات کو بطور نمونہ لے گیا۔ ان مصنوعات کو یورپ کی منڈیوں میں کثیر منافع کے عوض فروخت کیا گیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۵۰۰ء میں پرتگالیوں نے الوریز کبرال کی کمان میں کوچین کی بندرگاہ کو دریافت کر لیا۔ پرتگالیوں کے لیے یہ بندرگاہ کالی کٹ سے زیادہ مفید تھی۔[۲۸] ۱۵۰۱ء میں واسکوڈے گاما دوبارہ ہندوستان پہنچا۔ اس بار کالی کٹ، کنانور اور کوچین میں پرتگالی فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ ان فیکٹریوں کے قیام نے ہندوستان میں پرتگالی تجارتی سرگرمیوں کو بڑھا دیا عرب جو اب تک ہندوستان کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ اب پرتگیزوں کو ان کی یہاں موجودگی ناگوار گزرنے لگی، وہ انہیں اپنا حریف سمجھنے لگے اور ہندوستان کی سرزمین اور تجارت سے بے دخل کرنے کے لیے ساز باز کرنے لگے۔ واسکوڈے گامانے کالی کٹ کے راجا زیمورن سے مطالبہ کیا کہ وہ عربوں کو اپنی ریاست سے بے دخل کر دے مگر زیمورن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح زیمورن اور واسکوڈے گاما کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے جس نے جنگ و جدل کی صورت اختیار کر لی۔ زیمورن نے عربوں کی مدد سے پرتگیزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ ادھر پرتگیزوں نے زیمورن کے دشمنوں کے ساتھ سیاسی گٹھ جوڑ کیے۔ انہوں نے کوہ چین اور کنانور کے حکمرانوں کی حمایت حاصل کی اور اس طرح زیمورن کو پرتگالیوں کے مقابلے میں شکست ہوئی۔[۲۹]

ہندوستان میں عربوں کا تجارتی مستقبل ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف فوجی کارروائیاں کی گئیں اور ان کے بحری بیڑے تباہ کیے گئے جس سے عربوں کو خاصا مالی اور تجارتی نقصان اٹھانا پڑا۔ پرتگالی رفتہ رفتہ ہندوستان کی تجارت پر چھا گئے۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کا تجارتی مفاد اس قدر بڑھ چکا تھا کہ انہوں نے باقاعدہ طور پر ہندوستان کے لیے اپنا

وائسرائے [۳۰] مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ہندوستان میں اپنے مقبوضات کو بڑھا کر یہاں کی تجارت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ [۳۱]

پرتگالی مشرق میں اپنی آمد کے بعد تقریباً ایک صدی تک مشرقی تجارت پر چھائے رہے۔ ۱۵۹۵ء تک یورپ کی مختلف قومیں سامان تجارت اور اجناس کو اپنی ضرورت کے مطابق لزبن سے ہی خریدتی رہیں۔ [۳۲] پرتگالیوں نے ہندوستان کے ایک اہم علاقے گوا کے ساتھ ساتھ منگورہ، کوچین، کنانور، نیگاپٹم اور لنکا پر قبضہ کر لیا مگر وہ یہاں مستقل طور پر اپنا کوئی اقتدار قائم نہ کر سکے اس لیے کہ بہت جلد ہی انگریز اور ولندیزی مشرق کی تجارت سے مالا مال ہونے کے لیے میدان میں نکل آئے۔ سترھویں صدی کے شروع میں ہی انگریزوں اور ولندیزوں نے پرتگالیوں کے تجارتی طلسم کو توڑ دیا اور انہیں بحرِ ہند سے نکال باہر کیا۔ ۱۵۸۰ء میں سپین کے بادشاہ فلپ دوم نے پرتگال پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح پرتگال کو تجارتی اور سیاسی زوال کا سامنا کرنا پڑا۔

ب۔ ولندیزوں کی ہندوستان آمد اور عروج و زوال

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو ولندیزی سمندری تجارت کے ماہر رہے ہیں۔ مشرق میں ان کے سب سے بڑے حریف پرتگالی تھے جنہیں ولندیزوں نے سترھویں صدی کے ابتدائی حصّہ میں ہی بحرِ ہند کے پانیوں سے نکال باہر کیا۔ اس طرح پرتگالیوں کے بعد ولندیزوں نے برصغیر میں اپنے قدم جمائے۔ ولندیزوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں جیسے کہ سورت، سیلون، نیگاپٹم، کوچین، قاسم بازار اور پٹنہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں اور ۱۶۰۲ء میں تمام نجی کمپنیوں کو ضم کر کرے یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی آف نیدرلینڈ کی بنیاد رکھی۔ ولندیزی حکومت نے اس کمپنی کو ہندوستان اور ایسٹ انڈیز سے تجارت کی اجازت دے دی۔ [۳۳]

۱۶۰۵ء میں ولندیزوں نے مسولی پٹم میں ایک فیکٹری قائم کی۔ بعد ازاں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے تجارتی مراکز بھی قائم کرنے لگے۔ ڈچ سورت اور ڈچ بنگال کمپنیاں بالترتیب ۱۶۱۶ء اور ۱۶۲۷ء میں قائم کی گئیں۔ ۱۶۵۶ء میں سیلون کو جو پرتگالیوں کے قبضہ میں تھا ولندیزوں نے فتح کر لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مالا بار کے ساحل پر واقع پرتگالی قلعوں کو بھی ۱۶۷۱ء میں اپنی تحویل میں لے لیا۔

ولندیزی آہستہ آہستہ ایک طاقتور قوت بن گئے اور مدراس کے قریب نیگاپٹم کا علاقہ جو پرتگیزوں کے پاس تھا، پر قابض ہو گئے اور اس طرح انہوں نے جنوبی ہند میں اپنے قدم جما لیے۔ ولندیزوں نے برصغیر میں کالی مرچ اور مصالحہ جات کی تجارت سے کثیر منافع کمایا۔ اس کے علاوہ برصغیر میں انہوں نے بڑے پیمانے پر جن مصنوعات کی تجارت کی اُن میں کپاس، نیل، ریشم، چاول اور افیون کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

برصغیر میں ولندیزوں کا قیام ۱۶۰۵ء سے ۱۸۲۵ء تک رہا۔ اپنے قیام کے دوران انھوں نے سکہ ڈھلائی کا کام بھی جاری کیا۔ برصغیر میں جب اُن کی تجارت اپنے عروج پر پہنچی تو انہوں نے کوچین، نیگا پٹم، پانڈی چری اور پالیکیٹ میں اپنی ٹکسال قائم کیں۔ پرتگالیوں کی مشرق میں تجارتی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے اگرچہ ابتداء میں انگریز اور ولندیزی ایک دوسرے کے حلیف تھے لیکن مشرقی تجارت میں برطانیہ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی نے انگریزوں اور ولندیزوں کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا اور دونوں قوموں کے درمیان خونی جنگ وجدل کا آغاز ہوا جس میں انگریزوں کو اپنے نظم وضبط اور کثیر وسائل رکھنے کی بناپر واضح برتری حاصل ہوئی۔ ولندیزوں کی جانب سے ۱۶۲۳ء میں امبوئے نا میں کچھ برطانوی تاجروں کے وحشیانہ قتل نے صورتِ حال کو مزید بگاڑ دیا۔ برطانویوں نے ایک ایک کر کے ولندیزی مقبوضات کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

ج۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام اور برطانویوں کی ہندوستان آمد

پرتگالی تاجروں کو برصغیر میں تجارت اور خرید و فروخت سے حاصل ہونے والا کثیر منافع برطانویوں کی ہندوستان آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کا سبب بنا۔ پرتگالیوں کی دلچسپ اور منافع بخش تجارتی کہانیاں سننے کے بعد انگریز تاجروں کے ایک گروپ Merchant Adventurers نے ایک کمپنی 'دی ایسٹ انڈیا کمپنی' کے نام سے ۱۵۹۹ء میں قائم کی۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو کمپنی کو ملکہ الزبتھ کی سرپرستی میں شاہی فرمان کے ذریعے مشرق کے ساتھ تجارت کا عندیہ دے دیا گیا۔[۳۴]

۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیپٹن ولیم ہاکنز (Captain William Hawkins) کو مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں کمپنی کے لیے شاہی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ اُسے مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کمپنی کے لیے فیکٹریاں کھولنے کے لیے شاہی اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔[۳۵] ۱۶۱۵ء میں انگلستان کے بادشاہ جیمز اوّل (James I) کی جانب سے سر طامس رائے (Sir Thomas Roe) کو سفیر بنا کر جہانگیر کے دربار میں بھیجا گیا تاکہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے مزید مراعات حاصل کر سکے۔ طامس کے تین سالہ قیام کے دوران شاہی فرامین کے مطابق کمپنی کو نہ صرف سورت میں فیکٹری اور اس کے ارد گرد فصیل بنانے کی اجازت دی گئی بلکہ کمپنی کو مغلیہ سلطنت میں آزادانہ تجارت کرنے کا پروانہ بھی جاری کر دیا گیا۔ اس طرح بہت جلد آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بڑودچ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہو گئیں۔[۳۶] ان علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے بعد انگریز مشرقی ہندوستان خاص طور پر بنگال کی جانب متوجہ ہوئے۔ بنگال مغلیہ سلطنت کا ایک اہم صوبہ تھا۔ بنگال کے گورنر شجاع الدولہ نے ۱۶۵۱ء میں کمپنی کو بنگال میں تجارتی سرگرمیاں جاری کرنے کی اجازت

دے دی۔ ہگلی میں ایک فیکٹری کا قیام عمل میں لایا گیا۔۱۶۹۸ء میں ایک اور کمپنی قائم کرنے کی غرض سے گووند پور، سورت اور کلکتہ کو خرید لیا گیا۔ بعد ازاں فیکٹری کے گرد فورٹ ولیم قائم کیا گیا۔[۳۷]

کمپنی کی تجارت جلد ہی خوش حالی کے دور میں داخل ہو گئی۔ اس نے قلیل عرصہ میں ہی پرتگالیوں اور پرتگیزوں پر غلبہ پالیا۔ البتہ فرانسیسیوں کی ہندوستان آمد اور تجارتی سرگرمیاں انگریزوں کو ناگوار گزریں اور دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔

د۔ فرانسیسیوں کی ہندوستان آمد اور قیام

برصغیر میں ولندیزوں اور انگریزوں کے بعد تجارت کے میدان میں قسمت آزمائی کرنے والی آخری یورپی قوم فرانسیسی تھی۔ لوئی چہاردھم کے وزیر کالبر کی کوششوں سے ۱۶۶۴ء میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۶۶۸ء میں فرانسیسیوں نے اپنی ایک فیکٹری سورت میں اور ۱۶۶۹ء میں مسولی پٹم میں قائم کی۔ ۱۶۷۳ء میں بنگال کے مغل صوبیدار نے فرانسیسیوں کو چندر نگر میں ایک چھوٹا سا قصبہ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۶۷۴ء میں فرانسیسیوں نے بیجاپور کے سلطان سے ایک گاؤں پانڈی چری حاصل کر لیا جس نے بعد میں نہ صرف ایک شہر کی شکل اختیار کر لی بلکہ یہ ہندوستان میں فرانسیسیوں کا ایک اہم گڑھ بن گیا۔[۳۸] اس طرح فرانسیسیوں نے دس سال تجارت کر کے پانڈی چری، چندر نگر، ماھی، کاریکل کے علاوہ ہندوستان کی دوسری بندرگاہوں میں بھی اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر کے انگریزوں کی طرح خوب دولت سمیٹی۔[۳۹]

ہ۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی رقابت۔۔۔ انگریزوں کی فتح

ہندوستان میں فرانسیسی تجارت کو عروج و استحکام عطا کرنے میں فرانسس مارٹن (Frances Martin) کا کردار اہم رہا۔ اس کی وفات (۱۷۰۶ء) کے بعد ڈوپلے (Dupleix) (۱۶۹۷ء۔۱۷۶۳ء) نے ہندوستان میں فرانسیسی تجارت اور اقتدار کی ساکھ بحال رکھنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور اٹھارہویں صدی کے ابتدائی حصہ میں ہی فرانسیسی ماہی، کریکل اور بعض دوسرے اہم مقامات پر قابض ہو گئے۔ ہندوستان میں فرانسیسیوں کا بڑھتا ہوا تجارتی اثر ورسوخ اور مقبوضات، انگریزوں پر گراں گزرے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی چونکہ تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی غلبہ پانے کے عزائم بھی رکھتی تھی۔ اس لیے دونوں یورپی قوموں کے درمیان رقابت دن بدن بڑھنے لگی اور دونوں قومیں ہی اپنے اپنے سیاسی اور معاشی مفاد کے حصول کی خاطر ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ دونوں قوموں کے درمیان کرناٹک کی تین لڑائیاں ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہیں اس لیے کہ ان

لڑائیوں کے نتیجے میں ہندوستان میں نہ صرف فرانسیسیوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا بلکہ اُن کا تجارتی مستقبل بھی تاریک ہو گیا۔[۲۰]

ہندوستان میں نوآبادیات کے قیام اور اقتدار کے حصول کے لیے جنوبی ہند میں ۱۷۴۰ء سے لے کر ۱۷۶۳ء تک انگریز اور فرانسیسی باہم دست و گریباں رہے۔ بالآخر جیت انگریزوں کا مقدر ٹھہری۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد تخت کے حصول کے لیے جانشینوں کی باہمی رقابت اور لڑائیاں، بادشاہوں کے کردار کی کمزوری اور تعیش پرستی، امراء کی سازشیں پھر شمالی اور مشرقی ہند میں پلاسی اور بکسر کی جنگوں میں انگریزوں کی فیصلہ کن فتوحات اور ۱۷۶۵ء میں مغل شہنشاہ شاہ عالم کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کے دیوانی حقوق عطا کرنے کے اقدام نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے قیام کے خواب کو تعبیر عطا کر دی۔[۲۱] ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی قیادت میں انگریزوں نے دہلی فتح کر لی اور شاہ عالم کی حیثیت ایک کٹھ پتلی بادشاہ کی سی رہ گئی۔[۲۲]

۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کی طرف سے غیر ملکی آقاؤں کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے کی جانے والی آخری کوشش بھی ناکام ثابت ہوئی اور اس طرح ۱۸۵۸ء میں ایک خاص قانون کے تحت ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار سے نکل کر براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِ نگیں آ گیا۔[۲۳]

یوں بظاہر دیکھا جائے تو یورپی اقوام نے برصغیر میں پندرھویں صدی کے آخر میں قدم تجارتی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ہی رکھے تھے مگر جب انہیں یہاں سازگار ماحول اور اپنی من پسند اشیاء کی خرید و فروخت کا موقع بے پناہ منافع کے ساتھ میسر آیا تو تجارت کے ساتھ ساتھ وہ تختِ ہندوستان کو حاصل کرنے کا خواب بھی دیکھنے لگے۔ اس خواب کو تقویت مغلیہ سلطنت میں اقتدار کے حصول کی خاطر فرمانرواؤں، شہزادوں اور مقامی حکمرانوں کے مابین ہونے والی خانہ جنگی، مغلوں کی طرف سے یورپیوں کے لیے اختیار کردہ نرم تجارتی پالیسیوں اور عنایات و نوازشوں نے پہنچائی۔

یورپیوں نے پہلے پہل برصغیر میں تجارتی اجازت نامے حاصل کیے پھر مقامی جاگیرداروں سے زمینیں خریدیں اور اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے بعد وہاں اپنی کالونیاں بھی بنائیں جیسے کہ انگریزوں نے مدراس شہر کو اپنی نوآبادی بنایا اور وہاں ایک قلعہ فورٹ سینٹ جارج بھی کھڑا کر لیا۔ اسی طرح فرانسیسیوں نے پانڈی چری میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ایک باقاعدہ شہر بنا دیا۔ بعد ازاں جب یورپی برصغیر کی تجارت سے مالا مال ہونے لگے اور اُن کی حیثیت مستحکم ہونے لگی تو وہ مقامی حکمرانوں کی اقتدار کے حصول کے لیے اُن کی آپس کی خانہ جنگی میں اپنی فوج اور فوجی ساز و سامان سے مدد کرنے لگے اور اس کے بدلے مقامی حکمرانوں سے رقم اور اپنے من پسند

علاقے بٹورنے لگے۔[۴۴]

برصغیر میں یورپیوں کے بڑھتے ہوئے تجارتی اور سیاسی مفاد نے یورپی اقوام کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا اور برصغیر کی تجارت اور تخت پر قابض ہونے کے لیے وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ سترھویں صدی کے شروع میں ہی انگریزوں اور پرتگیزوں نے پرتگالیوں کی طرح برصغیر کی تجارت سے مالا مال ہونے کے لیے ادھر کا رخ کیا تو پرتگالیوں نے ان کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر سترھویں صدی کے شروع میں ہی انگریزوں اور پرتگیزوں نے اپنے تجارتی مفاد کی خاطر پرتگالیوں کو ہندوستان کی کئی بندرگاہوں سے باہر نکال دیا۔[۴۵] بعد ازاں تجارتی منافع کی دوڑ نے پرتگیزوں اور انگریزوں کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا اور ان کے درمیان خونی جنگ وجدل کا آغاز ہوا۔ آخر برطانویوں نے ایک ایک کر کے پرتگیزی مقبوضات کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ پھر اسی اقتدار اور دولت کی ہوس نے فرانس اور انگلستان کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ فرانس نے تجارت سے زیادہ ہندوستان میں اپنے مقبوضات بڑھانے کی طرف توجہ دی مگر انگریزوں نے کسی قیمت پر بھی اپنی تجارتی سرگرمیوں کو نظر انداز نہ کیا۔ نتیجتاً تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں کے پیشِ نظر بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہونے والی دولت نہ صرف انگلستان کے صنعتی انقلاب کا مؤثر ذریعہ بنی بلکہ اس دولت کے کے ذریعے انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسیوں جیسے مضبوط حریف کو شکست دی اور خود ہندوستان کے اقتدار پر قابض ہو گئے۔[۴۶] یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنی بہترین تجارتی پالیسیوں، نظم وضبط، فوجی اور جنگی حکمت عملیوں کی بدولت ہندوستان میں اپنے تمام یورپی حریفوں کو شکست دی۔

ہندوستان کی نو آبادیاتی صورت حال کے حوالے سے یہاں یہ سوال بھی توجہ طلب ہے کہ آخر کیسے ایک کثیر آبادی پر مشتمل عظیم الشان مغلیہ سلطنت پر صرف چند ہزار انگریز افسروں اور سپاہیوں نے قبضہ کیسے رکھا؟ جبکہ وہ یکسر مختلف تہذیب و تمدن، زبان اور خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہندوستان پر اُس وقت تک قابض نہ ہو سکتے تھے جب تک انہیں یہاں کے مقامی افراد کی حمایت اور تعاون حاصل نہ ہوتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ابتداء سے ہی ہندوستان میں چند ایک ایسے تاجروں اور دستکاروں وغیرہ کا تعاون حاصل رہا تھا جنہیں کمپنی کی تجارت سے فائدہ ہوتا تھا اور وہ کمپنی کے ایجنٹ کے طور پر کام کیا کرتے تھے مثلاً بنگال کی دیوانی کے بعد ہزاری مل، مہاراجہ نابھ کرشن اور کرشن کانت کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور ان لوگوں نے بہت دولت اکٹھی کی۔ پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے والے وہ ہندو سیٹھ اور بنیئے تھے جن کے تجارتی مفاد کمپنی کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ اس حوالے سے جگت سیٹھ اور اُمی چی کے نام قابل ذکر ہیں۔[۴۷]

مقامی افراد کی مدد اور تعاون سے حاصل ہونے والی ہندوستان جیسی وسیع و عریض نو آبادی کو اپنے کنٹرول میں رکھنے اور احسن طریقے سے چلانے کے لیے انگریزوں نے مختلف تدابیر اور حکمت عملیاں اپنائیں۔ نو آبادی کو کنٹرول کرنے کا تجربہ تو دراصل انگریز آئر لینڈ پر قبضہ کر کے پہلے ہی سے حاصل کر چکے تھے۔ جیسے کے آئر لینڈ کے لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے ایک تو جبر و تشدد کا استعمال کیا گیا۔ دوسرا آئر لینڈ کی کیتھولک آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے وہاں پر وٹسٹنٹ لوگوں کو آباد کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آئر لینڈ دو فرقوں میں بٹ گیا اور آئر لینڈ کے زیادہ تر جاگیر دار پر وٹسٹنٹ بن گئے۔ ہندوستان کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں حکومت کرنے کے لیے انگریزوں کو اور طرح کی حکمت عملیاں اختیار کرنا پڑیں۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے انگریزوں نے سب سے ضروری اور اہم یہاں کی تہذیب و تمدن، ثقافت اور تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کو جانا۔ اس مقصد کے لیے صرف سابقہ سفر ناموں، پادریوں یا تاجروں کی معلومات پر ہی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ حکومتی ذرائع کو استعمال میں لا کر براہِ راست ہندوستان کے ماضی پر تحقیق شروع کی گئی۔

ہندوستان کے ماضی کی بازیافت محض علمی جستجو یا تحقیق تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے پس منظر میں سیاسی مقاصد بھی کار فرما تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ انگریزوں کو اس ملک کی تاریخ، تہذیب و تمدن، لوگوں کی عادات اور رسومات وغیرہ سے مکمل واقفیت حاصل ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف قسم کے سروے کروا کر اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کی گئیں۔ اس طرح ان معلومات کی بدولت انگریزی حکومت کے لیے آسان ہو گیا کہ وہ ہندوستانیوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں اور ان کے سات کیسا سلوک روا رکھیں؟ یعنی ہندوستانیوں کے متعلق حاصل کردہ معلومات انگریزی مقتدرہ کی طاقت میں اضافہ کا باعث بنیں اور اس طاقت کو احسن طریقے سے کام میں لاتے ہوئے سماجی شعبوں میں منتقل کر دیا گیا اور اپنے مطلوبہ مقاصد و نتائج کو حاصل کیا گیا۔ [۴۸]

د۔ ہندوستانی شعبہ علم و ادب، زبان اور انگریزی نو آبادکارانہ عزائم

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی سماج تہذیب و تمدن، ثقافت، زبان و ادب اور رسوم و رواج جیسے شعبوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہر خطے، ہر سماج کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، زبان اور مذہب وغیرہ دوسرے سماج سے مختلف ہوتے ہیں مگر یورپی نو آبادیاتی قیام اپنے اندر چونکہ یورپ کی مرکزیت کا تصور لیے ہوتا ہے لہٰذا وہ نو آبادیاتی اقوام کے سماجی شعبوں مثلاً تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، علم و تعلیم اور رسوم و رواج کو ہدفِ تنقید بنا کر اس کے مقابلے میں یورپ یا مغرب کا علم، نظامِ حکمرانی، تعلیمی تصورات اور ثقافتی رسوم کو مثالیہ اور آفاقی

قرار دے کر نو آبادیوں میں انہیں پھیلانے اور رائج کرنے کی کوشش کرتا ہے۔[۴۹] نو آبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات میں سے ایک نظریہ جسے دراصل نو آبادکاروں کی طرف سے نو آبادیاتی باشندوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کے لیے اختیار کردہ ایک حکمت عملی تصور کیا جاسکتا ہے کہ مطابق نو آبادکار، نو آبادیاتی اقوام کے رسوم و رواج، ثقافت، تہذیب و تمدن اور ان کے ادب کو اُن کی پسماندگی اور زوال کی علامت کے طور پر پیش کرتا ہے۔[۵۰] اس طرح نو آبادکار نو آبادیاتی باشندوں کی زندگی میں ایک بہت بڑے خلا کا تعین کرتا ہے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے بڑی چالاکی سے نو آبادیاتی باشندوں کے سامنے اپنی شخصیت، اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے، سیاسی نظریات اور فنون کو نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے۔[۵۱] بالکل ایسی ہی حکمت عملی ہندوستان میں ہمیں انگریزی مقتدرہ بھی اختیار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اگر مثال کے طور پر ہندوستانی شعبۂ زبان و ادب اور علم و تعلیم کو لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اسے انگریزی مقتدرہ کی طرف سے کس قدر کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حوالے سے برطانوی پارلیمنٹرین، کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن کے چیئرمین اور ہندوستان کی سپریم کونسل میں بطور ممبر قانون منتخب ہونے والے رکن لارڈ تھامس بینگٹن میکالے کی پیش کردہ تعلیمی رپورٹ کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس رپورٹ میں ہندوستانی سرمایہ علم و ادب اور زبان کو یورپی سرمایہ علم و ادب اور انگریزی زبان کے مقابلے میں بے وقعت قرار دے کر اسے ہندوستانیوں کی ترقی کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا گیا اور اس طرح نہایت چالاکی سے یورپین علوم و ادب اور انگریزی زبان کی تحصیل کو ہندوستانی نو آبادیاتی باشندوں کی ترقی کے لئے ناگزیر قرار دیا گیا۔ یہاں ہم میکالے کی تعلیمی رپورٹ کے تنقیدی جائزہ کی مدد سے ہندوستانی زبان اور علم و ادب کے متعلق اس کی پیش کردہ آراء سے ہندوستانی اور مشرقی علوم و ادب کے متعلق انگریزی مقتدرہ کی نو آبادکارانہ ذہنیت اور عزائم کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔[۵۲]

مقامی زبانوں اور ادب کا یورپین سرمایۂ ادب سے تقابل اور انگریزی زبان کی اعلیٰ حیثیت کا اظہار میکالے اپنی رپورٹ میں کچھ اس طرح کرتا ہے:

> یوں لگتا ہے کہ تمام مختلف الخیال لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں اس علاقے کے باشندے عام طور پر مقامی زبانیں استعمال کرتے ہیں جو ادبی اور سائنسی معلومات سے تہی دست ہیں۔ علاوہ ازیں ذخیرۂ الفاظ اور اصطلاحات کے لحاظ سے اس قدر کم مایہ اور قوتِ اظہار کے اعتبار سے اس درجہ ناتراشیدہ ہیں کہ جب تک انہیں کسی ترقی یافتہ زبان سے تونگر نہیں بنادیا جاتا۔ ان زبانوں میں کسی قابلِ قدر علمی شاہکار کا ترجمہ کرنا سہل نہیں ہوگا۔۔۔۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ زبان کونسی ہو؟ کمیٹی کے پچاس فی صد اراکین مصّر ہیں کہ یہ زبان انگریزی ہے۔ باقی نصف اراکین نے اس مقصد کے لیے کوئی

ایسا شخص نہیں پایا جو اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ یورپ کی کسی اچھی لائبریری کی الماری میں ایک تختے پر رکھی ہوئی کتابیں، ہندوستان اور عرب کے مجموعی سرمایۂ ادب علمی پر بھاری ہیں۔ [۵۳]

انگریزی کے مقابلے میں ہندوستانی مقامی زبانوں کی کم مائیگی کے تصور کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ میکالے نہ صرف عربی اور سنسکرت میں تخلیق کردہ شعری سرمائے کو قدر و قیمت میں یورپین تخلیقات شعری سے کم تر قرار دیتا ہے بلکہ وہ سنسکرت میں لکھی ہوئی تمام کتابوں میں درج تاریخی معلومات کو انگلستان کی ابتدائی درس گاہوں میں شامل علمی مواد سے بھی قدر و قیمت کے لحاظ سے کم تر قرار دیتا ہے۔ یہی فیصلہ وہ ہندوستانی شعبۂ فلسفہ، طبیعات اور اخلاقیات پر بھی صادر کرتے ہوئے ان سرمایہ علوم کو غیر مستند قرار دیتا ہے۔ [۵۴]

میکالے اپنی رپورٹ میں مشرقی زبانوں اور علوم کے مقابلے میں انگریزی زبان اور اس کے سرمایۂ علم کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

۔۔۔ ہماری زبان تو یورپ بھر کی زبانوں میں ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔۔۔۔ اس زبان نے فطرتِ انسانی اور حیاتِ انسانی کی متوازن اور شگفتہ ترجمانی کی ہے۔ اس میں مابعد الطبیعات، اخلاقیات، امورِ سلطنت، فلسفۂ قانون اور کاروبارِ تجارت میں بے حد عمیق غور و فکر کا سرمایہ موجود ہے۔ اس زبان میں ہر تجارتی علم کے بارے میں ایسی مکمل اور صحیح معلومات فراہم ہیں جن کی مدد سے صحت عامہ کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ راحت و آسائش میں اضافہ ہو سکتا ہے اور فراست انسانی کو نئی نئی وسعتیں مل سکتی ہیں۔ انگریزی زبان سے جسے بھی واقفیت ہے اسے اس وسیع فکری اثاثے تک ہمہ وقت رسائی حاصل ہے جسے روئے زمین کی دانشور ترین قوموں نے باہم مل جل کر تخلیق ہے۔ [۵۵]

یوں میکالے نہ صرف انگریزی زبان اور یورپی علوم کو مشرقی علوم کے مقابلے میں برتر قرار دیتا ہے بلکہ وہ یورپی اقوام کو اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کا حامل قرار دیتے ہوئے انہیں اعلیٰ وارفع حیثیت عطا کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتا ہے۔ میکالے انگریزی کو علوم و فنون کی زبان تو قرار دیتا ہی ہے مگر ہندوستان میں چونکہ انگریزی مقتدر طبقے کی زبان بھی ہے لہٰذا وہ ہندوستانیوں کے لیے اسی زبان کو تحصیلِ علم کا ذریعہ بنانے پر زور دیتا ہے۔ [۵۶]

میکالے کی تعلیمی رپورٹ مشرقی زبان و ادب اور علوم (سائنس، جغرافیہ، تاریخ اور اخلاقیات وغیرہ) کے حوالے سے کم تر اور تضحیک آمیز آراء سے بھری پڑی ہے۔ رپورٹ کے آخر میں میکالے انگریزی میں تعلیم دینے کی حکمت عملی میں پوشیدہ وہ راز بھی افشاں کرتا ہے جو انگریزی اقتدار کو آئندہ ہندوستان میں مستحکم بنانے کے لیے کارگر ثابت ہو سکتا تھا۔ میکالے کے مطابق:

فی الوقت ہماری بہترین کوشش ایک ایسا طبقہ معرضِ وجود میں لانے کے لیے وقف ہونی چاہیے جو ہم

میں اور کروڑوں انسانوں کے مابین جن پر ہم حکومت کر رہے ہیں ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ طبقہ ایسے افراد پر مشتمل ہو جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو، لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۵۷]

اس طرح میکالے اپنی رپورٹ کے ذریعے جو فروری ۱۸۳۵ء میں پیش کی گئی، دراصل حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں کے لیے ایسی تعلیمی پالیسی کا نفاذ چاہتا تھا جس کے ذریعے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں مغربی علوم کی تعلیم دی جاسکے اور مشرقی تعلیم کے اداروں کو بند کر کے اس سے بچنے والی رقم کو انگریزی تعلیم کی ترقی پر صرف کیا جائے۔[۵۸] میکالے کی تعلیمی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ صادر کیا کہ مشرقی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی آئندہ مالی معاونت نہ کی جائے گی اور سرکاری روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے گا۔[۵۹]

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ میکالے کی اس تعلیمی رپورٹ کو پیش کرنے سے پہلے بھی ہندوستان میں مشنری سرگرمیوں اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کے پیش نظر انگریزی زبان کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔ اس لیے راجہ رام موہن جیسے دوراندیش اور روشن خیال ہندوستانی انگریزی زبان و ادب اور علوم کی تدریس کی حمایت بڑے زور وشور سے کر رہے تھے مگر میکالے نے انگریزی زبان وادب کے مقابلے میں مشرقی زبان و ادب اور علوم کے بارے میں جو استحصالی رویہ اختیار کیا وہ یقیناً نوآبادکارانہ ذہنیت کا شاخسانہ ہی ہوسکتا ہے۔[۶۰]

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر میکالے کی رپورٹ میں پیش کردہ مقامی معاونین کے تصور کو ہندوستان میں نوآبادیاتی نظام کی تکمیل کے حوالے سے ایک انقلابی تصور قرار دیتے ہیں۔[۶۱] میکالے کے تجویز کردہ ان مقامی معاونین (زمیندار، جاگیردار، تاجر، مذہبی رہنماؤں) نے اور ایسے تعلیم یافتہ افراد نے جو ذہنی طور پر مغربی تہذیب سے مرعوب و متاثر تھے۔ آگے چل کر ہندوستان میں برطانوی راج کی جڑوں کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔[۶۲] تاہم تعلیماتِ عامہ کی کمیٹی نے ایک سال بعد ہی اپنی رپورٹ میں انگریزی زبان اور مغربی علوم کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں کی ترقی کو بھی سرکاری تعلیمی پالیسی کا حصہ بنالیا تاکہ یورپی علم وادبیات کی ترسیل براہِ راست اور فطری طریقے سے انجام پائے اور رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا جاسکے۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کی تعلیم و تحصیل کے ذریعے انگریزی حکومت کا مقصد ہندوستانیوں کو روشن خیال اور میکالے کی پیش کردہ تجویز کے مطابق کالا انگریز بنانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کا بھی سہارا لیا گیا۔[۶۳] چارلس ٹریولیلین اس حوالے سے نوآبادکارانہ عزائم کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

ہندوستانی نوجوان ہم سے ہمارے ادب کے ذریعے مانوس ہونے کے بعد ہمیں غیر ملکی سمجھنا ترک کر دیتے ہیں۔ وہ ہماری ہی طرح ہمارے عظیم لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ یکساں طریقے سے تعلیم حاصل کرنے، یکساں باتوں میں دلچسپی لینے، یکساں مشاغل میں ہمارے ساتھ مصروف ہونے کے بعد ہندوؤں سے زیادہ انگریز بن جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح گال یا اٹلی کے لوگ، رومیوں سے بڑھ کر رومی بن گئے۔ [۶۴]

نوآبادیاتی صورتِ حال کے حوالے سے فرانز فینن اور البرٹ میمی کے بیان کردہ موٗقف کے مطابق نوآبادیاتی نظام میں نوآبادیاتی باشندے نہ صرف نوآبادکار کے دیے گئے کردار اور تصورات کو اپنے متعلق درست خیال کر لیتے ہیں بلکہ اس کے مطابق جینا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے میں خود نوآبادکاروں کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ [۶۵] ہندوستان کی نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے جیسے کہ ہم دیکھتے ہیں کے یہاں انگریزی مقتدرہ کی جانب سے ہندوستانی اور بحیثیت مجموعی مشرقی زبانوں اور علوم وادب کی کم مائیگی کا تصور پیش کر کے اس کے مقابلے میں یورپین علوم وادب اور زبانوں خاص کر انگریزی زبان کی برتری کا جو تصور پیش کیا گیا اس نے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جس نے نہ صرف یورپی علوم اور انگریزی زبان کے متعلق انگریزی مقتدرہ کے پیش کردہ تصور کو قبول کرتے ہوئے یورپین علوم وادب اور انگریزی زبان کو اپنی کامیابی اور ترقی کا ذریعہ سمجھنا شروع کر دیا بلکہ وہ اس کے حصول کے لیے کوشاں بھی ہو گئے۔

سرسید احمد خان جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی نشاطِ ثانیہ کا بیڑہ اٹھایا وہ خود انگریزی زبان اور علوم وفنون کے متعلق انگریزی مقتدرہ کے کلامیوں سے کس قدر متفق تھے، اس بات کا اندازہ سرسید احمد خان کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

جو شخص اپنی قومی ہمدردی سے اور دور اندیش عقل سے غور کرے گا وہ جانے گا کہ ہندوستان کی ترقی، کیا علمی اور کیا اخلاقی، صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم ہمارے دستِ مال ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں۔ ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود آپ کرنی سیکھیں۔ ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنی محسن و مربی سمجھیں۔ [۶۶]

ہندوستانی مسلمانوں کو یورپی علوم وفنون اور انگریزی زبان وادب سے روشناس کرانے کے لیے سرسید احمد خان نے بہت سے عملی اقدامات اٹھائے مثلاً ۱۸۷۵ء میں انہوں نے علی گڑھ میں سکول قائم کیا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسید

کی کوششوں سے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن نے علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ ان اداروں میں دی جانے والی تعلیم ہندوستانی طلباء کے دلوں میں گھر کر گئی اور وہ جلد ہی مغربی علوم و فنون کی تحصیل میں دلچسپی لینے لگے۔[۶۷]
سر سید کی جانب سے مسلمانوں کو مغربی سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی سے متعارف کروانے کے لیے ۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سر سید اس سوسائٹی کے قیام کے ذریعے ہندوستان میں نہ صرف مغربی علوم وفنون (تاریخ، جغرافیہ، نیچرل سائنس، جیالوجی، فزکس اور فلاحت وغیرہ) کی ترویج کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کے ذریعے وہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مخاصمت کم کر کے انہیں ایک دوسرے کے قریب بھی لانا چاہتے تھے۔ اس سوسائٹی میں مغربی علوم و فنون کی کتب کا اردو میں ترجمہ کر کے عامۃ الناس کو ان علوم سے براہِ راست استفادہ حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا۔[۶۸] اسی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام ایک ہفتہ وار اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء میں شائع کرنا شروع کیا گیا۔ یہ اخبار گورنمنٹ اور عوام کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔[۶۹]

انگلستان سے واپس آنے کے بعد ۱۸۷۰ء میں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید علوم کی تعلیم کی طرف راغب کرنے، صنعت و حرفت اور زراعت کی طرف توجہ دینے، غلط قسم کے رسوم و رواج کو ترک کرنے نیز مسلمانوں میں تہذیب و شائستگی پیدا کرنے اور اس حوالے سے شعور اجاگر کرنے کے لیے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا۔[۷۰] غرض کہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب، زبان و ادب اور علوم و فنون سے روشناس کرانے کے لیے سر سید احمد خان نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کو جدید مغربی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن سے روشناس کرانے میں سر سید کا نام اور کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں یہی کردار راجہ رام موہن رائے اور اُن کی تحریک برہمو سماج نے ادا کیا بلکہ اس ضمن میں راجہ رام موہن رائے کو اولیت حاصل ہے۔ راجہ موہن رائے اور ان کی تحریک نے ہندوؤں کی تعلیمی سرگرمیوں کو خاص اہمیت دی تاکہ ہندوؤں کو جدید مغربی علوم سے روشناس کرایا جاسکے۔ اس ضمن میں کلکتہ کے اینگلو ہندو مدرسہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔[۷۱]

راجہ رام موہن رائے کی دوراندیش طبیعت نے جب یہ بھانپ لیا کہ ہندوستان کے زوال کے اسباب اندرونِ ملک موجود ہیں اور انہیں انگریزوں کا پلڑا دن بدن بھاری ہوتے دکھائی دے رہا تھا تو انہوں نے نئے علوم کی ترویج کے لیے انگریزوں سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کر لی۔ اسی لیے ۱۸۲۳ء میں جب لارڈ ایمہرسٹ نے مشرقی علوم کے فروغ کا منصوبہ بنایا تو راجہ رام موہن رائے نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے خود انگریز حکام سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستانی طالب علموں کو ایسے علوم دینے کے بجائے جس سے وہ پہلے سے ہی واقفیت رکھتے ہیں، جدید مغربی علوم جیسے کہ

طبیعات، کیمیا اور اناٹومی وغیرہ کی تعلیم دیں۔

راجہ رام موہن رائے اور ان کی تحریک برہمو سماج عیسائیت سے متاثر اور مذہب کو عقلیت کی کسوٹی پر پرکھنے کی قائل تھی۔ [۴۲] سر سید احمد خان بھی مذہب کے معاملے میں عقلیت پسند تھے اور انہوں نے اپنے انہی عقلیت پسند خیالات کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی جس کی وجہ سے انہیں مذہبی حلقوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور سر سید کے خیالات کو فرقہ نیچریہ سے تعبیر کیا گیا۔ [۴۳]

نوآبادیاتی صورتِ حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات میں ہم البرٹ میمی کے اس نظریہ کو بھی زیرِ بحث لا چکے ہیں جس کے مطابق نوآبادیاتی صورتِ حال میں نوآبادیاتی باشندوں کے اختیار کرنے کے لیے دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ایک انجذاب اور دوسری صورت بغاوت ہے۔ نوآبادیاتی باشندہ یا تو انجذاب کا عمل اختیار کرتے ہوئے نوآبادکار کی شخصیت، نظامِ فکر اور ثقافت کو مکمل طور پر جذب کر کے اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ اپنی زبان، تاریخ اور ثقافت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے یا پھر نوآبادیاتی باشندہ بغاوت کا عمل اختیار کرتا ہے۔ بغاوت کے عمل میں نوآبادکار کی تہذیب و ثقافت کو رد کیا جاتا ہے اور اپنا اثبات کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں علاقائیت اور قومی شناخت کو فروغ دیا جاتا ہے اور ماضی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ [۴۴]

نوآبادیاتی صورتِ حال کے متعلق البرٹ میمی کے اس نظریے کو پڑھنے کے بعد اگر اس حوالے سے برصغیر کی بات کی جائے تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ راجہ رام موہن رائے اور ان کی تحریک آریہ سماج جبکہ سر سید احمد خان اور ان کی تحریک علی گڑھ اپنے اندر مغربی تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور علوم و فنون کے انجذاب کا عنصر لیے ہوئے تھی۔ لہٰذا ہندوستان میں مغربیت کے فروغ میں دونوں رہنماؤں اور ان کی جاری کردہ تحریکوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ مذہب کے معاملے میں بھی دونوں رہنماؤں نے آزاد خیالی اور عقلیت پسندی کا مظاہرہ کیا لہٰذا ہندوستان میں ان کے اور ان کی جاری کردہ تحریکوں کے خلاف مغربیت مخالف طبقے نے اعلانِ بغاوت بلند کیا۔ اس طرح ہمیں ہندوستان کی نوآبادیاتی صورتِ حال میں نہ صرف نوآبادکاروں بلکہ مغرب پسندوں کے خلاف بھی بغاوتی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

راجہ رام موہن رائے کی جاری کردہ تحریک کو کچلنے کے لیے ایک نئی تحریک آریہ سماج کے نام سے شروع کی گئی۔ اس تحریک کے بانی دیانند سرسوتی نے ہندومت کے ماضی سے رہنمائی حاصل کی اور ہندوستانی قومیت کا نعرہ لگا کر ویدوں اور پرانوں کے زمانے کی طرف لوٹنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔ [۴۵] جب کہ سر سید احمد خان کے مذہبی و تعلیمی امور اور معاشرتی و تہذیبی اصلاح پسندی کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے تہذیب الاخلاق کے مد مقابل بہت سے رسائل جیسے کے نور الآفاق، امداد الآفاق اور تائید الاسلام نکالے گئے۔ ان رسائل میں سر سید کی مغربیت پسند پالیسی کو

تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔ ان رسائل کے علاوہ سرسید اور ان کی پالیسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والا اخبار، اودھ پنچ، بہت مقبول ہوا۔ یہ ہفت روزہ اخبار منشی سجاد حسین کی زیرِ نگرانی ۱۸۷۷ء میں لکھنو سے جاری کیا گیا۔ [۷۶] اس کے مدیر منشی سجاد حسین چونکہ خود مشرقیت پسند تھے للٰذا انہوں نے ہندوستان میں مغربی جدت پسندی کے خلاف آواز اٹھائی اور طنز و مزاح کی آڑ میں منشی سجاد حسین اور اس اخبار سے وابستہ دیگر مزاح نگاروں نے سرسید کی ذات اور مغربی تہذیب و تعلیم کے متعلق اُن کی اختیار کردہ پالیسیوں کو اپنے مزاح کا نشانہ بنایا۔ ان مزاح نگاروں میں اکبرالٰہ آبادی جیسے بڑے شاعر بھی شامل تھے۔ اکبرالٰہ آبادی کو سرسید احمد خان کی مغربیت پسندی بالکل نہ بھاتی تھی کیونکہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم کی نئی روشنی جسے پھیلانے کے لیے سرسید اتنی کوششیں کر رہے ہیں۔ دراصل زوالِ مشرق کا سبب بنے گی۔

علی گڑھ تحریک کے پلیٹ فارم سے چونکہ سرسید نے مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے احیاء کے ساتھ ساتھ مذہب کی نئی تعبیر پیش کرنے کی کوشش بھی کی جسے اکبر اپنے تئیں درست خیال نہ کرتے تھے، للٰذا انہوں نے سرسید کے اس عمل کی برملا مخالفت کرتے ہوئے انہیں ہدفِ تنقید بنایا حتیٰ کہ وہ ان کی شاعری کا ایک مزاحیہ کردار بن گئے:

برگد کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے
مغربی کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے
شیخ برگد کہتے ہیں مذہب ضروری ہے مگر
فائدہ مذہب کا جو کچھ ہے اسی دنیا میں ہے [۷۷]

سرسید کی مذہبی آزاد خیالی پر اودھ پنچ کے علاوہ اُن کے کچھ رفقاء نے بھی اختلاف کیا۔ ان میں محسن الملک، مولوی علی بخش، شررؔ، سید امداد علی، شبلی نعمانی اور کسی حد تک مولوی نذیر احمد دہلوی شامل تھے۔ [۷۸] ہندوستانی نوآبادیاتی صورتِ حال میں سرسید کی مغرب پرستی اور مذہبی آزاد خیالی کے خلاف بغاوت دراصل ایک فطری عمل تھا۔ برصغیر کے لوگ اپنی علاقائی و مقامی زبانوں سے مذہبی وابستگی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشرقی زبانوں کی کم مائیگی کو جواز بنا کر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی گئی تو اس کی مخالفت زیادہ تر مذہبی حلقوں کی جانب سے کی گئی۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں کہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تدریس کے پیچھے دراصل عیسائیت کے احیاء کے مقاصد بھی کارفرما تھے۔ [۷۹] خود سرسید احمد خان کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ عیسائی مبلغوں کو ہندوستان میں سرکاری سرپرستی حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد سے منحرف کرنے کی کوششوں میں مصروف

ہیں۔ چنانچہ انہوں نے رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند میں بغاوت کی ایک اہم وجہ مذہب میں اسی بے جا دخل اندازی کو بھی شمار کیا۔ آپ اس حوالہ سے رسالے میں لکھتے ہیں کہ :

۔۔۔۔۔سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ اعلانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں کر کے مثل نابود کر دینے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس اور محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جوان کا مذہب ہے اس کے مسائل سے ناواقف کر کے اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے۔ ۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کیے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی و شمالی میں ادارہ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔[۸۰]

اس کے علاوہ سر سید نے ہندوستان میں پادری حضرات کی مشنری سرگرمیوں کو بھی بغاوت کا سبب ٹھہرایا۔ سر سید کے مطابق پادری لوگوں کو ہندوستان میں نہ صرف گورنمنٹ اور اعلیٰ انگریزی حکام کی سرپرستی حاصل تھی بلکہ ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ اکثر انگریز حکام تو اپنے ملازموں کو اپنی کوٹھی میں بلا کر پادریوں کا وعظ سننے کو کہتے تھے۔ دوسری طرف پادری حضرت صرف وعظ نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے لوگوں اور مقاموں کو بُرا کہتے اور ہتک سے یاد کرتے اور اس طرح متعلقہ مذاہب کے افراد کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ حکام لوگوں کو مشنری سکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کرانے کی ترغیب دیتے۔ اور پھر جو طالب علم عیسائی مذہب کے عقائد کے مطابق امتحان میں جوابات دیتے ان کو انعام سے نوازا جاتا۔ غرض کہ ان سب باتوں کی وجہ سے رعایا حکومتِ انگریزی سے بدگمان ہوئے اور بغاوت پر مجبور ہوئے۔[۸۱]

انگریزی مقتدرہ کے لیے ہندوستانیوں کو انگریزی زبان اور اس کی تعلیم دینا دراصل مغربی علوم و فنون کی ترسیل کے علاوہ عیسائیت کے فروغ کا ایک ذریعہ بھی تھی۔ اس بات پر ہمارا اعتقاد اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم خود انگریز مصنفین و ناقدین کے منہ سے اس قسم کے اعترافات سنتے ہیں جیسا کہ جیمز برائس نے کیا:

سب جانتے ہیں کہ ہندوستانی لوگوں کی تبدیلیٔ مذہب کا معاملہ کچھ سالوں سے متعدد مذہبی اور لامذہبی تنظیموں کے لیے گہری دلچسپی کا حامل رہا ہے، تقریباً ہم سب اس امر پر متفق ہیں کہ واحد قابل عمل منصوبہ بالواسطہ یعنی بذریعہ تعلیم ہے۔۔۔۔ یہ کہ پہلے ہل چلایا جائے جو اب تک ناقابل نفوذ زمین کو نرم کرے جس میں بالآخر ایک دن عیسائیت کا بیج جڑ پکڑ لے گا۔[۸۲]

ہندوستانیوں کے لیے انگریزی مقتدرہ کا وضع کردہ نظامِ تعلیم اور تعلیمی پالیسیاں دراصل اپنے اندر بعض پوشیدہ نوآبادیاتی مقاصد لیے ہوئے تھیں جیسے کہ مشرقی زبانوں، علوم و فنون اور ادب کے متعلق نوآبادیاتی باشندوں کو

گمراہ کن تصورات میں مبتلا کر کے ان کے مقابلے میں مغربی علوم وفنون اور انگریزی زبان وادب کی اجارہ داری کو قائم کرنا۔اس طرح مغربی تعلیم کے پروردہ ایسے ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کی جماعت تیار کرنا جو ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے تسلسل اور استحکام میں اہم کردار ادا کر سکیں۔ہندوستانیوں کے مذہبی عقائد اور رسوم ورواج کو ہدف تنقید بنا کر عیسائیت کے احیاء کے لیے راہیں ہموار کرنا۔تاریخ گواہ ہے کہ انگریز برصغیر میں اپنے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کرتے رہے اور بالآخر ان مقاصد کو حاصل کرنے میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گئے مگر وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا اور نہ مکروہ تدبیریں ہمیشہ کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں مغربی تہذیب کے بول بالا میں ہی چند ایسی سعید روحوں نے پرورش پائی جو اگرچہ انگریزی نظام تعلیم کی ہی پروردہ تھیں مگر درحقیقت اپنے اندر حقیقی آفاقی نقطۂ نظر سمیٹے ہوئے تھیں۔انہوں نے مغرب سے سرمایۂ علم تو سمیٹا مگر اپنی تہذیب و تمدن، اپنی ثقافت، روایات، زبان اور مذہب سے روگردانی کی قیمت پر نہیں بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر۔اس طرح انہوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے جیسے کروڑوں انسانوں کو لبادۂ غلامی سے نجات دلا کر اپنی زمین کا خود مالک بنایا۔ہندوستانی مسلمانوں میں یہ سعید روحیں بے شک اقبالؔ اور جناح کی ہی تھیں۔ہم سب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ان دونوں عظیم رہنماؤں نے برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے عروج کے زمانے میں پرورش پائی اور دونوں نے مغرب سے براہِ راست علم واکتساب بھی حاصل کیا مگر دونوں نے اندھا دھند پیرویٔ مغرب کی روشِ عام کو مسترد کرتے ہوئے اس کے محاسن کو مدنظر رکھا جبکہ عیوب کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔اقبالؔ نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دے کر ان کے لیے ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا نظریہ پیش کیا۔قائداعظم نے اس نظریہ کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے انتھک کوششیں کیں اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں برصغیر کے عوام کو انگریزی استعمار کے تسلط سے آزادی دلا کر برطانوی نوآبادیاتی نظام کا قلع قمع کر دیا۔

یوں اگر تنقیدی نقطۂ نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید کے نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات و حقائق جو انہوں نے زیادہ تر افریقہ اور مشرق وسطی کی نوآبادیاتی صورت حال کا بغور جائزہ لینے کے بعد پیش کیے تھے ان میں سے بعض اہم نظریات کی روشنی میں جب ہم نے برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی صورت حال کا جائزہ لیا تو ہمیں یہاں بھی برطانوی سامراج طاقت کا استعمال، ہندوستانی تہذیب و تمدن اور زبان وادب کو فرسودہ اور دقیانوسی قرار دے کر ان پر انگریزی زبان اور مغربی تہذیب و ثقافت کو مسلط کرنا وغیرہ جیسی حکمت عملیاں اور ہتھکنڈے اپناتی ہوئی دکھائی دی اور برطانوی سامراج کے ان نوآبادیاتی ہتھکنڈوں اور حکمت عملیوں کے ردّعمل میں ہمیں ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کی جانب سے وہی رویے یعنی

انجذابی، بغاوتی اور آفاقی دیکھنے کو ملے جن کا مشاہدہ بیان کردہ نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی نظریہ سازوں نے زیادہ تر افریقہ اور مشرق وسطی کی نوآبادیاتی صورت حال میں کیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ البرٹ میمی نے افریقہ کی نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے اپنے اخذ کردہ نظریات کو تمام نوآبادیاتی معاشروں پر یکساں طور پر لاگو قرار دیا تھا۔ مگر یہاں ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ برصغیر کی نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے ہمیں ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کی طرف سے یورپی تہذیب و تمدن اور انگریزی زبان وادب کے حوالے سے اختیار کردہ تینوں طرح کے رویے (انجذابی، بغاوتی اور آفاقی) اس دور میں دیکھنے کو ملتے ہیں جب برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا۔ یہاں ہمارے لیے یہ بات باعث دلچسپی اور تجسس کی حامل ہے کہ برصغیر میں ابتدائی نوآبادیاتی دور یعنی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ایسے ہندوستانی باشندے جنہیں یورپ کا سفر کرنے اور یورپی تہذیب و تمدن کا براہ راست مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا اور انہوں نے سفر یورپ سے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات کو سفر ناموں کی صورت تحریری طور پر قلمبند کرنے کا اہتمام بھی کیا تھا۔ انہوں نے یورپ اور یورپی خاص کر برطانوی زندگی اور تہذیب و تمدن کے کن پہلوؤں کا مشاہدہ کیا اور ان پر اپنی کس قسم کی آراء و تاثرات اور رویوں کا اظہار کیا؟ ہم ان تمام سوالات کے جوابات اس تحقیقی مقالے کے آئندہ ابواب میں اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کے نوآبادیاتی تناظر میں تحقیقی و تنقیدی جائزہ سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ The Treaty of Tordesillas ایک معاہدہ تھا جو پرتگال اور اسپین کے درمیان ۱۴۹۴ء میں طے پایا۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں ممالک نے کرسٹوفر کولمبس کی نئی دریافت کردہ دنیا امریکہ کو یہ صرف نظر کرتے ہوئے کہ وہاں کون سی اقوام پہلے سے آباد ہیں، آپس میں برابر برابر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔

"Treaty of Tordesillas",E*ncyclodpedia Britannica*،

تاریخ ملاحظہ اکتوبر ۱۹، ۲۰۱۰ا،

www.britannica.comsevents,Treaty-of-Tordesillas

۲۔ بینڈکٹ سٹوشے (Benedikt Stuchtey)، "Colonialism and Imperialism, 1450-1950"، *Semantic Scholar*، جنوری ۲۴، ۲۰۱۱ء، تاریخ ملاحظہ نومبر ۲۵، ۲۰۱۸ء

www.semanticscholar.org-paper-colonialism

۳۔ "Albert Memmi"، Encyclopedia.org (تاریخ ملاحظہ نومبر ۲۵، ۲۰۱۸ء)

www.encyclopedia.com>people>history>albe/

۴۔ ہیلینا وائٹ (Helaena White)، "Memmi-Albert-Postcolonial Studeis"، *Scholar Blogs*، جون ۱۴، ۲۰۱۴، ۱۹ء، (تاریخ ملاحظہ اکتوبر ۹، ۲۰۱۸ء)

http://scholarblogs-emory-edu/postcolonialstudies/2014/06/19/memmi.albert/

۵۔ نیگریٹیوڈ (Negritude) ایک ادبی تحریک تھی جو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء میں پیرس میں رہنے والے اور فرانسیسی بولنے والے افریقن اور کریبین دانش وروں کے ہاتھوں شروع ہوئی۔ یہ تحریک دراصل فرانسیسی مقبوضات اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف ایک ردّ عمل تھا۔ Aime Cesaire اس تحریک کے بانی جبکہ Leopold Sedar Senghor جو ۱۹۶۰ء میں سینیگال جمہوریہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے اس تحریک کے نمائندہ تھے۔ اس تحریک کے ذریعے پیدا کیے گئے ادب میں مغربی اقدار کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔

اینا میکلن (Anna Micklin)، "Negritude Movement"، *Black Past*، جون ۲۹، ۲۰۰۸ء، (تاریخ ملاحظہ ۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء)

http://www.blackpast.org>globalafrican-history-movement/

۶۔ فرانز فینن (Frantz Fanan)، "Biography /List of works, study,guides & essys"، Gradesaver (تاریخ ملاحظہ نومبر ۹، ۲۰۱۸ء)،

http://www.gradesaver.com/author/frantz-fanon/

۷۔ "Edward W.Said Biography"، *Encyclopedia of World Biography*، (تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۲، ۲۰۱۸ء)،
http://www.notablebiographies.com>worldbiography>supplement_(Mi-50)

۸۔ ناصر عباس نیّر، "The free Encyclopedia", *Alchetron*، (تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲، ۲۰۱۸ء)
http://alchetron/com>Nasir-Abbas-Nayyer....

۹۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۳۔

۱۰۔ فرانز فینن، افتادگانِ خاک ، مترجم سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۲۔۳۷۔

۱۱۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید، ص ۲۴۔۲۵۔

۱۲۔ فرانز فینن، افتادگانِ خاک ، ص ۳۸۔

۱۳۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید، ص ۲۵۔

۱۴۔ محمد اشرف کمال، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۰۷۔

۱۵۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید، ص ۲۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰۔۳۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۱۔۳۲۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۳۔۳۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۵۔۳۷۔

۲۱۔ بینڈکٹ سٹوشے (Benedikt Stuche)، "Colonialism and Imperialism, 1450-1950"، *Semantic scholar*، جنوری ۲۴، ۲۰۱۱ء، (تاریخ ملاحظہ نومبر ۲۵، ۲۰۱۸ء)
www.semanticscholar.org-paper-colonialism

۲۲۔ ناصر عباس نیّر، مابعد نوآبادیات اردو کے تناظر میں (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۱۔

۲۳۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید، ص ۲۳۔

۲۴۔ نیٹ سلیون (Nate Sullivan)، "European Imperialism in India & the British East India Company"، Study.com، (تاریخ ملاحظہ، جنوری ۱۲، ۲۰۱۸ء)
http://study.com/.../european-imperialism-in-india-the-british-east-india-company.html

۲۵۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت(لاہور: نیاادارہ، ۱۹۳۷ء)، ص ۱۳۔۱۴۔

۲۶۔ شکیل انور، "The Advent of Europeans in India the Portuguese, the dutch and the danes"، *Jagranjosh*، اکتوبر ۲۰، ۲۰۱۷ء، (تاریخ ملاحظہ جنوری ۱۸، ۲۰۱۸، ۱۵ء)

http://www.jagranjosh.com>the-advent-of.....

۲۷۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۱۸۔

۲۸۔ شکیل انور، "The Advent of Europeans in India the Portuguese, the dutch and the danes"، *Jagranjosh*، ایضاً۔

۲۹۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۲۹۔

۳۰۔ ۱۵۰۵ء میں فرانسسکو دا المیدہ (Francisco De Almeida) کو ہندوستان میں پرتگالیوں کا پہلا وائسرائے بنا کر بھیجا گیا۔ بحرِ ہند میں تجارت کے لیے اس کی تشکیل کردہ پالیسی کو بلیو واٹر پالیسی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شکیل انور، "The Advent of Europeans in India the Portuguese, the dutch and the danes"، *Jagranjosh*، ایضاً۔

۳۱۔ محمد آصف اعوان، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد: اکبر الہٰ آبادی اور اقبال (لاہور: بزمِ اقبال، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۸۔۲۹۔

۳۲۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۳۵۔

۳۳۔ محمد آصف اعوان، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد: اکبر الہٰ آبادی اور اقبال، ص ۲۸۔۲۹۔

۳۴۔ شکیل انور، "The Advent of Europeans in India the Portuguese, the dutch and the danes"، *Jagranjosh*، ایضاً۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۷۰۔

۳۷۔ شکیل انور "The Advent of Europeans in India the Portuguese, the dutch and the danes"، *Jagranjosh*، ایضاً۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص ۴۷۔

۴۰۔ محمد آصف اعوان، مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد: اکبر الہٰ آبادی اور اقبال، ص ۳۱۔۳۲۔

۴۱۔ محمد ہاشم قدوائی، جدید ہندوستان کے سیاسی و سماجی افکار (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء)، ص ۸۔

۴۲۔ عبدالغنی، "پس منظر"، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند: فارسی ادب سوم ۱۷۰۷ء۔۱۹۷۲ء، مرتبہ سید فیاض محمود اور سید وزیر الحسن عابدی (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)، جلد پانچویں، ص۷۔

۴۳۔ روشن آراء اور عبدالسلام، تاریخ تحریکِ پاکستان حصہ اوّل (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان اُردو، ۱۹۹۳ء) ص۳۷۔

۴۴۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ص۷۴۔۷۵۔

۴۵۔ ایضاً، ص۳۶۔

۴۶۔ ایضاً، ص۸۵۔۸۶۔

۴۷۔ مبارک علی، برطانوی راج: ایک تجزیہ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص۳۴۔

۴۸۔ ایضاً، ص۳۵۔۳۷۔

۴۹۔ ناصر عباس نیّر، مابعدنوآبادیات اردو کے تناظر میں، ص۱۱۔

۵۰۔ فرانز فینن، افتادگانِ خاک، ص۳۷۔

۵۱۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید، ص۲۴۔

۵۲۔ بینگبٹن میکالے، میکالے اور برصغیر کا نظامِ تعلیم، مترجم سید شبیر بخاری (لاہور: آئینۂ ادب، ۱۹۸۶ء)، ص۱۷۔۱۸۔

۵۳۔ ایضاً، ص۳۰۔۳۱۔

۵۴۔ ایضاً، ص۳۱۔

۵۵۔ ایضاً، ص۳۲۔

۵۶۔ ایضاً، ص۳۳۔

۵۷۔ ایضاً، ص۴۵۔

۵۸۔ جے۔ پی۔ نائک اور سید نور اللہ، تاریخ تعلیم ہند، مترجم مسعود الحق (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، اشاعت اوّل، ۱۹۷۲ء)، ص۹۸۔۱۰۲۔

۵۹۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ (لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۱۹۹۶ء)، ص۱۷۸۔

۶۰۔ جے۔ پی۔ نائک اور سید نور اللہ، تاریخ تعلیم ہند، ص۹۴۔

۶۱۔ ناصر عباس نیّر، مابعدنوآبادیات اردو کے تناظر میں، ص۱۲۔

۶۲۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، ص۳۸۔

۶۳۔ ناصر عباس نیّر، مابعدنوآبادیات اردو کے تناظر میں، ۲۹۔

۶۴۔ ایضاً، ص۶۵۔

۶۵۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید ،ص،۴۵۔

۶۶۔ ایضاً،ص،۷۲۔

۶۷۔ عبداللہ یوسف علی،انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ،ص[illegible]۔

۶۸۔ افتخار عالم خان،سر سید احمد خان (دہلی:اردو اکادمی،۲۰۰۸ء)،ص۳۰۔

۶۹۔ ایضاً،ص۳۳۔

۷۰۔ روشن آراء اور عبدالسلام،تاریخ تحریکِ پاکستان حصہ اوّل،ص۴۲۔۴۷۔

۷۱۔ انور سدید،اردو ادب کی تحریکیں(کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۸۵ء)،ص۲۷۵۔

۷۲۔ ایضاً،ص۲۷۶۔۲۷۷۔

۷۳۔ عبداللہ یوسف علی،انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ،ص۲۷۵۔

۷۴۔ ناصر عباس نیّر، لسانیات اور تنقید ،ص۲۸۔

۷۵۔ انور سدید،اردو ادب کی تحریکیں،ص۲۸۹۔

۷۶۔ ظفر عالم ظفری،اردو صحافت میں طنز و مزاح(لاہور:فیروز سنز،۱۹۹۶ء)،ص۴۵۔

۷۷۔ انور سدید،اردو ادب کی تحریکیں،ص۳۳۰۔۳۳۲۔

۷۸۔ ایضاً،ص۳۳۶۔

۷۹۔ ناصر عباس نیّر، مابعدنوآبادیات اردو کے تناظر میں ،ص۶۹۔

۸۰۔ سر سید احمد خان،اسباب بغاوت ہند(علی گڑھ:یونیورسٹی پبلشرز،۱۹۵۸ء)،ص۴۳۔

۸۱۔ ایضاً،ص۴۴۔۴۵۔

۸۲۔ ناصر عباس نیّر، مابعدنوآبادیات اردو کے تناظر میں ،ص۷۰۔

باب دوم

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی
سفر نامہ نگار اور تصورِ یورپ

باب دوم:

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار اور تصورِ یورپ

ا۔ پس منظر

یورپی بحری جہاز جو پہلے پہل افریقی اور بعدازاں جنوب ایشیائی ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے انہوں نے ایک نئے سمندری راستے کے ذریعے ہندوستان سے یورپ جانے والے ہندوستانی باشندوں کی رہنمائی کی۔ ہندوستانی باشندے جو ۱۶۰۰ء سے مغرب کی طرف سفر کر رہے تھے، ان میں سے بیشتر نے انگلستان کا رخ کیا۔ اس طرح پہلے ۲۵۰ سالوں میں تقریباً بیس سے چالیس ہزار (۲۰۰۰۰۔۴۰۰۰۰) ہندوستانی مرد و خواتین نے جن کا تعلق ہندوستان کے مختلف طبقات سے تھا، مغرب کی طرف سفر کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان میں سے کچھ مرد و خواتین نے انگلستان میں ہی شادیاں کیں اور وہیں مقیم ہو گئے جبکہ باقی یورپی تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات سمیٹ کر وطن واپس لوٹ آئے۔ [1]

اٹھارہویں صدی کے نصف اول تک یورپ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کا یہ سلسلہ زبانی کلامی جاری رہا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی حیثیت اس قدر مستحکم ہو گئی کہ اس نے ہندوستان میں سیاسی مداخلت بھی شروع کر دی۔ 'فشر' کے مطابق اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی مقبوضات بڑھنے سے ہندوستان سے انگلستان جانے والے غلاموں اور ملازمین کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ جس میں ۱۷۷۹ء تک دس گنا اضافہ ہو گیا۔ [2] یہ اضافہ اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں سیاسی اثر و رسوخ کس قدر بڑھ گیا تھا۔ اس دور میں ہمیں انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں، دانشوروں، سیاحوں، عربی، فارسی، سنسکرت اور دیگر مقامی زبانوں کے اساتذہ، منشیوں، ملاحوں اور نوکروں کی قابل قدر تعداد کے علاوہ چند ایک ایسے تاجروں اور سیاست دانوں کے نمائندوں کی موجودگی کا بھی علم ہوتا ہے جو کمپنی کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہوئے تھے اور تجارتی لین دین کرتے تھے۔ تاہم ہندوستان میں جب کمپنی کی طرف سے ان کے ساتھ کچھ معاملات میں ناانصافی کی گئی تو انہوں نے اپنے معاملات براہ راست لندن بھیجے۔ ان میں سے کچھ کی دادرسی ہو گئی جبکہ کچھ بے مراد واپس لوٹے۔ ان تمام ہندوستانی باشندوں کو اپنے سفر یورپ سے جڑے مقاصد حاصل کرنے میں چاہے کامیابی ہوئی یا ناکامی، تاہم یہ تمام افراد اس ابتدائی نوآبادیاتی دور کے وہ باشندے ضرور کہلائے جو

انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے متعلق جن کا انہوں نے سفر کیا، آنکھوں دیکھی معلومات ساتھ لائے۔[۳]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ۱۷۵۷ء کے بعد کمپنی کے بڑھتے ہوئے فوجی اور سیاسی جارحانہ عزائم کے دور میں کچھ ایسے دانشور ہندوستانی باشندوں کی طرف سے یورپ کے متعلق سفر نامے تحریر کیے گئے جنہوں نے نوآبادیات کے اس ابتدائی دور میں مختلف مقاصد کے تحت سفر یورپ اختیار کیا۔ ان ہندوستانی باشندوں میں ایک کے سوا باقی سب نے انگلستان، جبکہ ان میں سے کچھ نے یورپ کے دوسرے ممالک کا سفر بھی کیا۔

ہندوستان کے اس ابتدائی نوآبادیاتی دور میں انگلستان کے متعلق اپنے سفر نامے تحریر کرنے والے ان ہندوستانی باشندوں کی تعداد چھ ہے۔ ان ابتدائی لکھنے والے تمام سفر نامہ نگاروں کا تعلق ہندوستان کی اقلیتوں سے تھا۔ تمام سفر نامہ نگار مرد تھے۔ ان میں سے پانچ مسلمان جبکہ ایک آرمینی عیسائی تھا۔

ان چھ سفر نامہ نگاروں میں سے دو نے انگلستان سے متعلق اپنے مشاہدات و تجربات کو بیان کرنے کے لیے انگریزی زبان کا استعمال کیا۔ ان میں جوزف امین (Joseph Emin)(۱۷۲۶ء۔۱۸۰۹ء) جو آرمینی عیسائی تھا، ایران میں پیدا ہوا مگر بعد ازاں ہندوستان آیا اور کلکتہ میں رہائش اختیار کر لی۔ اس نے لندن میں (۱۷۹۲ء) میں *Life And Adventures of Joseph Emin, An Armenian, written in English by himself* کے عنوان سے اپنا سفر نامہ شائع کروایا۔

شیخ دین محمد (Sake Dean Mahomet)(۱۷۵۹ء۔۱۸۵۱ء) جو اسلام سے انگلیسائی عیسائیت میں داخل ہو گیا۔ اس نے ۱۷۹۴ء میں دو جلدوں پر مشتمل اپنا سفر نامہ '*The Travel of Dean Mahomet*' کے عنوان سے کارک (آئرلینڈ) سے شائع کروایا اور اس میں ہندوستان سے انگلستان تک سفر کے حالات و مشاہدات کو قلمبند کیا۔[۴]

بقیہ چار ہندوستانی سفر نامہ نگار جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں انگلستان کے متعلق اپنے سفر نامے عربی اور فارسی زبان میں تحریر کیے ان میں مرزا شیخ اعتصام الدین (۱۷۳۰ء۔۱۸۰۰ء) مصنف شگرف نامۂ ولایت، منشی اسماعیل مصنف تاریخ جدید (۱۷۷۳ء)، میر محمد حسین لندنی (وفات ۱۷۹۰ء) مصنف رسالۂ احوال ملک فرنگ وہندوستان (۱۷۷۵ء۔۱۷۷۶ء) اور مرزا ابو طالب خان اصفہانی (۱۷۵۲ء۔۱۸۰۴ء) مصنف میسر طالبی فی بلاد افرنجی شامل ہیں۔[۵]

ان سفر نامہ نگاروں میں ابو طالب اٹھارہویں صدی کی اشرافیہ میں ممتاز شخصیت کے حامل ضرور ہیں اور انہوں نے ۱۷۹۹ء میں سفر یورپ بھی اختیار کیا مگر یورپ میں ان کا قیام ۱۷۹۹ء سے ۱۸۰۳ء تک رہا۔ ابو طالب کے

سفر نامہ کا پہلا مسودہ جو اب تک دستیاب ہو سکا ہے اس پر ۱۸۰۶ء کی تاریخ درج ہے۔[۶] جبکہ اس سفر نامے کی باقاعدہ طباعت واشاعت کا انتظام ابو طالب کی وفات کے چھ سال بعد فورٹ ولیم کالج کونسل کی طرف سے کیا گیا تھا۔ متن کی تصحیح ڈاکٹر ولسین کی نگرانی میں مرزا ابو طالب کے بیٹے مرزا حسن علی نے کی۔ اس طرح ۱۸۱۲ء بمطابق ۱۲۲۸ھ میں اس سفر نامہ کی طباعت کا انتظام ہندوستانی پریس کلکتہ کے زیر اہتمام ہوا۔ ابو طالب نے سفر یورپ کے دوران انگلستان، جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی اور عراق کی بھی سیاحت کی اور ان ممالک کے مشاہدات کو اپنے سفر نامے کی زینت بنایا۔ اسی لیے ابو طالب کے سفر نامے کو بعض محققین انیسویں صدی کے اوائل کا بہترین سفر نامہ قرار دیتے ہیں۔ یہ سفر نامہ اصلاً فارسی زبان میں تحریر کیا گیا تھا مگر اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر اسے انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اردو زبان میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔[۷] راقم الحروف کی تحقیق کا دائرہ کار چونکہ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کے دستیاب اردو متون سے استفادہ کرتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگاروں کے مشاہدات و تصورات یورپ کی بازیافت اور نو آبادیاتی نقطۂ نظر سے ان کی جانچ پڑتال تک محدود ہے۔ اس لیے راقم الحروف نے ان سفر نامہ نگاروں میں سے تین کا انتخاب اپنے تحقیقی مقالے کے لیے کیا ہے۔ ان میں منشی اسماعیل مصنف تاریخ جدید (۱۷۷۳ء) مرزا شیخ اعتصام الدین مصنف سفر نامہ شنگرف نامہ ولایت (۱۷۸۶ء) اور میر محمد حسین مصنف سفر نامہ رسالۂ احوالِ ملکِ فرنگ و ہندوستان شامل ہیں۔ ان سفر نامہ نگاروں کے علاوہ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے معروف اطالوی محقق الگساندرو بوسانی (Alessandro Baussani) (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۸ء) کے حوالے سے محمد عبداللہ نامی ہندوستانی شخص کو دیارِ فرنگ کا پہلا مسافر قرار دیا ہے۔ اس شخص کے متعلق بوسانی نے یہ قیاس بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ شخص ۱۷۷۱ء سے پہلے بخارا، اوہرن برگ اور ماسکو سے ہوتا ہوا سینٹ پیٹرز برگ پہنچا اور پھر وہاں سے چین کی طرف چلا گیا۔[۸] جنوبی ایشیاء سے مغرب کی طرف سفر کرنے والے باشندوں اور ان کے تحریر کردہ سفر ناموں میں دلچسپی کی بنا پر ڈاکٹر نجیبہ عارف نے اس سفر نامے کے مخطوطے کا عکس برٹش لائبریری سے حاصل کیا۔ اس طرح اس سفر نامے کا اردو ترجمہ کرنا ممکن ہو سکا۔[۹]

روس ایک بین براعظمی ملک ہے جس کے کل رقبے کا ۲۳ فیصد حصہ براعظم یورپ میں پایا جاتا ہے اور یہ یورپ کے تقریباً ۴۰ فیصد حصہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس لیے رقبے کے لحاظ سے روس نہ صرف یورپ کا بلکہ دنیا کا بھی سب سے بڑا ملک ہے۔[۱۰] یہ سفر نامہ اٹھارہویں صدی میں تحریر کیا گیا اور اس میں روس کے کچھ مقامات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے متعلق یہ قیاس بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ دیارِ فرنگ کے متعلق تحریر کیا جانے والا پہلا سفر نامہ

ہے۔ اب جبکہ اس سفر نامے کا اردو متن بھی دستیاب ہے لہٰذا اس سفر نامے کی اہمیت کے پیش نظر اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کے مطالعے میں اس سفر نامے کے روس کی سیاحت والے حصہ کے متعلق ایک مختصر تحقیقی مقالہ بھی پیش کیا جائے گا۔

۲۔ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار

جنوب ایشیائی خطے برصغیر سے تعلق رکھنے والے سفر نامہ نگاروں اور ان کے تحریر کردہ سفر ناموں کو دراصل زمانے کی گردش نے عہد ماضی کی بھول بھلیوں میں کہیں گم کر دیا تھا۔ مگر اٹھارہویں صدی اور اس میں تحریر کیے گئے ادب کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر دور جدید میں محققین نے دوسری ادبی اصناف کے ساتھ ساتھ اٹھارہویں صدی میں یورپ سے متعلق برصغیر کے باشندوں کے تحریر کیے گئے سفر ناموں کی تلاش اور ان کے تحقیقی مطالعہ کو بھی اہمیت دی۔ اس لیے کہ یہ سفر نامے ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے ابتدائی دور میں تحریر کیے گئے تھے اور ہندوستانی باشندوں کی طرف سے یورپ کی تہذیب و تمدن کے متعلق فراہم کردہ معلومات کے ابتدائی ماخذات بھی تھے۔ لیکن اگر ہم ان سفر ناموں کو تحریر کرنے والے ہندوستانی باشندوں کی ذاتی معلومات یا سوانحی حالات کے متعلق جاننا چاہیں تو اس حوالے سے ہمیں خاصی مایوس کن صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہمیں اٹھارہویں صدی کے منتخب کردہ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں محمد عبداللہ، منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کے متعلق جو مختصر سی معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ دراصل سفر ناموں میں ان مصنفین کی خود کی فراہم کردہ ہیں۔ میر محمد حسین کے علمی وادبی ذوق کے متعلق اگرچہ اکا دکا حوالے ہمیں قدیم ادبی و تاریخی کتب میں مل جاتے ہیں مگر بقیہ تینوں سفر نامہ نگاروں کے متعلق ہمیں دیگر ذرائع سے کوئی اضافی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے یہ سفر نامہ نگار دراصل تاریخ کی فراموش کردہ شخصیات ہیں اور اس فراموشی میں ان کے خاندانی پس منظر یا معاشرتی مقام و مرتبے کو دخل ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہمیں اٹھارہویں صدی کے ان ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کی ذاتی زندگی، معاشرتی مقام و مرتبے اور ان کے سفر یورپ کے اسباب و محرکات کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکیں ہیں انہیں یہاں سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے باری باری بیان کیا جا رہا ہے۔

ا۔ محمد عبداللہ

محمد عبداللہ، اس کے خاندان اور ذاتی حالات جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں اور نہ ہی مصنف کا سفر نامہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار نے نہ تو اپنی کوئی ذاتی معلومات اس سفر نامہ میں فراہم کیں اور نہ ہی اپنے سفر کے آغاز یا اختتام کے متعلق کچھ درج کیا۔ یہ معلومات بس مہینہ اور تاریخ تک محدود ہیں۔ سفر نامہ کے متن

میں البتہ بعض ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن کی بناء پر سابقہ محققین (چارلس ریو اور ڈاکٹر نجیبہ عارف) نے سفر نامہ نگار کے روس کی طرف سفر کرنے کے سنہ کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق ریو یہ قیاس ظاہر کرتا ہے کہ محمد عبداللہ نے یہ سفر تاتاری تاجروں کے کسی قافلہ کے ہمراہ کیا ہوگا۔ محمد عبداللہ نے سفر نامے میں نجیب خان کے لشکر کا ذکر کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ سفر نامہ نجیب الدولہ کی وفات سے قبل، شاہ عالم (۱۷۲۷ء۔۱۸۰۶ء) کے ابتدائی دور میں تحریر کیا گیا ہو گا۔ ریو یہ بھی خیال ظاہر کرتا ہے کہ نجیب الدولہ کی وفات ۱۱۸۵ ہجری میں ہوئی۔ عیسوی اعتبار سے یہ سن (۱۷۷۱ء یا ۱۷۷۲ء) قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق اگر ریو کا یہ اندازہ درست ہے تو محمد عبداللہ نے یہ سفر ۱۷۴۰ء سے ۱۷۷۰ء کے درمیان کسی عرصہ میں کیا ہوگا۔[11]

سفر نامے میں موجود ان شواہد کی بناء پر سابقہ محققین کی اس بات سے ضرور اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ محمد عبداللہ نے یہ سفر ۱۷۷۱ء سے پہلے ۱۷۴۰ء سے ۱۷۷۰ء کے درمیان کیا ہوگا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سفر نامہ اس دوران تحریر بھی کیا گیا ہو جیسے کہ ہم جانتے ہیں کے منشی اعتصام الدین نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک سفر یورپ اختیار ضرور کیا مگر ان کے سفر نامہ کی باقاعدہ تصنیف و تالیف کا کام ۱۷۸۵ء میں عمل میں آیا۔[12]

محمد عبداللہ کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف نے یہ قیاس بھی ظاہر کیا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی اہلکار یا جاسوس تھا جو کسی خاص مہم کے پیش نظر روس و چین کی طرف بھیجا گیا تھا۔[13] یہ قیاس کسی حد تک درست تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ سفر نامے کے متن سے واقع ہی بعض ایسے اشارات ملتے ہیں جس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے مثلاً خود محمد عبداللہ کے مطابق جب وہ سفر سے واپس بنگال پہنچا تو اسے صاحبان کی نظر عنایت حاصل ہوئی۔[14] مگر وہ ان صاحبان کے نام یا مقام و عہدے کے متعلق کسی قسم کی کوئی معلومات فراہم نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ چین کے سفر کے بیان میں بھی وہ غیلان کے حاکم کے حسن سلوک کے حوالے سے یہ تاویل پیش کرتا ہے کہ اس نے ایسا اس لیے کیا کیونکہ اُسے بادشاہ چین کی طرف سے حکم تھا کہ جو کوئی سرکاری افسر ولایت سے آئے اس کا اچھا استقبال کرے اور بادشاہ سے ملوائے۔[15]

جیسا کہ ہماری معلومات میں ہے کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر و رسوخ کافی بڑھ چکا تھا اور کمپنی کی حیثیت کافی مستحکم ہو چکی تھی اور اس نے مقامی باشندوں کو بطور ملازم مختلف مقاصد اور امور کی انجام دہی کے لیے اپنی ماتحتی میں لے رکھا تھا تو اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ محمد عبداللہ بھی کمپنی کا کوئی ملازم ہو گا مگر سفر نامہ نگار نے چونکہ اپنے ذاتی مقام و مرتبے کو صیغہ راز میں رکھا ہے اس لیے اس کے متعلق کوئی بھی بات

یقینی یا حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی۔

ب۔ منشی اسماعیل

جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں انگلستان کے متعلق اپنی سفری روداد کو قلمبند کرنے والی سب سے پہلی شخصیت منشی اسماعیل ہیں۔انہوں نے ۱۷۷۳ء میں فارسی زبان میں اپنا سفر نامہ تاریخ جدید کے عنوان سے تحریر کیا۔ منشی اسماعیل کا سفر نامہ کسی ہندوستانی مسلمان کی طرف سے انگلستان کے متعلق تحریر کیا جانے والا پہلا سفر نامہ ہے۔اس سے پہلے اعتصام الدین (۱۷۳۰ء۔۱۸۰۰ء) کے سفر نامہ شگرف نامۂ ولایت (۱۷۸۵ء) کو انگلستان سے متعلق لکھا تحریر کیا جانے والا پہلا سفر نامہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔حالیہ تحقیق کے مطابق اعتصام الدین نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک انگلستان کا سفر ضرور اختیار کیا مگر منشی اعتصام الدین کے سفر نامے کی باقاعدہ تصنیف و تالیف کا عمل ۱۷۸۵ء میں عمل میں آیا اور ۱۸۲۷ء میں یہ سفر نامہ پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ جبکہ منشی اسماعیل کے سفر نامہ تاریخ جدید کی تالیف کا عمل ۱۷۷۳ء میں عمل میں آیا۔[۱۶]

منشی اسماعیل کے سفر نامے کا قلمی نسخہ دو سو سال تک محققین کی نظروں سے اوجھل رہا۔[۱۷] برطانوی مستشرق سائمن ڈگبی (۱۹۳۲ء۔۲۰۱۰ء) کے خیال میں منشی نے اپنی یہ تصنیف مسٹر جیمز گرانٹ[۱۸] کی خدمت میں پیش کی تھی جو کسی طرح ۱۸۵۶ء میں سر ٹامس فلپس کے ذخیرہ کتب میں شامل ہوگئی۔ ۱۹۶۸ء میں سائمن ڈگبی نے سر ٹامس فلپس کے ذخیرے کا کچھ حصہ خریدا تو یہ نادر قلمی نسخہ بھی ان کے ہاتھ آیا اور انہوں نے اس سفر نامے پر مقالہ لکھ کر پہلی بار اہل علم کو اس سے متعارف کروایا۔[۱۹]

ہمارے پاس منشی اسماعیل کے ابتدائی حالات زندگی اور ذاتی معلومات جاننے کا دیگر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔اس لیے ان کے متعلق ہمارے پاس صرف وہی معلومات پہنچ سکیں ہیں جو خود انہوں نے اپنے سفر نامہ میں اپنے متعلق فراہم کیں ہیں ان معلومات کے مطابق منشی اسماعیل کا تعلق بنگال کے ایک قصبے گنج کھلنا سے تھا وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک عزت دار شخص تھے۔ان کے زیر کفالت ایک ضعیف باپ، دو چھوٹے بھائی اور ایک بیٹا تھا جبکہ ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔[۲۰]

منشی اسماعیل کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ منشی گری میں ماہر تھے اور تصنیف و تالیف کے شعبے سے وابستہ تھے۔انہوں نے ایک کتاب مفتاح الاصول بھی تالیف کرر کھی تھی جس میں منشی گری اور اس کے قانون کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں تھیں اور منشی اسماعیل کے دعوی کے مطابق اس کتاب سے بہت سے لوگوں نے

استفادہ کیا اور یہ لوگوں میں بہت مقبول بھی ہوئی۔ تاہم ہمیں منشی اسماعیل کی ایسی کسی کتاب کے متعلق کسی بھی ذرائع سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

منشی اسماعیل نے اپنی ملازمت کے متعلق سفر نامے میں جو معلومات فراہم کیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۶۸ء میں ان کے پاس کوئی باقاعدہ ذریعۂ روزگار نہ تھا اور وہ روزگار کی تلاش میں اپنی تحریریں لے کر پہلے تو کلکتہ کے اہل علم و فضل کے حضور پیش ہوئے مگر کسی نے بھی ان کی تحریروں کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ منشی اسماعیل نے سفر نامے میں اپنی اور اپنی تحریروں کے حوالے سے اہل کلکتہ کی بے اعتنائی کا شکوہ بہت افسردہ لہجے میں کیا۔ کلکتہ سے مایوس ہو کر روزگار کی تلاش میں منشی اسماعیل نے پہلے کچھ عرصہ مرشد آباد میں ملازمت کی پھر وہاں سے جہانگیر نگر چلے گئے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا مگر وہاں بھی شاید انہیں اچھی ملازمت نہ مل سکی تھی اسی لیے انہوں نے دوبارہ مرشد آباد کا رخ کیا۔[۲۱] انہی حالات میں ۱۷۶۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر تسلط علاقوں (بنگال) میں ایک بدترین قحط پیدا ہوا جس نے لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا۔ منشی اسماعیل اور ان کا گھرانہ بھی اس قحط کے عتاب کا شکار ہوئے۔ اس زمانے میں چونکہ ان کے پاس کوئی معقول ذریعۂ روزگار بھی نہ تھا اس لیے انہوں نے اپنے گھر کی قیمتی اشیاء جیسے سونے، چاندی کے زیورات، قیمتی برتن اور قالین وغیرہ بیچ کر اپنی اور اپنے خاندان والوں کی ضروریات کو پورا کیا مگر یہ مال و اسباب زیادہ دیر تک منشی اسماعیل اور ان کے گھر والوں کی ضروریات پوری نہ کر سکتے تھے۔ چونکہ قحط کے زمانے میں منشی اسماعیل کو انگریزوں کی نوکر پروری کے بہت سے قصے سننے کو ملے تھے اس لئے ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ انہیں بھی انگریز صاحبان کے ہاں ملازمت مل جائے تا کہ انہیں فکر و فاقہ سے نجات ملے۔ آخر کار انگریز افسران کی توجہ اور ملازمت کے حصول کے لیے منشی اسماعیل کو موتی جھیل کا رخ کرنا پڑا۔ منشی اسماعیل کی فراہم کردہ معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہاں کے مقامی تعلیم یافتہ افراد انگریز سرکار کی ملازمت کے حصول کے لئے وہاں جمع ہوا کرتے تھے اور وہاں مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن جن کے ذمہ صوبہ بنگال کے نظامت کے معاملات کے دستاویزات کے ترجمہ کی ذمہ داری تھی کا دفتر بھی تھا، منشی اسماعیل کو آخر کار ایک دن مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن کو ان کے منشی کی علالت کے باعث اپنی قابلیت دکھانے کا موقع میسر آیا اور منشی اسماعیل اپنی قابلیت سے مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ منشی اسماعیل کے مطابق اس واقعہ کے بعد سے مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن اکثر لکھنے پڑھنے کے معاملات میں ان کی خدمات حاصل کرتے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منشی اسماعیل کو مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن کے ہاں بھی کوئی مستقل یا معقول ملازمت حاصل نہ ہو سکی تھی۔[۲۲]

منشی اسماعیل کے انگلستان جانے کا سبب کچھ یوں ہوا کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک اہلکار مسٹر

کلاڈرسل [۴۳] کو جو بنگال کی کونسل کے ممبر تھے، اپنے لیے ایک ایسے قابل منشی کی ضرورت پڑی جسے وہ اپنے ساتھ انگلستان لے جا سکیں تو مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن نے اس خدمت کے لیے منشی اسماعیل کا نام پیش کیا۔ منشی اسماعیل نے بہت پس و پیش کے بعد مسٹر کلاڈرسل کے ہمراہ انگلستان جانے کی حامی بھری کیونکہ وہ اپنے بوڑھے باپ اور بچے کو تنہا چھوڑ کر انگلستان نہیں جانا چاہتے تھے مگر ان کے مالی حالات چونکہ کچھ اچھے نہ تھے اس لیے مجبوراً انہیں یہ پیش کش قبول کرنا پڑی۔ [۴۴]

مسٹر کلاڈرسل کے ہمراہ منشی اسماعیل ۳ دسمبر ۱۷۷۱ء کو کلکتہ کے ساحل سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز 'مورس' [۴۵] میں سوار ہوئے۔ جہاز پندرہ فروری کو کیپ ٹاؤن اور ۳۱ مارچ کو 'سینٹ ہیلینا' کے مقام پر پہنچا۔ جہاں کسی ناخوشگوار واقعے کے باعث مسٹر کلاڈرسل اور منشی اسماعیل نے باقی کا سفر چین کی بندرگاہ سے آنے والے ایک مال بردار جہاز سے طے کیا۔ [۴۶] ۳ جون ۱۷۷۲ء کو منشی اسماعیل انگلستان پہنچے۔ [۴۷] انگلستان میں ان کا زیادہ قیام دو شہروں 'لندن' اور 'باتھ' میں رہا۔ اسی سال بیس مارچ ۱۷۷۳ء کو انہوں نے پورٹسمتھ کی بندرگاہ سے 'یورپا' نامی جہاز جس کے کپتان کا نام 'مسٹر پیلی' تھا واپسی کے لیے سفر اختیار کیا۔ [۴۸] واپسی پر جزیرہ پرتگال پر کچھ عرصہ قیام کیا۔ منشی صاحب جس جہاز پر سوار تھے وہ چونکہ بمبئی جارہا تھا اس لیے منشی اسماعیل جوہانہ جزیرہ پر پہنچ کر اس جہاز سے اتر گئے۔ اس سفر کے دوران منشی صاحب کی ملاقات مسٹر جیمز گرانٹ سے ہوئی۔ انہی کے ہمراہ انہوں نے تین ہفتے تک جوہانہ جزیرے پر قیام کیا۔ بعد ازاں وہ جیمز گرانٹ کے ہمراہ ایک فرانسیسی جہاز فرنکیس پر سوار ہو کر سن ۱۷۷۳ء میں اسی دن اور مہینے کو کلکتہ پہنچے جس دن اور مہینے کو وہ کلکتہ سے روانہ ہوئے تھے۔ [۴۹]

منشی اسماعیل کے سفر نامے کا کاتب غلام حسن چونکہ بندر ہوگلی کا رہنے والا تھا۔ اس لیے قیاس غالب یہی ہے کہ منشی اسماعیل نے اپنے قصبہ واپس جانے سے پہلے یہ سفر نامہ مکمل کر کے کاتب کے حوالے کر دیا ہوگا۔ سائمن ڈگبی کے خیال میں منشی اسماعیل کتابت والا مسودہ شاید مسٹر جیمز گرانٹ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ جیسے کے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں

> The transcription was done in a small neat nasta'liq hand by one Ghulam Hasan, Probably a professional copyist, who describes himself as resident (Sakin) of the port of hooghly (bandar-e- Hugli). As we have suggested, it is likely that this copy was made for james Grant. For this Munshi Ismail may have left his original

hologrph behind for copying before he went to his reunion with his family. We have no means of knowing whether he ever came back to collect it.[۳۰]

منشی اسماعیل کا یہ سفر نامہ ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی دور میں ان کے بے روزگاری کے مسائل، قحط بنگال کے حالات، بحری سفر کے تجربات، لندن اور باتھ کے قیام کے دوران وہاں کے دلچسپ اور معلوماتی مشاہدات پر مبنی ہے۔

ج۔ مرزا شیخ اعتصام الدین

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام الدین نے سب سے پہلے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ اعتصام الدین کا تعلق بنگال کے قصبہ باجنور، ضلع ندیہ سے تھا۔ وہ شیخ تاج الدین کے باعزت اور پڑھے لکھے گھرانے کے ایک فرد تھے۔[۳۱] روایت کے مطابق مقامی مکتب و مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مرشد آباد چلے گئے ۔ وہاں جعفر علی خاں کی نظامت کے زمانے میں منشی سمیع اللہ اور مرزا قاسم جو میر جعفر کی سرکار میں بالترتیب منشی اور میر منشی رہے تھے کی صحبت میں منشی گری کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ بنگال میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر ورسوخ اور نظامت کے معاملات میں بڑھتی ہوئی گرفت نے منشی اعتصام الدین کو انگریزوں کے قریب کر دیا۔ منشی اعتصام الدین نے قاسم علی خاں کی عملداری کے زمانے میں میجر یارک کے ہاں ملازمت اختیار کر لی اور یارک کے ساتھ اسد زمان خان راجہ بیر بھوم کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد منشی ملازمت حاصل کرنے کی غرض سے یارک کے ہمراہ عظیم آباد اور کلکتہ تک گئے مگر انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی کیونکہ کلکتہ میں پہلے سے آٹھ منشی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔

اسی اثنا میں مسٹر یارک ولایت چلے گئے اور جانے سے پہلے ملازمت کے حصول کے لیے منشی اعتصام الدین کو ایک سفارشی خط لکھ کر دیا اور انہیں میجر آدم کے پاس عظیم آباد جانے کی تاکید بھی کی۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق انہیں وہاں کسی مخالف منشی بنگش کی سازش کے باعث ملازمت نہ مل سکی۔ آخر کار جیکلہ جلیسر کے بخشی مسٹر اسٹرس کے ہاں ملازمت مل گئی اور منشی صاحب وہاں دو سال تک کام کرتے رہے۔ مسٹر اسٹرس کے ساتھ اعتصام کے تعلقات بہت خوشگوار رہے مگر اسی دوران مسٹر اسٹرس کی وفات ہوگئی۔ جس کی بناء پر منشی اعتصام الدین کو وہاں سے میدنی پور جانا پڑا اور وہ پرگنہ قطب پور میں بطور تحصیلدار مقرر ہوئے۔ اس زمانہ میں انگریزوں اور شجاع الدولہ کے درمیان 'بکسر' کی جنگ جاری تھی۔ ۱۷۶۴ء میں جب شجاع الدولہ کو انگریزوں سے شکست ہوئی تو اعتصام الدین

تحصیلدار کے عہدے سے استعفیٰ دے کر اودھ چلے گئے اور وہاں مسٹر کارناک کے یہاں منشی مقرر ہوئے اور ان کے ساتھ چنار گڑھ اور الٰہ آباد کے مقامات پر قیام کیا۔[۳۲] منشی اعتصام الدین اس وقت جنرل کارناک کے میر منشی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے جب اس کی زیر کمان انگریزی افواج نے کوڑا جہاں آباد میں شجاع الدولہ اور مرہٹوں کی متفقہ فوج کو شکست دی تھی۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق وہ جنگ بکسر اور معاہدہ الٰہ آباد کے نہ صرف چشم دید گواہ تھے بلکہ مسٹر ولسٹرٹ کی ایماء پر انہوں نے ایک اور منشی 'محمد معز' کے ہمراہ انگریزوں اور شجاع الدولہ کے درمیان صلح وصفائی کے بعد جو معاہدے طے پائے تھے ان کے مسودے بھی تیار کیے تھے۔ اسی طرح ۱۷۷۵ء میں مرہٹہ سرداروں سے صلح وصفائی کے لیے منشی اعتصام الدین کرنل جان ہیٹن بہادر کے ہمراہ پونا ستارہ گئے۔ کرنل کی طرف سے پیشوا کے دربار میں سوالات وجوابات کی خدمت سرانجام دینے کے علاوہ پیشوا پینڈت پر دھان، سکھارام اور نانافرنویس سے لکھاپڑھی کا کام بھی منشی اعتصام الدین نے انجام دیا۔[۳۳]

اعتصام الدین کے سفر یورپ اختیار کرنے کا سبب کچھ یوں ہوا کہ جنگ بکسر میں شکست کے بعد معاہدہ الٰہ آباد کے طے پاجانے اور بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے حقوق کمپنی کو سونپنے کے بعد بادشاہ 'شاہ عالم' نے لارڈ کلائیو اور جنرل کارناک سے اپنے دشمنوں سے جان کے خطرے کے پیش نظر دہلی تک بحفاظت پہنچنے کے لیے انگریزی فوج کی مدد کی درخواست کی۔ کلائیو نے بغیر بادشاہ انگلستان کی اجازت کے فوج کی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ شاہ عالم نے اپنے دو وزراء منیر الدولہ اور راجہ شتاب رائے کی مشاورت سے بادشاہ انگلستان کے نام انگریزی فوج کی مدد کے حصول اور دہلی جاکر ہندوستان کی وسیع وعریض سلطنت کے انتظام کو سنبھالنے کی خاطر خط تحریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طے کر کے نواب منیر الدولہ اور راجہ شتاب رائے لارڈ کلائیو کے ہمراہ کلکتہ گئے اور وہاں دوسرے ممبران کونسل کو اطلاع دیئے بغیر بادشاہ شاہ عالم کی طرف سے انگلستان کے بادشاہ کے نام خط تحریر کیا گیا اور اس پر شاہی مہر لگا کر کپتان سوئنٹین[۳۴] کو بطور ایلچی مقرر کر کے خط اور ایک لاکھ روپیہ بمعہ تحائف ان کے حوالے کیا گیا۔ ان کے ساتھ اعتصام الدین کو بطور معاون اور ماہر فارسی دان منشی اس مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا گیا۔ منشی اعتصام الدین کے پاس چونکہ کوئی مستقل و معقول ذریعۂ روزگار نہ تھا جب کہ منیر الدولہ نے منشی اعتصام الدین کو ولایت کے سفر کے اخراجات کے لیے معقول رقم کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لیے شاہی انعامات ونوازشات عطا کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا اس لیے منشی اعتصام الدین نے منیر الدولہ کی پیش کش کو قبول کر لیا۔[۳۵]

منشی اعتصام الدین اس مقصد کی انجام دہی کے لیے کپتان سوئنٹین کے ہمراہ موسیٰ موردیل نامی جہاز سے ۱۷۶۷ء کو کلکتہ سے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے۔ منشی اعتصام الدین ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ اہلکار مسٹر کلائیو کی

بادشاہ شاہ عالم سے غداری اور مکاری کے باعث شاہ عالم کا خط بادشاہ انگلستان کو نہ پیش کر سکے کیونکہ وہ خط اور تحائف جو شاہ عالم نے انگلینڈ کے بادشاہ کے لیے بھجوائے تھے کلائیو نے دھوکے سے اپنے پاس یہ کہہ کر رکھ لیے کہ جب وہ آئندہ سال انگلستان جائے گا تو خود بادشاہ کو پہنچا دے گا۔ منشی صاحب کو اس بات کا پتہ سفر شروع ہو جانے کے بعد کپتان سوئٹین کی زبانی چلا۔ بہر حال جب کلائیو انگلستان پہنچا تو اس نے بادشاہ کا خط شاہ انگلستان تک نہ پہنچایا اور بادشاہ کے تحائف کو اپنی طرف سے ملکہ انگلستان کے حضور پیش کر کے شاہی عنایات و نوازشات کا مستحق ٹھہرا۔ اس طرح منشی اعتصام الدین اپنے مقصد میں ناکام ہو کر ۱۷۶۹ء میں کراچی، جہاز میں سوار ہو کر وطن واپس تشریف لے آئے۔[۳۶]

منشی اعتصام الدین نے اپنے اعزا و احباب کی فرمائش پر اپنے یورپ کے سفر سے متعلق سفر نامہ شگرف نامہ ولایت کے عنوان سے تحریر کیا۔ اس سفر نامہ میں اٹھارہویں صدی کے انگلستان اور یورپ کے بعض دوسرے ممالک کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور دیگر دلچسپ موضوعات پر معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگار نے یورپی بحری سفر کے مشاہدات اور واقعات کو بھی دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سفر نامہ ہندوستان کی سیاسی اور ابتدائی نو آبادیاتی تاریخ کے چند ایک اہم حقائق کا مستند ماخذ بھی تصور کیا جاتا ہے۔

د۔ میر محمد حسین لندنی

میر محمد حسین عبد العظیم حسنی اصفہانی (۱۷۹۰ء) اٹھارہویں صدی کے ایک اور مشہور ہندوستانی سفر نامہ نگار ہیں۔ میر محمد حسین کے آباؤ اجداد اصفہان کے رہنے والے تھے۔[۳۷] اٹھارہویں صدی کے آغاز میں میر صاحب کے والد ایران سے ہندوستان آئے اور اودھ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔[۳۸]

حکیم سید محمود احمد برکاتی نے حکیم اطہر علی خاں دہلوی کے حوالے سے میر محمد حسین کو علوم مفیدہ جبکہ حسین قلی خان عظیم آبادی کے حوالے سے ماہر علم طباعت، الہیات اور ریاضی لکھا ہے۔ میر محمد حسین کو شعر و شاعری میں بھی دلچسپی تھی۔[۳۹] مصحفی نے انہیں بر عظیم کے فارسی گو شعرا کی فہرست میں شامل کیا ہے۔[۴۰]

میر محمد حسین کی ملازمت کے متعلق بات کریں تو پہلے وہ لکھنو اور پھر مرشد آباد کے مقامی درباروں سے منسلک رہے مگر جب مرشد آباد، حیدر آباد اور اودھ میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھا تو وہ نوکری کی تلاش میں کلکتہ چلے گئے۔[۴۱] مغربی سائنسی علوم میں دلچسپی اور کمپنی میں کسی موزوں عہدے کی خواہش میر محمد حسین کے سفر یورپ اختیار کرنے کا سبب بنی۔ چنانچہ ۱۷۷۵ء میں وہ کمپنی کے ایک عہدے دار مسٹر ایلیٹ کے ہمراہ انگلستان روانہ ہوئے اور دو سال بعد ۱۷۷۸ء میں یورپ کے تین ممالک انگلستان، فرانس اور پرتگال کا سفر کر کے واپسی پر مصر سے ہوتے ہوئے وطن واپس لوٹے۔[۴۲]

انگلستان قیام کے دوران انہوں نے انگریزی زبان میں کماحقہ مہارت حاصل کی اور ایک انگریزی کتاب کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ علم فلکیات اور علم تشریح الاعضاء کے حوالے سے جدید مغربی نظریات سے استفادہ بھی حاصل کیا۔[۴۳]

انہوں نے اپنے ایک دوست مولوی عبدالقادر کی فرمائش پر یورپ کے مشاہدات خاص کر علم ہیئت وفلکیات کے نظریات پر مبنی ایک رسالہ رسالۂ احوال ملک فرنگ و ہندوستان تحریر کیا۔[۴۴] پہلے انھوں نے یہ سفر نامہ عربی زبان میں جبکہ بعدازاں اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر اور ہر خاص وعام کے پڑھنے کی سہولت کی خاطر فارسی زبان میں تحریر کیا۔[۴۵]

حکیم سید محمود احمد برکاتی نے میر محمد حسین کے اس سفر نامہ کے علاوہ جن رسائل اور تالیفات کا ذکر کیا ہے ان میں رسالہ در علم فزک، رسالۂ قلبیہ، رسالۂ قوانین فارسی لندنی، دیوان اور ساقی نامہ شامل ہیں۔[۴۶]

میر صاحب کی زندگی کے آخری ایام تکلیف میں گزرے وہ امراض خبیثہ میں مبتلا ہونے کے باعث چلنے پھرنے سے قاصر ہوگئے۔ اسی حالت میں ایک مدت تک کلکتہ میں مقیم رہے پھر وہاں سے لکھنو کے لیے روانہ ہوئے تھے کہ راستے میں بنارس میں ہی وفات پاگئے۔ ان کا سال وفات ۱۲۰۵ھ تقریباً ۱۷۹۰ء۔۱۷۹۱ء ہے۔[۴۷]

یوں اگر ہم مجموعی طور پر اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے ابتدائی دور میں یورپ کا سفر کرنے والے ان ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کے حالات زندگی اور ان کے سفر یورپ کے اسباب و محرکات کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے تقریباً ان تمام سفر نامہ نگاروں کو نوآبادیات کے اس ابتدائی دور میں مالی مشکلات اور بے روزگاری کا سامنا تھا۔ سفر نامہ نگاروں کے حالات زندگی کا عمیق مطالعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق مل جانے کے بعد ان علاقوں میں کمپنی کا اثر رسوخ کافی بڑھ گیا تھا اور مقامی ہنر منداور تعلیم یافتہ افراد خود کو بھوک اور بے روزگاری سے بچانے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرنے کے متمنی تھے۔ ہمارے یہ تمام سفر نامہ نگار بھی اپنی معاشی بدحالی اور مالی مشکلات کے پیش نظر کمپنی یا کمپنی کے اہلکاروں کی ماتحتی میں زیادہ تر معمولی اور عارضی نوعیت کی ملازمتیں انجام دے رہے تھے۔ ان چاروں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے سفر یورپ اختیار کرنے کی وجوہات کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں در حقیقت ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی دور میں سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اسباب و محرکات کے پیش نظر ہی سفر یورپ اختیار کیا تھا۔ مثلاً محمد عبداللہ کے سفر نامے میں موجود معلومات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں

نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی کسی خاص مہم یا جاسوسی کے پیش نظر روس وچین کا سفر اختیار کیا تھا۔ منشی اسماعیل نے نوآبادیات کے ابتدائی دور میں بھوک اور بے روزگاری سے بچنے کے لیے انتہائی مجبوری کے عالم میں سفر یورپ اختیار کیا۔ منشی اعتصام الدین نے بظاہر ایک شاہی مہم کے پیش نظر سفر یورپ اختیار کیا تھا تاکہ وہ بادشاہ شاہ عالم کے دہلی تک بحفاظت پہنچنے کے لیے بادشاہ انگلستان 'جارج سوم' سے انگریزی فوج کی مدد حاصل کرنے کا اجازت نامہ لے آئیں مگر در حقیقت وہ بھی منشی اسماعیل کی طرح معاشی مشکلات کا شکار تھے اور اس مہم کو سر کرنے کی صورت میں چونکہ انہیں شاہی انعامات ونوازشات ملنے کا امکان تھا اسی لیے انہوں نے سفر یورپ اختیار کیا۔ میر محمد حسین نے اگرچہ ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں ہندوستانی اشرافیہ میں یورپی سائنسی علوم، نت نئی ایجادات وجدید سائنسی نظریات کے چرچے اور اپنے ذوق حصول علم کے پیش نظر سفر یورپ اختیار کیا۔ مگر انگلستان جا کر انگریزی زبان کی تحصیل اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے پیچھے دراصل کمپنی میں کوئی موزوں عہدہ حاصل کرنے کی خواہش کارفرما ہونے کا قوی امکان بھی موجود ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ان چاروں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے اپنی خواہش یا سیاحت کے پیش نظر سفر یورپ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے ان کے کچھ خاص اغراض و مقاصد اور مالی ومعاشی مسائل کارفرما تھے۔

۳۔ سفر نامہ روس وچین تنقیدی جائزہ

یہ سفر نامہ بہت مختصر ہے اور سفر نامہ نگار نے نہ تو اپنا کوئی تعارف و تفصیل فراہم کی ہے اور نہ ہی اپنے سفر کے مقاصد یا روس وچین کی تہذیب و تمدن کے متعلق کسی قسم کی کوئی خاص معلومات فراہم کیں ہیں۔ سفر نامہ کے آغاز میں سفر نامہ نگار نے بس یہ معلومات فراہم کیں ہیں کہ اس نے روس وچین کی طرف سفر کا آغاز ماہ محرم الحرام میں نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد ایک قافلے کے ہمراہ روس کی جانب شروع کیا۔ مگر یہ قافلہ کونسا تھا اور سفر نامہ نگار نے ان کے ہمراہ روس کا سفر کیوں کیا؟ اس بارے میں وہ کچھ نہیں بتاتا:

> بندہ محمد عبداللہ ماہ محرم الحرام میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد خیر وعافیت سے قافلے کے ہمراہ اورس (روس) کے سفر کے بارے اپنے مقامات کی روداد بیان کرتا ہے۔ پہلے دن بخارا سے نکل کر دریائے جیحوں کے کنارے، جو کہ تقریباً تین کروہ کے فاصلے پر ہے، قیام کیا۔ صبح کے وقت وہاں سے کوچ کر کے نماز عصر کے وقت سید عطا میں داخل ہوا۔ تین دن وہاں قیام ہوا۔ بدھ کے دن وہاں سے روانہ ہو کر رات کے دو پہر گزرنے پر شورا یک پہنچا وہاں رات بسر کی اور جمعرات کی صبح نماز فجر کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر نماز مغرب کے وقت فراغت پہنچ گیا۔[۹۸]

سفر نامہ نگار نے روس کے سفر میں آنے والے مقامات کا بس اسی طرح نام اور وہاں قیام کی مدت کا ذکر کیا ہے۔ وہ نہ تو راستے میں آنے والے مقامات کی منظر کشی کر تا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی وہاں رہنے والے لوگوں کے لباس ،زبان یا تہذیب و تمدن کے متعلق کسی قسم کی کوئی معلومات فراہم کرتا ہے۔ وہ اگر کسی مقام کی منظر کشی کرتا بھی ہے تو پس اتنا کہہ کر رہ جاتا ہے کہ وہ وہاں سر سبز و شاداب سبزہ زاروں اور کھیتوں کا نظارہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

> وہاں (دریائے قر غلی) سے کوچ کر کے آٹھ منزل کی مسافت کے دوران سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ُ سکی پستہ سے روانہ ہو کر بارہ منزل کے سفر کے دوران سبزہ زاروں اور سر سبز و شاداب کھتیوں کا نظارہ کرتے ہوئے یزنی پہنچا۔ [۴۹]

محمد عبداللہ نے سفر نامہ میں بعض باتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جس سے قاری متن کی سچائی کے حوالے سے شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ روس کے شہر مسکاؤ (ماسکو) کو بھی روس کا پایہ تخت قرار دیتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ فتی بر (پیٹرز برگ) روس کا پایہ تخت ہے جبکہ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ روس کے بادشاہ اور اس کی بیٹی سے اس کی ملاقات ' آق پاچھا' شہر میں ہوئی۔ بادشاہ اس سے بہت شفقت اور مہربانی سے ملا اور اس کی بدولت قافلے والوں پر بھی نظر کرم کی۔

> وہاں سے رخت سفر باندھ کر پندرہ منزل کی مسافت کے دوران سر سبز کھیتوں کا نظارہ کرتے ہوئے مسکاؤ (ماسکو) شہر پہنچا جو کہ اور س کے بادشاہ کا پایہ تخت ہے وہاں دو ماہ قیام کرنے کے بعد آق پاچھا پہنچا جہاں بادشاہ اور اس کی بیٹی رہائش پزید ہیں، اور وہاں بارہ سردار اور وزیر فرائض سر انجام دیتے ہیں۔ کہاں میں کہاں میری بساط مجھے بھی خدمت کا موقع میسر آیا۔ بادشاہ سلامت مجھ پر بہت نظر عنایت کرتے اور شفقت کرتے اور بڑی محبت اور مہربانی سے اس غلام کو طلب فرماتے۔ اس غلام کی بدولت اہل قافلہ پر بھی اپنی طرف عنایات کیں اور ان سے کچھ نہ لیا اور بڑی مہربانی اور دلجوئی سے رخصت کیا۔۔۔ میں وہاں سے روانہ ہو کر پندرہ منزل کی مسافت کے دوران سبزہ زار اور سر سبز کھیتوں کا نظارہ کرتا ہوا فتی بر (پیٹرز برگ) شہر پہنچا جہاں بادشاہ اور اس کا پایہ تخت ہے۔ [۵۰]

دراصل روس کے حکمران پیٹرز (دی گریٹ) نے ۱۷۱۲ء میں خاص مقاصد کے پیش نظر روس کا دالحکومت ماسکو، سے سینٹ پیٹرز برگ منتقل کر دیا تھا اور ۱۹۱۸ء تک سینٹ پیٹرز برگ ہی روس کا پایہ تخت رہا۔[۵۱] درمیان میں صرف چند سالوں کے لیے یعنی ۱۷۲۸ء سے ۱۷۳۲ء تک ماسکو کو دوبارہ روس کا پایہ تخت بنادیا گیا تھا۔ [۵۲]

ڈاکٹر نجیبہ عارف کے مطابق سفر نامے کے دیگر شواہد سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ محمد عبداللہ نے ۱۷۲۸ء سے ۱۷۳۲ء کے درمیان (جب ماسکو) روس کا پایہ تخت تھا سفر کیا ہو۔ [۵۳] راقم الحروف کا خیال ہے کہ شاید سفر نامہ نگار اپنے قارئین کو روس کے سابقہ اور حالیہ دونوں دارالحکومتوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا چاہ رہا تھا اس لیے اس نے دونوں کا ذکر کیا مگر وہ اپنی معلومات کو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکا۔

بہر حال سفر نامہ میں روس کی تہذیب و تمدن یا بادشاہ و شہزادی کا حال، محل اور لباس اور اپنی ملاقات کے سبب کے بارے میں سفر نامہ نگار نے کچھ تذکرہ نہیں کیا اور نہ ہی اس بات کی کوئی توجیح پیش کی کہ بادشاہ روس نے اس کی بدولت بقیہ قافلہ والوں پر نظرِ عنایت کیوں کی؟ سفر نامے میں سفر نامہ نگار کے کچھ بیانات سے یہ تو اندازہ ہوتا ہے کے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی اہلکار تھا جیسا کے راقم الحروف نے ان بیانات کا تذکرہ سفر نامہ نگار کے تعارف اور سفر یورپ کے اسباب و محرکات کے بیان میں پہلے بھی کیا۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کوئی اہلکار یا سفر نامہ نگار کے بیان کے مطابق کوئی سرکاری افسر تھا تو اس نے بقیہ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی طرح اپنے سفر روس و چین کے سفر کے اسباب و محرکات اور اغراض و مقاصد کو واضح طور پر بیان کیوں نہیں کیا؟

نجیبہ عارف کے مطابق سفر نامہ نگار ایسا شعوری طور پر کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ وہ شاید ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے کسی خاص مہم یا جاسوسی کی غرض سے روس اور چین کی طرف بھیجا گیا تھا جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ [۵۴] راقم الحروف بھی سابقہ محقق کی اس رائے سے متفق ہے کیوں کے اس کے علاوہ سفر نامہ نگار کے اپنے سفر کے اغراض و مقاصد اور روس و چین میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو واضح طور پر بیان نہ کرنے کی کوئی اور معقول وجہ سجھائی نہیں دیتی۔

روس کے بعد سفر نامہ نگار نے اپنے سفر نامہ میں چین کے سفر کی روداد کو قلمبند کیا ہے جس کا تجزیہ کرنا میری تحقیق کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ لٰہذا ہم براہ راست اٹھارہویں صدی کے بقیہ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں سے یورپ کے حوالے سے ان کی عمومی معلومات کے تجزیہ پیش کرنے کی طرف بڑھیں گے۔

۴۔ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی خطہ یورپ کے متعلق عمومی معلومات

یورپی تاریخ میں عموماً چودھویں سے سترھویں صدی عیسویں کا زمانہ نشاط ثانیہ (Renaissance) کی تحریک کا دور تصور کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کا آغاز اطالیہ سے ہوا مگر اس کے اثرات رفتہ رفتہ پورے یورپ میں پھیل گئے۔ اس تحریک کے ذریعے نہ صرف یورپی معاشرے کو چرچ اور پوپ کی بالادستی سے آزاد کرانے کا بیڑہ اٹھایا گیا بلکہ مسلمانوں کی فتح قسطنطنیہ اور سقوط ہسپانیہ کی بدولت جو قدیم یونانی اور جدید اسلامی فلسفہ اور ع لوم یورپیوں کے ہاتھ لگے ان کی

بدولت یورپ میں مصوری، ادب اور سائنس کے میدان میں نئے رجحانات و نظریات کو متعارف کرایا گیا۔ ان انقلابی اقدامات کی بدولت خطہ یورپ میں فکری و علمی ترقی کا سورج طلوع ہوا۔ جس کی روشنی میں یورپ نے ترقی کا سفر بہت تیزی سے طے کیا۔ نشاط ثانیہ کے ثمرات کی بدولت یورپیوں میں دنیا کے مختلف خطوں کو تلاش کرنے اور ان کے ساتھ تجارتی روابط قائم کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ پندرھویں صدی سے سترھویں صدی کے آغاز تک کا زمانہ جسے یورپی تاریخ میں 'یورپی عہد دریافت یا تلاش' (European age of Discovery or Exploration) کہا جاتا ہے میں یورپ کے مختلف بادشاہوں نے اپنی سرپرستی میں دنیا کے دور دراز اور ان جانے خطوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بحری مہموں کا آغاز کیا۔ امریکہ کی دریافت اور برصغیر تک رسائی یورپی عہد دریافت کے عظیم کارنامے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بعد نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کی سیاسی و ثقافتی تاریخ میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یورپ کا بتدریج عروج کی طرف سفر اور نوآبادیاتی سرگرمیاں تین عظیم اسلامی سلطنتوں، سلطنت مغلیہ، سلطنت صفوی اور سلطنت عثمانیہ کی سلامتی کے لئے خطرہ بننے لگیں۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک برصغیر میں برطانوی محض تاجر نہ رہے بلکہ ایک طاقتور سیاسی قوت بھی بن گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے ہندوستان کے کئی اہم علاقوں اور صوبوں (بنگال، بہار اور اوڑیسہ) کے دیوانی حقوق حاصل کر لیے اور کئی ایک علاقوں کو اپنی نوآبادیات کا حصہ بنالیا۔ جنوب ایشیائی خطے میں یورپی تجارتی اور نوآبادتی سرگرمیوں نے اس خطے کے فلاسفہ، دانشوروں اور مورخوں کے ساتھ ساتھ عام تعلیم یافتہ اور باشعور افراد کو بھی خطہ یورپ کی طرف متوجہ کیا۔ ہم دیکھتے ہیں کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادیادت کے ابتدائی دور میں یورپ کا سفر کرنے والے ہندوستانی باشندوں میں کچھ ایسے دانشور اور تعلیم یافتہ افراد بھی شامل تھے جنہوں نے مختلف مقاصد کے تحت سفر یورپ اختیار کیا انہوں نے برطانوی نوآبادکاروں کی صورت ہندوستان پر مسلط ایک نئی طاقت جس کا تعلق خطہ یورپ سے ہی تھا کی تہذیب و تمدن، ترقی اور ترقی کے اسباب کے ساتھ ساتھ بحیثیت مجموعی خطہ یورپ کے متعلق عمومی معلومات جیسے کے یورپ کا جغرافیہ، یورپ میں بسنے والی اقوام، ان کی زبانیں، مختلف یورپی ممالک کے جغرافیائی اور سیاسی حالات اور خطہ یورپ کی مجموعی ترقی کے اسباب وغیرہ کے متعلق معلومات کو بھی سفر ناموں کی صورت قلمبند کرنے کو ضروری خیال کیا۔ تاکہ وہ اپنے ہم وطنوں کو بھی خطہ یورپ سے متعلق بنیادی اور اہم معلومات فراہم کر سکیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کے ہمارے یہاں یعنی برصغیر میں عربی و فارسی ادبی روایت میں یورپ کی تاریخ و جغرافیہ اور یورپی تہذیب و تمدن سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے دانشوروں اور تعلیم یافتہ افراد کے یورپ کے ساتھ براہ راست رابطہ کے بعد ہوتا

ہے۔[55] ہمارے لیے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کے اٹھارہویں صدی تک عام جنوب ایشیائی باشندوں کا تصور یورپ ان چندایک یورپی اقوام تک محدود تھا جنہیں وہ قومیت کی تفریق کے بغیر بحیثیت مجموعی 'فرنگی' کہہ کر پکارتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک جب برطانوی ہندوستان میں اپنے یورپی حریف فرانسیسیوں کو تجارتی اور سیاسی طور پر مغلوب کر کے واضح برتری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مجموعی طور پر وہی یورپ کے نمائندہ تصور کیے جانے لگے۔ حتیٰ کے انیسویں صدی تک عام جنوب ایشیائی باشندوں کا تصور یورپ انگلستان اور انگریزوں (برطانویوں) تک محدود تھا۔[56] انہیں یہ معلوم نہیں تھا کے یورپ ایک وسیع خطہ زمین کا نام ہے جہاں مختلف اقوام آباد ہیں۔ تاہم اٹھارھویں صدی کی ہندوستانی اشرافیہ اور ہمارے سفر نامہ نگار نہ صرف یورپ کے جغرافیہ اور اس میں بسنے والی مختلف اقوام کی الگ قومی شناخت کے متعلق معلومات رکھتے تھے بلکہ وہ امریکہ جسے وہ نئی دنیا کہہ کر پکارتے تھے کی دریافت، اور امریکہ پر مختلف یورپی اقوام کی نوآبادیاتی یلغار کے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے تھے۔ مگر اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک چونکہ برطانوی نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے مختلف خطوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے میں دوسری تمام یورپی اقوام پر سبقت لے گئے تھے علاوہ ازیں علمی، ادبی اور سائنسی ترقی میں بھی کافی آگے نکل چکے تھے اور ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار بھی چونکہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے چنانچہ یورپ کی معاشرتی و تہذیبی اور علمی و سائنسی ترقی کے حوالے سے ہمارے تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز و محور زیادہ تر برطانیہ اور برطانوی معاشرہ ہی رہے۔ یہاں ہمارے لیے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے اپنے سفر ناموں میں یورپ کے لیے زیادہ تر 'فرنگستان' اور یورپی اقوام کے لیے بحیثیت مجموعی 'اہل فرنگ' یا فرنگی قوم کی اصطلاحیں استعمال کیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں اہل ہند یورپ کے لیے فرنگستان جب کے یورپی اقوام کے لیے اہل فرنگ یا فرنگی قوم کی اصطلاحات استعمال کر رہے تھے۔ لفظ فرنگ پہلے پہل دراصل فرانس کے لیے استعمال کیا گیا تھا کیونکہ یورپ کی ترقی کے ابتدائی زمانہ میں فرانس کو تمام یورپی اقوام پر فوقیت حاصل تھی نیز ترکی اور ایران کے ساتھ فرانس کے قریبی روابط بھی قائم تھے اس لیے پہلے پہل انہیں 'فرانک' کہا جاتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ فرانک (Farank) بگڑ کر فرنگ بن گیا اور مجموعی طور پر خطہ یورپ کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔[57]

ا۔ یورپ کا جغرافیہ:

اسلامی جغرافیائی روایت میں پوری دنیا کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور اس کے لیے 'ہفت اقلیم' کی

اصطلاح استعمال کی گئی تھی۔ ہفت اقلیم کے اسلامی تصور کی بنیاد دراصل ارسطاطالیسی۔بطلیموسی خیالات پر قائم تھی۔ ہفت اقلیم جس کے لیے 'ہفت کشور' کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی میں دنیا کی تقسیم دراصل ثقافتی یا سیاسی بنیادوں پر نہیں بلکہ خالصتاً جغرافیائی بنیادوں پر کی گئی تھی۔[۵۸] ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار اگرچہ دنیا کی جغرافیائی تقسیم کے اسلامی تصور (ہفت اقلیم) کے زیر اثر تھے مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی تقسیم کے یورپی تصور سے بھی کسی حد تک واقفیت رکھتے تھے۔ جیسے کے شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے نہ صرف دنیا کی جغرافیائی تقسیم کے اسلامی تصور 'ہفت اقلیم' کو بیان کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دنیا کی تقسیم کے یورپی تصور کو بیان کر کے ایک طرح سے اسلامی اور یورپی جغرافیائی تصورات کا موازنہ بھی پیش کیا۔ چناچہ اعتصام کے مطابق ہفت اقلیم کے تصور کے تحت عرب اور عجم کے حکماء اور فلاسفہ نے پوری دنیا کو سات حصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ان میں ساتویں اقلیم میں ترکستان، چھٹی اقلیم میں ماوراالنہر، پانچویں میں ہندوستان، چوتھی میں چین، تیسری میں روم، دوسری میں خراساں اور پہلی اقلیم میں بلخ کو رکھا گیا تھا اور یہ تصور پیش کیا گیا تھا کے ان ساتوں اقلیموں پر سات ستاروں کا عمل واثر تھا۔ منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین دونوں اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ امریکہ جسے از سر نو دریافت کیا گیا تھا دراصل ہفت اقلیم سے خارج تھا۔ اعتصام کے مطابق امریکہ دریافت ہو جانے کے بعد یورپیوں نے دنیا کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ان چار حصّوں میں یورپ، افریقہ، ایشیاء اور امریکہ شامل تھے۔ اعتصام الدین دنیا کی یورپی تقسیم کے مطابق ان حصوں میں شامل کردہ ممالک کے متعلق بھی کسی حد تک آگہی رکھتے تھے چنانچہ اعتصام کی معلومات کے مطابق فرنگی دانشورں نے پورے ترکستان کو یورپ میں شمار کیا۔ جب کے چین، ہندوستان اور حبش کو افریقہ میں شامل کیا گیا۔ شام، روم، تاتار، بربر اور فارس کو ایشیاء کا نام دیا گیا جب کے نئی دنیا کو امریکہ کہا گیا۔[۵۹] دنیا کی تقسیم میں خطہ یورپ کا جائے مقام یا اس کے مجموعی حدود و اربعہ کے متعلق شگرف نامہ میں ہمیں زیادہ واضح معلومات نہیں ملتیں۔ البتہ میر محمد حسین کے سفر نامہ 'مشاہدات فرنگ' میں دنیا کی جغرافیائی تقسیم میں خطہ یورپ کے جائے مقام اور اس کے مجموعی حدود و اربعہ کے متعلق زیادہ بہتر اور واضح انداز میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ میر محمد حسین کے مطابق:

> یورپ ایک بہت وسیع خطۂ زمین کا نام ہے جو بحرِ عرب پر ختم ہوتا ہے اور انتہائے شمال سے مل جاتا ہے۔ اس کے مشرق میں یونان اور روم کے ملک ہیں اور جنوب میں خلیج اعظم ہے جسے خلیج (۱) مغرب کہتے ہیں۔ خلیج سمندر کے بہت بڑے حصّے کو کہتے ہیں جو خشکی میں دور تک چلی جاتی ہے اور یہ خلیج وہی ہے جو یورپ، روم اور

مصر و بربر کے درمیان حدِ فاضل ہے، بلاد بربر ارض مغرب (۲) کے نام سے مشہور ہے اور اس پر آج کل مسلمان حکمران ہیں اور وہاں کا سلطان سادات میں سے ہے۔[۱۶]

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے یورپ کے جغرافیائی اور زمینی و سیاسی حالات کے حوالے سے بھی اپنے علم و مطالعہ کے مطابق اپنے سفر ناموں میں معلومات فراہم کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ اس حوالے سے اگر ان دونوں سفر نامہ نگاروں کی دلچسپیوں اور معلومات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ منشی اعتصام الدین نے شگرف نامہ ولایت میں یورپ کے مجموعی جغرافیائی حالات کے بیان میں کچھ یورپی ممالک کے رقبے، سمتیں، ان میں بولی جانے والی زبانیں، ان کی خاص زرعی پیداوار، موسم، نظام حکومت اور چند ایک یورپی ممالک کے دار لحکومتوں کے متعلق مختصر معلومات فراہم کرنے کی طرف توجہ دی۔ جب کہ میر محمد حسین نے خطہ یورپ میں بسنے والی اقوام، ان کے مذہب اور ان میں رائج نظام حکومت کے متعلق مجموعی طور پر مختصر سی معلومات فراہم کیں۔ مگر یہاں ہمارے تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کے اگرچہ انہوں نے اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے تحت انگلستان کا ہی سفر اختیار کیا تھا اور ان کا زیادہ قیام بھی انگلستان میں ہی رہا تھا مگر بحری سفر کی بدولت راستے میں آنے والے چند یورپی جزائر و ممالک میں ان کے بحری جہازوں کے قیام کی بدولت انہیں بھی وہ یورپی ممالک و جزائر دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ اگرچہ وہاں ان کے قیام کی مدّت بہت مختصر تھی۔ جیسے کے منشی اسماعیل نے انگلستان کے علاوہ جس یورپی ملک کا ذکر کیا وہ پرتگال تھا جہاں ان کا بحری جہاز کچھ مدت کے لیے لنگر انداز ہوا تھا۔ میر محمد حسین نے انگلستان کے علاوہ جن ممالک کے سفر کا ذکر کیا ان میں فرانس، پرتگال اور مصر شامل تھے۔ جب کے اعتصام نے انگلستان کے علاوہ خود فرانس اور اسکاٹ لینڈ کا سفر کیا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کے منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کے سفر ناموں میں کچھ ایسے یورپی ممالک کے جغرافیائی یا تاریخی معلومات کے حوالے ملتے ہیں جن کا انہوں نے براہ راست سفر نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کے ان ممالک کے متعلق ہمارے ان سفر نامہ نگاروں کی معلومات کے ماخذات یقیناً تاریخی کتب اور خود یورپی باشندے جیسے انگریز وغیرہ رہے ہوں گے۔ جیسے کے اعتصام الدین نے روس کے تاریخی حالات کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے اپنے ماخذ 'اسکندر نامہ' کا تذکرہ خاص طور پر کیا۔[۱۷]

یورپ کے جغرافیائی حالات کے بیان میں اگر سب سے پہلے کچھ یورپی ممالک کے رقبہ کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کی فراہم کردہ معلومات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کے انہوں نے یورپی ممالک کے رقبہ کو اعداد میں نہیں بلکہ ہندوستان کے کل رقبہ سے تقابل کر کے انداز بیان کرنے کی کوشش کی۔ جیسے کے اعتصام کی معلومات

کے مطابق ہالینڈ، جرمنی اور فرانس تینوں ممالک کا کل رقبہ ہندوستان کے برابر تھا۔ اعتصام کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کے روس یورپی ممالک میں رقبہ کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ انہوں نے اپنے قارئین کو روس کے رقبہ کی وسعت کا اندازہ کرانے کے لیے بھی ہندوستان کو بطور مثال یوں پیش کیا کہ روس رقبہ میں ہندوستان کا تین گنا تھا۔ اعتصام کی رائے میں جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور روس کے بادشاہ بہت طاقتور تھے۔ انہوں نے ہالینڈ، جرمنی اور فرانس کی زبان کو فصیح اور شیریں قرار دیا اور ان کی اہمیت اس طرح وضع کی کے قدیم زمانے میں ان زبانوں میں علم و دانش کی کتب تصنیف کی گیئں تھیں۔ یورپ کے مختلف ممالک میں رائج نظام سیاست کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کو جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق یورپ کے چودہ ممالک ایسے تھے جہاں بادشاہت قائم تھی۔ ان میں سے گیارہ ممالک کے نام انہوں نے شگرف نامہ میں تحریر کیے جب کے بقیہ تین کے متعلق یہ عذر پیش کیا کہ وہ ان کے حافظہ میں محفوظ نہیں رہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں یہ معلومات یقیناً یورپ میں قیام کے دوران کسی تاریخی کتاب کے مطالعہ یا پھر کسی دانشور کی زبانی معلوم ہوئی ہوں گی مگر چونکہ انہوں نے اپنا سفر نامہ اپنے سفر یورپ کے تقریباً پندرہ سال بعد تحریر کیا تھا اس لیے کچھ چیزیں ان کے حافظہ میں نہیں رہیں۔ بہر حال وہ گیارہ ممالک جن میں اعتصام الدین کے مطابق بادشاہت قائم تھی ان میں روم، اٹلی، روس، ڈنمارک، پرتگال، جرمنی، اسپین، فرانس، انگلینڈ اور جارجیا کے نام شامل تھے۔ منشی اعتصام الدین کی معلومات کے مطابق روم تمام یورپی ممالک کے لیے اپنی تاریخی اور مذہبی اہمیت کی بدولت بہت مقدس تھا۔ یہ بہت قدیم ملک تھا اور یورپ کے دوسرے ممالک اس کے اطراف میں واقع تھے۔ اعتصام نے بازنطینی سلطنت کے کچھ حصوں کی فتح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کے حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں شہر قسطنطنیہ جو بعد ازاں استنبول کہلایا جانے لگا تھا پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا مگر انگریز، اعتصام کی معلومات کے مطابق قسطنطنیہ کو جس پر مسلمان قابض ہو گئے تھے روم کے اطراف میں بطور ضمیمہ تصور کرتے تھے۔ اعتصام نے روم کو فرنگستان کا مذہبی گڑھ اور اس کے حکمران جسے فرنگستان والے بابا یا پوپ کہہ کر پکارتے تھے تمام تر طاقت کا سرچشمہ قرار دیا کیونکہ یورپ کے تمام بادشاہ پوپ کی اطاعت کرتے تھے اور اسے پیغمبر کا نائب تصور کرتے تھے۔ اعتصام الدین کی رائے میں دوسرے فرنگی بادشاہوں کے برعکس انگریز 'پوپ' سے عقیدت کم اور اختلاف زیادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اگرچہ سفر نامہ میں انگریزوں کے پوپ سے اختلاف کی وجہ بیان کرنے کی طرف تو کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر ان کی متجسس طبیعیت نے یقیناً اس کی وجہ جاننے کی کوشش ضرور کی ہو گی۔ اسی لئے ہم ان کے اس بیان کو مد نظر رکھتے ہوئے کے پوپ اور انگریزوں کے درمیان اختلاف پایا جاتا تھا یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کے وہ یورپ میں اٹھنے والی اصلاح مذہب کی تحریکوں اور ان کی بدولت 'پوپ' اور چرچ کے مقام و مرتبے پر پڑنے والے اثر

اور پروٹسٹنٹ اور کتھولک فرقوں کے وجود میں آنے کی وجوہات سے متعلق بھی کسی قدر آگہی رکھتے تھے۔ ہالینڈ کے سیاسی اور معاشی حالات کے متعلق اعتصام نے یہ رائے پیش کی کہ ہالینڈ میں بادشاہت قائم نہ تھی بلکہ حکومتی امور با اثر سرداروں کی نگرانی میں انجام پاتے تھے۔ اس ملک کے لوگ تجارت پیشہ تھے اس لیے زیادہ تر خوشحال تھے مگر اعتصام کی رائے میں اس ملک کا چونکہ اپنا کوئی بادشاہ نہیں تھا اس لیے انگریز انہیں پیچ اور کم حیثیت سمجھتے تھے۔ شگرف نامہ میں ہمیں کچھ ایسے یورپی ممالک جن کا اعتصام الدین نے براہ راست سفر کیا تھا میں بولی جانے والی زبانوں اور ان ممالک کے دار الحکومتوں کی چیدہ چیدہ خصوصیات بھی پڑھنے کو ملتیں ہیں۔ اعتصام کی رائے میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ میں اگرچہ انگریزی زبان ہی بولی جاتی تھی مگر ان میں کچھ الفاظ کا اختلاف بھی تھا۔ جب کے فرانس والے فرنچ زبان بولتے تھے۔ اعتصام ان ممالک کے دار الحکومتوں کے متعلق بھی معلومات رکھتے تھے چنانچہ ان کے مطابق انگلستان کا دار الحکومت لندن، فرانس کا دار الحکومت پیرس جب کے اسکاٹ لینڈ کا دار الحکومت ادمیرہ (ایڈنبرا) تھا۔[۴۲] منشی اعتصام الدین نے یورپ میں بسنے والی تمام اقوام کی مجموعی تعداد کے متعلق کوئی رائے پیش نہیں کی۔ مگر میر محمد حسین نے اپنی معلومات کی بنا پر یورپ (فرنگستان) کو اندازا چودہ قدیم اور عظیم اقوام کا مسکن قرار دیا جو مختلف زبانیں بولتی تھیں اور ان سب کا اپنا اپنا بادشاہ تھا۔ میر محمد حسین کی رائے میں ان تمام اقوام کا مذہب نصرانیت تھا مگر وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کے یورپ میں اٹھنے والی تحریک نشاط ثانیہ میں سائنسدانوں اور مختلف دانشوروں کے نظریات کی بدولت ان نصرانیوں کے اندر مختلف فرقے جنم لے چکے تھے۔ انہوں نے اگرچہ نشاط ثانیہ یا اصلاح مذہب کی اصطلاحات کا براہ راست استعمال نہیں کیا مگر انہوں نے 'مارٹن لوتھر' اور 'جان کالون' کے نام اس حوالے سے ضرور پیش کیے جو اس تحریک کے علمبردار تھے۔ میر محمد حسین کے سفر نامہ میں یورپ کے مختلف ممالک کے جغرافیہ یا جغرافیائی حالات کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ ہاں البتہ محمد حسین کو بھی اعتصام کی طرح اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کے روس رقبے میں یورپ کا سب سے وسیع ملک تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کے اعتصام الدین کی طرح محمد حسین نے بھی اس ملک کے رقبے کو اعداد میں بیان نہیں کیا بلکہ اس کی وسعت کا تصور یوں پیش کیا کے یہ ملک رقبہ میں ہندوستان سے بھی بڑا تھا۔ جب کے انگلستان ان کی رائے میں ایک ایسا جزیرہ تھا جو چاروں طرف سے سمندر سے گھرا ہوا تھا اور فرانس کے ساحل سے بہت قریب تھا۔[۴۳]

منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کے برعکس منشی اسماعیل کے ہاں بحیثیت مجموعی یورپ یا انفرادی طور پر انگلستان کے جغرافیہ یا جغرافیائی حالات کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی گئی۔

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ یورپ ایک وسیع خطہ زمین کا نام تھا جہاں مختلف اقوام آباد تھیں۔ مگر ان کی فراہم کردہ معلومات سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ کے مجموعی جغرافیہ اور مختلف یورپی ممالک کے جغرافیائی حالات اور زمینی و سیاسی حقائق کے حوالے سے ان کی معلومات محدود تھیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے سفر ناموں میں صرف انہی ممالک کے جغرافیہ کے متعلق مختصر معلومات فراہم کیں جن کا انہوں نے براہ راست مشاہدہ کیا تھا یا جن کے متعلق اپنے مطالعہ کی بدولت معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات کی بدولت ہندوستان کی فارسی۔ عربی ادبی روایت میں (سفر ناموں کی صورت میں) یورپ و یورپی ممالک کے جغرافیہ اور جغرافیائی حالات بیان کرنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

ب۔ یورپ کی ترقی اور عروج کے اسباب

اٹھارہویں صدی کو یورپ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے اس صدی کو یورپی تاریخ میں Century of Lights یا Century of Reason کی اصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) اور انگلستان کا صنعتی انقلاب (۱۷۶۰ء۔ ۱۸۴۰ء) اسی صدی میں رونما ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک ہندوستان اور دیگر جنوب ایشیائی ممالک میں یورپی مقبوضات بڑھنے سے جنوب ایشیائی باشندوں میں یورپ اور خاص طور پر انگلستان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جب سفر یورپ اختیار کیا تھا تو یورپ میں علمی و ادبی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ نت نئی سائنسی ایجادات وقوع پذیر ہو رہی تھیں اور جو ہو چکی تھیں ان کی بدولت یورپ میں معیار زندگی اور طرز زندگی بدل رہے تھے۔ ہمارے یہ سفر نامہ نگار یورپ کی علمی، سائنسی اور مادی و صنعتی ترقی سے بے پناہ متاثر ہوئے۔ منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے اپنے سفر ناموں میں یورپ میں ہونے والی علمی و سائنسی ترقی اور جدید سائنسی ایجادات و نظریات کے نہ صرف حوالے پیش کیے بلکہ انہوں نے یورپی تاریخ سے چند ایسے واقعات کے حوالے بھی پیش کئے جس کی بدولت ان کی رائے میں خطہ یورپ میں علم و شعور کا سورج طلوع ہوا اور اس کی روشنی میں انہوں نے کائنات اور اس کے رموز کے متعلق قدیم اسطاطالیسی۔ بطلیموسی اور اسلامی نظریات میں انقلاب پیدا کر کے اپنی فکری و علمی ترقی کی بنیاد رکھی اور ان کی انہی کوششوں کی بدولت خطہ یورپ دنیا کے نقشے پر اپنا ایک عظیم مقام اور منفرد حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے انگلستان کے نظام سیاست،بلندوبالا عمارتوں،اعلی تعلیمی اداروں،عوامی سہولیات (سڑکوں،پلوں اور تفریح گاہوں وغیرہ)، چھاپہ خانوں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے بحری اور جنگی بحری جہازوں کی ایجاد کو بہت سراہا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کے منشی اعتصام الدین کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کے اٹھارہویں صدی میں انہوں نے انگلستان میں جس ترقی کا مشاہدہ کیا تھا وہ برسوں کی محنت وریاضت کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے انگلستان کی ترقی میں سولھویں صدی (یعنی عہد نشاط ثانیہ) کو اہم سنگ میل قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے یورپ کے کچھ دوسرے ممالک جیسے کے روس کا حوالہ بھی پیش کیا جو ان کی رائے میں اٹھارہویں صدی میں اتنی ترقی کر چکا تھا کے آلات جنگ اور کثرت سپاہ میں یورپ کے تمام ممالک پر فوقیت رکھتا تھا۔ مگر سکندر نامہ میں روس کے قدیم حالات کے حوالے سے فراہم کردہ معلومات سے اعتصام نے یہ نتیجہ اخذ کیا کے قدیم زمانے میں روس کی ترقی کا یہ حال نہ تھا اور اس ملک کے باشندے قدیم زمانے میں نوشت وخواند اور اصول حکمرانی سے ناواقف تھے۔ اعتصام نے روس میں علمی وفکری بیداری میں ایک بادشاہ 'پیٹر دی گریٹ' (1672-1725Peter the Great) جس کا نام اگرچہ انہوں نے نہیں لیا مگر اس کے زمانے کی نشاندہی کر کے روس کی ترقی میں اس کے کردار کو بہت سراہا کیوں کے ان کی رائے میں روس کے اسی بادشاہ کی خواہش اور ایماء پر بہت سے روسی باشندوں نے انگلستان جا کر تعلیم حاصل کی، مختلف فنون سیکھے اور پھر واپس وطن جا کر اپنے ہم وطنوں میں ان علوم وفنون کی تعلیم کو عام کیا۔ اعتصام الدین کی معلومات کے مطابق اٹھارہویں صدی میں انگریزوں اور روسیوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے کیونکہ روسیوں کو جنگی تربیت، فوجی نظم ونسق اور آلات جنگ بنانے کی تربیت دراصل انگریزوں کی ہی فراہم کردہ تھی۔ [۶۴] اعتصام کی ان آراء سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کے انہیں اس بات کا ادراک تھا کے مختلف یورپی ممالک نے اپنی ترقی کا سفر دراصل یورپی عہد نشاط ثانیہ میں اپنی محنت اور جدوجہد کے مطابق وقتاً فوقتاً طے کیا تھا اور اس سے پہلے وہ لوگ جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔

منشی اعتصام الدین کی طرح میر محمد حسین نے بھی اپنے سفر نامے میں اٹھارہویں صدی تک یورپ میں ہونے والی ترقی اور یورپیوں کے مختلف علوم وفنون کی طرف رویّوں اور رجحانات کے چیدہ چیدہ حوالے پیش کیے۔ منشی اعتصام الدین کی طرح میر محمد حسین کو بھی بڑے بڑے بحری جہازوں خاص کر انگریزی بحری جنگی جہازوں کی شان وشوکت نے بہت متاثر کیا۔ انہیں بھی چھاپہ خانے کی ایجاد بہت مفید معلوم ہوئی۔ مختلف علوم و فنون کی طرف یورپیوں کے رویّوں اور رجحانات کے حوالے سے میر محمد حسین نے جو آراء پیش کیں ان کے مطابق اٹھارہویں صدی میں تمام یورپ میں لسانی علوم کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ محمد حسین کی معلومات کے مطابق تمام

یورپی زبانوں میں رومی یورپیوں کی مشترکہ زبان تھی کیوں کے گزشتہ زمانے میں اسی زبان میں اکثر کتابیں تصنیف کی گئیں تھیں۔ میر محمد حسین کی معلومات کے مطابق یورپی تمام علوم میں طبیعات اور ریاضیات میں خاص دلچسپی لے رہے تھے اور ان کی بدولت کائنات کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کر رہے تھے اور جدید اور نئے نظریات پیش کر رہے تھے۔[۴۵] مگر اعتصام کی طرح میر محمد حسین کو بھی اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ اٹھارہویں صدی میں انہوں نے یورپ میں جس علمی و فکری ترقی کے بارے میں سن رکھا تھا اور جس کا مشاہدہ کیا تھا وہ قدیم زمانے میں یورپ کو میسر نہ تھی بلکہ اس حوالے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کے انہوں نے اعتصام الدین سے زیادہ یورپ کی ترقی کے تاریخی اسباب کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ میر محمد حسین کی رائے میں قدیم زمانے میں یورپ میں تعلیم عام نہ تھی بلکہ نوشت و خواند کا کام صرف پادریوں تک محدود تھا۔ محمد حسین کے اس بیان سے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے انہیں اس بات کا بخوبی ادراک تھا کے یورپ کی فکری، علمی و سائنسی ترقی میں یورپ کے عہد نشاط ثانیہ اور اس میں اٹھنے والی اصلاح مذہب کی تحریکوں کا کردار بہت اہم تھا۔ محمد حسین نے اگرچہ نشاط ثانیہ یا اصلاح مذہب کی اصطلاحات کا براہ راست استعمال نہیں کیا مگر وہ یورپ میں اٹھنے والی اصلاح مذہب کی تحریکوں کے علمبردار مارٹن لوتھر اور جان کالون سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھے بلکہ یورپ میں کیتھولک چرچ اور پوپ کے لامحدود اختیارات کو ان کے نظریات اور تعلیمات سے جو کاری ضرب پڑی اور اس طرح یورپی لوگوں میں جو شعور بیدار ہوا وہ اس کے متعلق پوری آگاہی رکھتے تھے۔ مگر ان سب کے ساتھ ساتھ میر محمد حسین نے یورپ میں ہونے والی علمی و سائنسی ترقی کا ایک بہت بڑا سبب مسلمانوں کے اس علمی و ادبی سرمائے کو قرار دیا جو فتح اسپین کے بعد مسلمانوں نے وہاں اپنے آٹھ سو سالہ دور حکومت کے دوران ہر علم و فن کے مشاہیر کی محنت و کاوش کی بدولت جمع کیا تھا۔ مگر محمد حسین کے مطابق کچھ اسباب کے پیش نظر جب شاہ اسپین کا ایک مرتبہ پھر اندلس پر قبضہ ہو گیا تو وہاں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عظیم الشان عمارتوں کے علاوہ علوم و فنون کی کتب کے قیمتی ذخائر بھی فرنگیوں کے مال غنیمت کا حصّہ بن گئے مگر یورپیوں نے اپنی علم دوستی اور آثار قدیمہ میں اپنی دلچسپی کی بنا پر نہ صرف اسپین کے مسلم علمی سرمائے کو محفوظ رکھا بلکہ ان کتب سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے عربی سے یورپی زبانوں میں ان کتب کے تراجم کا آغاز کیا۔ میر محمد حسین نے یورپی عہد دریافت میں یورپی اقوام کو حاصل ہونے والی کامیابیوں (جیسے امریکہ کی دریافت وغیرہ) کا سرچشمہ دراصل اہل اندلس کے علوم و فنون خاص کر فن ہیئت اور ریاضیات سے یورپی فیض و اکتساب کو قرار دیا اور یہ مفروضہ پیش کیا کے سمندروں اور دریاؤں کے ساحلوں سے قریب ہونے اور تجارت و ملاح پیشہ ہونے کے ناطے یہ علوم یورپیوں کی دلچسپی کا خاص مرکز تھے۔ لہذا انہوں نے دریائی و سمندری سفروں میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر اہل اندلس کے علمی سرمائے میں سے ان علوم کی کتب کے تراجم

خاص طور پر کیے۔ ان علوم سے استفادہ کا نتیجہ یہ نکلا کے وہ نہ صرف زمین، اس کی ماہیت اور بحیثیت مجموعی کائنات کے متعلق یونانی اور مسلم مفکرین کے نظریات سے آگاہ ہوئے بلکہ انہوں نے ان نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے علم ریاضیات اور طبیعیات کے حوالے سے جدید یورپی نظریات کی بنیاد رکھی۔[۶۶] محمد حسین نے اس حوالے سے انگلش سائنسدان نیوٹن اور پولینڈ کے سائنسدان کوپر نیکس کی خدمات کو بہت سراہا۔ انہوں نے طبیعیات اور ریاضیات کے علوم سے استفادہ کرتے ہوئے نیوٹن کی دوربین کی ایجاد اور کوپر نیکس کے نظام شمسی میں سورج کی مرکزیت کے تصور اور کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے اقدامات کو (یورپی عہد دریافت کے) عظیم کارنامے قرار دیا۔[۶۷] میر محمد حسین کی طرح منشی اعتصام الدین کو بھی اس بات کا پورا ادراک تھا کے یورپی عہد دریافت میں یورپیوں کو حاصل ہونے والی کامیابیاں جیسے کے امریکہ کی دریافت اور یورپیوں کی برصغیر تک رسائی دراصل یورپی خطے کی ترقی میں اہم سنگ میل ثابت ہوئیں۔ میر محمد حسین اور اعتصام الدین دونوں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کے یورپی عہد دریافت میں دنیا کے دور دراز اور ان جانے خطوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مختلف یورپی ممالک کے بادشاہوں نے اپنی زیر نگرانی بحری مہمات کا آغاز کر رکھا تھا۔ منشی اعتصام الدین ان بحری مہمات کو جاری کرنے کے پیچھے یورپیوں کے کارفرما عزائم کا تعاقب کرتے ہوئے اس نتیجہ تک پہنچے کے یورپی اقوام دنیا کے دور دراز اور ان جانے خطوں تک اس لیے رسائی حاصل کرنا چاہتی تھیں تاکے وہ ان خطوں کی نادر و نایاب اشیاء تک براہ راست رسائی حاصل کر سکیں۔ مگر اعتصام کی رائے میں وہ اپنے مقصد میں تب تک کامیاب نہ ہو سکے جب تک قطب نما ایجاد نہ ہوا تھا۔ مگر جب قطب نما ایجاد ہو گیا اور یورپی اقوام کی دسترس میں آ گیا تو انہوں نے جہاز رانی اور جہاز سازی کے جدید طریقے متعارف کروانے کی طرف خاص توجہ دی۔ اس طرح منشی اعتصام الدین کے مطابق یورپی نہ صرف دنیا کے دور دراز خطوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ انہوں نے ان میں سے اکثر ممالک اور غیر آباد سمندری جزیروں کو اپنے تصرف میں لے لیا اور وہاں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔[۶۸] ان دونوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں امریکہ کی دریافت، امریکہ پر یورپی نوآبادیاتی یلغار اور امریکی وسائل سے یورپی نوآبادکاروں کے استفادہ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کے ہمارے یہ دونوں سفر نامہ نگار یورپیوں کے توسیع پسندانہ اور نوآبادکارانہ عزائم اور ان سے یورپی اقوام کو حاصل ہونے والے فوائد کے متعلق بھی کافی آگہی رکھتے تھے۔

یورپ کی ترقی کے تاریخی اسباب کے حوالے سے ہمارے سفر نامہ نگاروں اعتصام الدین اور میر محمد حسین کی معلومات و آراء سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کے اٹھارہویں صدی میں

انہوں نے یورپ میں جس ترقی کا مشاہدہ کیا تھا وہ ہمیشہ سے اس کا نصیب نہ تھی بلکہ تاریخ کے قدیم ادوار میں وہ لوگ بھی جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔اوران پر انہی میں سے طاقتور اقوام (یونانی اور رومی وغیرہ) اور مسلمان طویل عرصہ تک حکمرانی کرتی رہیں۔ مگر یورپی عہد نشاط ثانیہ اور اس میں اٹھنے والی مختلف تحریکوں نے یورپیوں کے اندر تحریک پیدا کی اور انہوں نے مختلف علوم وفنون کو بہت ذوق و شوق سے حاصل کیا۔اس طرح ہمارے ان دونوں سفرنامہ نگاروں نے یورپی ترقی کے تاریخی اسباب بیان کر کے دراصل بڑے احسن طریقے سے اپنے ہندوستانی قارئین کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی کے علم ودانش کسی ایک قوم کی میراث نہیں بلکہ جو کوئی بھی اسے حاصل کرنے کے لیے محنت و کوشش کرتا ہے وہ اسے پالیتا ہے۔ جیسے کے ان کے خیال میں قدیم زمانے میں مسلمانوں نے اپنی سعی و کوشش سے علم ودانش میں اپنا نام ومقام پیدا کیا تھا اسی لیے انہیں ترقی اور عروج بھی حاصل ہوا تھا۔ محمد حسین نے اس حوالے سے خاص طور پر اسپین میں مسلم حکومت کے قیام اور اس زمانے میں مسلمانوں کی مختلف علوم وفنون میں ترقی کو بطور مثال پیش کیا۔ مگر ان کے خیال میں جب ان کے اندر انتشار و خلفشار اور مختلف برائیوں نے جنم لیا تو وہ زوال پذیر ہو گئے جب کے ان کے علمی سرمائے سے استفادہ کے ساتھ ساتھ یورپیوں نے اپنی کوشش اور جدوجہد سے علم ودانش میں اپنا الگ مقام و مرتبہ حاصل کیا۔

ج۔ امریکہ (نئی دنیا) کی دریافت اور امریکہ پر یورپی نوآبادیاتی یلغار

یورپی عہد دریافت کا عظیم دور پندرھویں صدی کے نصف آخر سے سولھویں صدی کے اختتام تک جاری رہا۔ امریکہ کی دریافت اس عہد کا عظیم اور حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ یہ کارنامہ کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus)(۱۴۵۱ء۔۱۵۰۴ء) کے ہاتھوں اسپین کی ملکہ ایزابیلا اوّل (Isabella I)(۱۴۷۴ء۔۱۵۰۴ء) کے تعاون سے انجام پایا۔[۶۹]

امریکہ کی دریافت کا قصہ جنوب ایشیائی سفرنامہ نگاروں اعتصام الدین اور میر محمد حسین کی توجہ اور دلچسپی کا خاص مرکز بنا اور انہوں نے یورپیوں کی اس دریافت کو اہمیت دیتے ہوئے کسی قدر تفصیل سے اس کے متعلق اپنے سفرناموں میں معلومات فراہم کیں۔ان کی اس دلچسپی کی وجہ شاید یورپین سائنس، نت نئی ایجادات اور دریافتوں میں ان کی ذاتی دلچسپی تھی اور شاید اس لیے بھی کے امریکہ کی دریافت کی بدولت دنیا کی ایک نئی جغرافیائی سمت کا پتہ چلا جو دنیا کی جغرافیائی تقسیم کے قدیم ارسطاطالیسی۔ بطلیموسی اور اسلامی تصورات میں شامل نہ تھی۔ جیسا کے اعتصام کی رائے میں عرب اور عجم کے حکماء اور فلاسفہ کے دنیا کی تقسیم کے تصور 'ہفت اقلیم' جس میں پوری دنیا کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا میں امریکہ شامل نہیں تھا۔[۷۰] ہمارے ان دونوں سفرنامہ نگاروں نے امریکہ کے اتنی

دیر سے دریافت ہونے کی وجوہات، یورپیوں کے امریکہ دریافت کرنے کے بنیادی اسباب کے ساتھ ساتھ امریکہ کے جغرافیہ، زمینی و سیاسی حالات، امریکہ کے قدیم باشندوں کی معاشرت اور امریکہ پر یورپی اقوام کی نوآبادیاتی یلغار اور اس کے بعد امریکہ میں آنے والی تبدیلیوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین دونوں نے پندرہویں صدی (یورپی عہد دریافت) میں ہسپانویوں کی امریکہ کی دریافت کو ایک عظیم کارنامہ قرار دیا کیونکہ ان کی رائے میں اس کی بدولت نہ صرف یورپی بلکہ پوری دنیا ایک ایسے خطے سے متعارف ہوئی جو عرصہ دراز سے دنیا کے بقیہ حصوں میں رہنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ میر محمد حسین نے اپنی دانشورانہ سوچ کے زاویہ نظر سے امریکہ کی دریافت کو اس لیے بھی اہم قرار دیا کیونکہ اس کی بدولت یورپی اقوام علم فلکیات، جغرافیہ اور ریاضیات جیسے علوم کی طرف متوجہ ہوئیں جو زمین و کائنات کے اسرار جاننے اور مزید دریافتیں کرنے میں یورپیوں کے لیے معاون ثابت ہوئے۔ محمد حسین کے تجزیہ کے مطابق یہ علوم مسلمانوں کے سقوط ہسپانیہ کے بعد پہلے ہی سے یورپیوں کی دسترس میں آچکے تھے۔[۱۱]

منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین دونوں کی متجسس طبیعت نے اس بات کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کی کہ آخر یونانی حکماء ارسطو اور افلاطون زمین کے اس حصے جسے بعد ازاں امریکہ کا نام دیا گیا سے کیوں واقف نہ تھے؟ ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے اپنی تحقیق کی بدولت حاصل کردہ معلومات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امریکہ کی دریافت دراصل قطب نما کی ایجاد کی مرہونِ منت تھی۔ کیونکہ جب تک قطب نما ایجاد نہ ہوا تھا اس وقت تک جہاز سمندر میں دور دراز تک مسافت طے نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یونانی حکماء ارسطو اور افلاطون بھی زمین کے اس حصّے سے ناواقف تھے۔ اعتصام کی رائے میں چونکہ اس خطے کو از سر نو دریافت کیا گیا تھا اس لیے اسے 'نئی دنیا' کہا گیا۔ اس خطہ کے اتنی دیر سے دریافت ہونے کے سبب کے متعلق اعتصام الدین نے حکماء متاخرین کے اس نظریے کو بھی بیان کیا جس کے مطابق دنیا کے آغاز کے وقت یہ خطہ یورپ کا ہی حصّہ تھا مگر طوفانِ نوح کے بعد یہ نشیب میں چلا گیا اور پھر بڑے بڑے زلزلوں نے اس کو قدیم دنیا سے علیحدہ کر دیا۔ اس کا اندازہ سمندر کے جزیروں سے ہوتا ہے۔ یہاں زمین چونکہ نشیب و فراز میں تھی اس لیے زمین کا کچھ حصّہ اُبھر کر اوپر آ گیا جبکہ بقیہ زمین پانی کے نیچے رہ گئی۔[۱۲] ان دونوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے امریکہ دریافت کرنے کے پیچھے چھپے یورپی عزائم کا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کی۔ ان کی آراء کے مطابق امریکہ دریافت ہونے کا سبب دراصل یورپی اقوام کی دنیا کے دور دراز اور ان جانے خطوں کو تسخیر اور ان کی نادر و نایاب اشیاء سے استفادہ حاصل کرنے کی خواہش بنی۔ اعتصام الدین کے مطابق یورپی چونکہ ہندوستان سے متعلق معلومات رکھتے تھے اور ہندوستانی مصنوعات جیسے کہ ریشم اور افیون وغیرہ کے گرویدہ تھے جو ان

تک سورت اور بنگال کے سوداگروں کی وساطت سے پہنچ رہیں تھیں مگر یورپی ہندوستان سے ان اشیا کی براہ راست تجارت کرنا چاہتے تھے۔[۳۷] اعتصام اور محمد حسین نے یہ مؤقف پیش کیا کہ قطب نما کی ایجاد نے ان کے اندر یہ تحریک پیدا کی کے وہ سمندر میں دور دراز تک سفر کریں اور ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ممالک سے براہ راست تجارتی تعلقات استوار کریں۔اس مقصد کے حصول کے لیے یورپ کے مختلف بادشاہوں کی زیر نگرانی جاری کردہ بحری مہمات کے متعلق بھی ہمارے یہ دونوں سفر نامہ نگار کافی معلومات رکھتے تھے۔ چناچہ ہسپانوی بحری مہم جس کی بدولت امریکہ دریافت ہوا تھا اس کے آغاز کا سبب میر محمد حسین کے مطابق کولمبس نامی شخص کا نظریہ بنا تھا۔ان کی رائے میں کولمبس چونکہ جہاز رانی کا ماہر تھا اور قدرے تعلیم یافتہ بھی، اس لیے اُس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین کے دونوں کنارے کھلے ہوئے ہونے چاہئیں تاکہ متوازن بھی رہے اور پانی میں غرق بھی نہ ہو سکے۔

میر محمد حسین کی معلومات کے مطابق کولمبس کے اس قیاس کی آزمائش کے لیے بحری مہم کو جاری کرنے کے لیے ملکہ ہسپانیہ کے سوا کسی اور نے اس کی مالی امداد نہ کی اور آخر کار وہ مغرب کی طرف ایک ماہ کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک بڑے خطہ زمین جو ہماری زمین سے جسے ربع مسکون کہتے ہیں، نصف کے برابر تھا پہنچ گیا اور یوں امریکہ جو اب تک دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا، دریافت ہوا۔[۳۸]

منشی اعتصام الدین نے امریکہ کی دریافت کو ایک اتفاق سے منسلک کیا (جیسا کہ اس حوالے سے ہم نے اکثر سنا اور پڑھا ہے) کہ ہسپانیہ کا ایک جہاز نامعلوم ممالک اور سمندری عجائبات و نوادرات کی تلاش میں نکلا ضرور تھا مگر تباہ حال ہو کر اتفاق سے اس خطے میں پہنچ گیا جسے بعد ازاں امریکہ نام دیا گیا۔[۳۹]

منشی اعتصام الدین نے امریکہ کی دریافت کا واقعہ کسی قدر تفصیل سے بیان کیا مگر حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس مہم کے بانی کرسٹوفر کولمبس کا نام کہیں نہیں لیا اور نہ ہی اس کے زمین سے متعلق کسی نظریے جیسے کہ میر محمد حسین نے بیان کیا، کوئی ذکر کیا۔امریکہ کی دریافت کے اسباب و محرکات بیان کرنے کے بعد ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے امریکہ میں یورپی نو آبادیات قائم ہونے سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کی وضع قطع، اُن کے رہن سہن اور اس خطے میں پائی جانے والی اشیاء کے بیان کرنے میں بھی دلچسپی لی۔امریکہ پر یورپی اقوام کی نو آبادیات قائم کرنے سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کے متعلق ہمارے سفر نامہ نگاروں نے اپنے مطالعے اور معلومات کے مطابق جو آراء پیش کیں ان سے صاف طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کے یورپی اقوام کے امریکہ پر نو آبادیات قائم کرنے سے پہلے وہاں کے مقامی باشندے غیر تہذیب یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ تھے۔چناچہ اعتصام الدین نے امریکہ کے مقامی باشندوں کے متعلق جو معلومات فراہم کیں اُن کے مطابق وہ سیاہ رنگ کے، دراز قامت اور صحت مند لوگ تھے۔ان

کا کوئی دین و مذہب نہیں تھا۔ لباس جانوروں کے چمڑے اور درختوں کے پتوں سے بناتے تھے۔ ان کی غذا کچا یا نصف پکا گوشت تھا۔

اعتصام الدین کے مطابق امریکہ کے لوگوں میں تعلیم کا شعور نہیں تھا اور نہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ہاں البتہ قدیم زمانہ سے انہوں نے ایک عجیب طرح کا رسم الخط ایجاد کر رکھا تھا جس کے ذریعے وہ پتوں پر زرد، سبز اور بعض دوسرے رنگوں سے مختلف جانوروں جیسے شیر، بلی، کتا اور سور وغیرہ کی تصاویر بناتے تھے اور یہ تصاویر ہی دراصل کسی خاص مقصد کے اظہار کے لیے ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق دھان، گیہوں، جو، گنا، تمباکو، انگور، اور انار وغیرہ امریکہ کی زرعی پیداوار تھیں جبکہ امریکہ کے معدنی ذخائر میں سونے، چاندی، تانبا، فولاد اور پارہ کی کانیں بکثرت تھی۔[۷۶]

امریکہ کی مقامی معاشرت کے متعلق فراہم کردہ میر محمد حسین کی معلومات کے مطابق امریکہ میں بہت سی قومیں آباد تھیں جو مختلف زبانوں اور رسم و رواج کی حامل تھیں اور یہ سب لوگ سورج اور بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ منشی اعتصام الدین کی طرح علوم و فنون کے حوالے سے میر محمد کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا کہ امریکہ کے مقامی لوگ علوم و فنون سے ناآشنا تھے۔ امریکہ کے قدرتی وسائل میں محمد حسین کی معلومات کے مطابق سونے، چاندی، الماس اور زمرد کی کانوں کے علاوہ ایسی کئی مفید جڑی بوٹیاں پائی جاتی تھیں جو امریکہ کے سوا کہیں اور دستیاب نہیں تھیں۔[۷۷]

ہمارے یہ سفر نامہ نگار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کے امریکہ چونکہ ایک زرخیز اور قدرتی وسائل کی دولت سے مالا مال خطہ تھا اس لیے ہسپانویوں کے علاوہ دوسری یورپی طاقتیں بھی امریکہ کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے لیے وہاں پہنچ گئیں تھیں۔ امریکہ پر نوآبادیاتی تسلط اور یورپی اقوام کی امریکہ کی نوآبادیاتی تقسیم کے حوالے سے اعتصام الدین نے جو معلومات فراہم کیں ان کے مطابق امریکہ جانے والی پہلی قوم ہسپانوی تھے۔ انہوں نے امریکہ کے سادہ لوح لوگوں کو تحفے تحائف اور اپنی شیریں زبان سے اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا اور بعد ازاں اس ملک کے مختصر حصّے پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ان کے بعد فرانسیسیوں نے اس ملک کے بہت بڑے حصّے کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ سب سے آخر میں انگریز یہاں پہنچے اور فرانس سے کچھ کم رقبہ ان کے حصّے میں آیا۔[۷۸]

میر محمد حسین نے منطقی انداز میں امریکہ پر نوآبادیاتی تسلط کا سبب یورپی نوآبادکاروں کی طاقت اور جنگی سازوسامان کی فراوانی کو قرار دیا جس کی بدولت وہ بہت جلد امریکہ کے وسیع حصّے پر قابض ہو گئے۔ ان کے مطابق امریکہ کی نوآبادیاتی تقسیم میں جو یورپی قومیں شامل تھیں ان میں ہسپانوی امریکہ کے مغربی حصّے پر، انگریز شمال مشرقی حصّے پر اور پرتگیز جنوب مشرقی حصّے پر قابض ہو گئے۔[۷۹]

ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کے امریکہ کے وسائل پر یورپی نوآبادیاتی طاقتوں کا قبضہ دراصل ان یورپی اقوام کی خوشحالی کا باعث بنا تھا۔ جیسا کے منشی اعتصام الدین نے اسپینیوں کی خوشحالی کو امریکہ میں موجود سونے کی کانوں پر ان کے قبضہ سے مشروط قرار دیا۔ جب کے انگریز ہندوستان میں جس سونے کی تجارت کرتے تھے وہ بھی اعتصام کی رائے میں امریکہ سے ہی حاصل کیا جاتا تھا۔ [۵۰] امریکہ پر یورپی نوآبادیاتی تسلط قائم ہو جانے کے بعد وہاں یورپی نوآبادکاروں کی جاری کردہ سرگرمیوں کے متعلق ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے جو معلومات و آراء پیش کیں ان سے صاف طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کے امریکہ میں ہونے والی مادی و معاشرتی ترقی دراصل یورپی نوآبادکاروں کی توجہ اور کوشش کی مرہون منت تھی۔ اس حوالے سے میر محمد حسین نے اپنی معلومات کے مطابق یہ رائے پیش کی کے امریکہ پر قابض ہونے والی یورپی طاقتوں میں ہسپانوی جو سب سے پہلے امریکہ پر قابض ہوئے انہوں نے سب سے پہلے وہاں مضبوط قلعے تعمیر کیے اور بڑے بڑے شہر آباد کیے۔ وہ لوگ ایسی اشیا اور جانور جو امریکہ میں نہ پائے جاتے تھے جیسے گھوڑا وغیرہ انہیں بھی اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں کھیتی باڑی کا کام کرنے کے لیے بطور مزدور افریقی ممالک کے باشندوں کو لے گئے۔ [۵۱]

منشی اعتصام الدین کے مطابق امریکہ جانے والی یورپی اقوام چونکہ اس سونے، چاندی کی کانوں والے ملک میں مستقل قیام کرنا چاہتی تھیں لہذا اپنی طاقت کے بل بوتے پر انہوں نے وہاں کے مقامی باشندوں کو اپنا کار گزار مزدور بنا لیا اور انہوں نے وہاں عمارتیں تعمیر کیں، کاشتکاری کو ترقی دی، جہاز سازی کی صنعت قائم کی، نظامِ حکمرانی متعارف کروائے اور عدالتیں قائم کیں۔ رفتہ رفتہ انگریز یہاں بھی فرانسیسیوں پر غالب آ گئے مگر وقت کے ساتھ ساتھ امریکہ میں زرعی و صنعتی ترقی اور جنگی ساز و سامان اور مال و دولت کی کثرت نے وہاں کے مقامی باشندوں کو اپنے طاقتور اور انگریزوں کے ہم پلہ ہونے کا احساس دلایا اور ان میں غیر ملکی آقاؤں کے خلاف بغاوت کی چنگاری کو بھڑکایا۔ اعتصام امریکہ کے باشندوں کی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد سے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے تھے چنانچہ ان کی رائے میں امریکیوں نے انگلستان کی حکومت سے بغاوت کی اور اس وجہ سے کافی عرصہ تک دونوں قوموں کے درمیان جنگ و جدل ہوتی رہی جس میں دونوں قوموں کے بہت سے افراد مارے گئے مگر آخر کار امریکی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد دونوں قوموں نے آپس میں صلح کر لی۔ [۵۲]

امریکہ پر یورپی نوآبادیاتی تسلط قائم ہونے سے پہلے وہاں کے مقامی باشندوں کی خوراک، لباس اور طرزِ زندگی کے متعلق اعتصام الدین اور میر محمد حسین کی معلومات اور آراء سے واضح طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کے وہاں کے مقامی باشندے غیر تہذیب یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ تھے اور اپنے وسائل سے بے خبر تھے اسی لیے یورپی نوآبادکاروں نے ان

سادہ لوح لوگوں کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنا غلام اور مطیع و فرمانبردار بنایا اور امریکہ کے قدرتی وسائل کو اپنے بروئے کار لاکر نہ صرف اپنی تجارت کو ترقی دی بلکہ امریکہ میں بھی کاشت کاری، تعمیر سازی اور جہاز سازی کے شعبوں کو ترقی دی اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں نظام سیاست متعارف کروایا اور وہاں کے باشندوں کو تعلیم اور شعور دیا۔ امریکہ کے قدیم مقامی باشندوں اور وہاں یورپی نو آباد کاروں کے نو آبادیات قائم کرنے کے بعد امریکہ اور امریکی باشندوں کی حالت میں ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات اور ان کی آراء و تاثرات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے دونوں یورپی علمی و تہذیبی برتری کے تصور کے زیر اثر تھے اور یورپی نو آباد کاروں کے متعلق کسی قسم کے منفی تاثرات نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کے انہوں نے امریکہ کے مقامی باشندوں کے ساتھ یورپی نو آباد کاروں کے نارو ارکھے جانے والے سلوک کے بجائے امریکہ میں یورپی نو آباد کاروں کی بدولت ہونے والی ترقی کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی۔

د۔ پرتگالیوں کی ہندوستان کے سمندری راستہ کی دریافت اور مختلف یورپی اقوام کی ہندوستان آمد اور سرگرمیاں

یورپی عہد دریافت کا ایک اور عظیم کارنامہ یورپیوں کی ہندوستان کے سمندری راستہ کی دریافت تھی۔ جس کی بدولت وہ اس ملک کے ساحلوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ کارنامہ ایک پرتگیزی جہازی واسکوڈے گامانے ایک عرب جہاز ران احمد بن ماجد کی رہنمائی میں جون ۱۴۹۸ء میں سرانجام دیا۔ پرتگالیوں کی اس کامیابی نے نہ صرف ان کے بلکہ بقیہ تمام یورپی اقوام کے ہندوستان کے ساتھ براہ راست تجارت کرنے کے دیرینہ خواب کو پورا کردیا تھا۔ پرتگالی مشرق میں اپنی آمد کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کی تجارت پر چھائے رہے۔ ۱۵۹۵ء تک یورپ کی مختلف اقوام ہندوستانی سامان تجارت اور اجناس کو اپنی ضرورت کے مطابق لزبن سے ہی خریدتی رہیں۔ پرتگالیوں نے ہندوستان میں تجارت کرنے کے سلسلے میں اپنے قیام کے دوران جو تقریباً ایک صدی پر محیط تھا ہندوستان کے چند ایک علاقوں جیسے کے گوا، منگورہ، کوچین، کنانور، نیگاپٹم اور لنکا پر قبضہ ضرور کرلیا مگر وہ یہاں مستقل طور پر اپنا کوئی اقتدار قائم نہ کرسکے اور ان کی ہندوستان میں موجودگی اور تجارت مغلیہ سلطنت کے لئے کسی سنگین خطرہ کا باعث بھی ثابت نہ ہوئی۔ ہاں البتہ سترھویں صدی کے آغاز میں انگریزوں اور ولندیزوں کی ہندوستان آمد اور ہندوستان سے تجارتی سرگرمیوں نے پرتگالیوں کی تجارت اور تجارتی سرگرمیوں کو بہت نقصان پہنچایا اور بہت جلد ہی انگریزوں اور ولندیزوں نے اپنے تجارتی مفاد کے پیش نظر پرتگالیوں کو بحر ہند کے پانیوں سے نکال باہر کیا۔ [۸۳]

ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام الدین نے پرتگالیوں کی ہندوستان کے سمندری راستہ کی دریافت کو ان کی ایک عظیم کامیابی قرار دیا۔ کیونکہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی جو ہندوستان میں اٹھارہویں صدی تک بے شمار تجارتی اور سیاسی کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی ان کا سترھویں صدی میں ہندوستان پہنچنادراصل ہندوستان کے سمندری راستہ کی پرتگالی دریافت کی ہی بدولت ممکن ہو سکا تھا۔ اسی لیے انہوں نے پرتگالیوں کی اس دریافت کو ایک اہم تاریخی واقعہ قرار دیتے ہوئے اپنے سفر نامہ 'شگرف نامۂ ولایت' میں نہ صرف پرتگالیوں کی ہندوستان آمد، ان کی ہندوستان آمد کے اسباب اور ہندوستان میں ان کی سرگرمیوں کے متعلق معلومات فراہم کیں بلکہ پرتگالیوں کی ہندوستان کے بحری راستہ کی دریافت کی بدولت دوسری یورپی اقوام خاص کر انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کے ساتھ ساتھ ملک گیری کے جو مواقع میسر آئے ان کے تاریخی اسباب پر تنقیدی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ بھی پیش کیا۔

منشی اعتصام الدین نے پرتگالیوں کے ہندوستان کے سمندری راستہ کی دریافت کا سبب ان کی ہندوستان سے براہ راست تجارت کرنے کی خواہش کو قرار دیا کیونکہ ان کی رائے میں پرتگالیوں کو ریشم اور افیون جو ان کی مرغوب و مطلوب ہندوستانی مصنوعات تھیں سورت اور گجرات کے تاجروں کی وساطت سے وینس سے مہنگے داموں خریدنا پڑتی تھیں۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کے وہ خود ہندوستان سے براہ راست تجارتی تعلقات استوار کریں۔ مگر اعتصام کی رائے میں قدیم زمانے میں چونکہ 'قبلہ نما' دستیاب نہ تھا اور نہ ہی جہاز ایسے مضبوط اور پائیدار تھے کے سمندر میں دور دراز تک مسافت طے کر سکتے اس لیے دوسری یورپی اقوام کے ساتھ ساتھ پرتگالیوں کی بھی، ہندوستان کے ساتھ براہ راست تجارت کرنے کی خواہش التواء کا شکار تھی۔ اعتصام کی متجسس طبیعت نے اس بات کا کھوج لگانے کی بھی پوری کوشش کی کے آخر پرتگالی ہی کیوں دوسری یورپی اقوام سے پہلے ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہو سکے؟ اعتصام کے عمیق مطالعہ نے انہیں اس حقیقت سے روشناس کرایا کے کمپاس (قبلہ نما) کی دریافت نے اگرچہ یورپیوں کو یہ امید دلائی تھی کے وہ سمندر میں سمتوں کا تعین کر سکیں گے مگر اس وقت تک ان کے پاس ایسے مضبوط بحری جہاز اور بحری آلات موجود نہ تھے جس کی بدولت وہ سمندر میں سلامتی کے ساتھ دور دراز کا سفر طے کر سکتے تھے۔ اعتصام نے ہندوستان کے سمندری راستہ کی تلاش کے سلسلے میں پرتگال کے بادشاہ 'ہنری' جس کا نام اگرچہ انہوں نے براہ راست نہیں لیا مگر پرتگال میں جدید بحری جہازوں کی تیاری اور ہندوستان کی طرف ان کی روانگی کے حوالے سے اس کی کوششوں کو بہت سراہا۔ اعتصام کی رائے میں اگرچہ ہندوستان کے بحری راستہ کو تلاش کرنے کی پرتگالی بحری مہموں میں پرتگال کے بہت سے بحری جہاز تباہ ہوگئے اور کئی پرتگالی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری یہاں تک کے

اپنی انہی کوششوں کی بدولت وہ مقام کاف جسے اعتصام جانتے تھے کے انگریزی میں Cape of Good Hope کہا جاتا تھا پہنچ گئے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ اعتصام نے کچھ یوں بیان کی کے جب پرتگالی مقام کاف تک پہنچ گئے تو انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کے جنوبی دنیا کی سرحد اس مقام سے زیادہ دور نہیں ہے لہذا اب وہ آسانی سے ہندوستان تک پہنچ سکیں گے۔ یہ خبر جب یورپ (فرنگستان) پہنچی تو فرنگی خوشی میں اپنی ٹوپیاں اچھالنے لگے اسی لیے اس مقام کا نام انہوں نے 'کیپ آف گڈ ہوپ' رکھا۔ اعتصام کی معلومات کے مطابق مقام کاف پہنچنے کے نو سال بعد پرتگالی اپنی کوششوں کی بدولت بادشاہ اکبر کے عہد (پندرہویں صدی) میں جزائر مالا بار، سیلون اور پیکو پہنچ گئے۔ مگر حیرت کی بات ہے کے پرتگالیوں کے ہندوستان پہنچنے کے قصے کی پوری روداد میں اعتصام نے پرتگالی بحری مہم کے روح رواں 'واسکوڈے گاما' کا نام کہیں نہیں لیا۔ جس نے پہلے پرتگالی جہاز کو سلامتی کے ساتھ ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر لنگر انداز کیا تھا۔ اعتصام کی رائے میں پرتگالیوں کی ہندوستان آمد کا بنیادی مقصد ہندوستانی مصنوعات جیسے کے ہندوستانی ریشم، کاٹن اور افیون جن کی یورپی منڈیوں میں بہت مانگ تھی کی تجارت کرنا تھا چنانچہ وہ ان مصنوعات کو ہندوستان سے خرید کر یورپی منڈیوں میں مہنگے داموں فروخت کرتے ۔ اس طرح ہندوستانی مصنوعات کی تجارت سے ہونے والے کثیر منافع نے ان کی ہوس و لالچ کو مزید بڑھادیا اور پرتگالی جو پہلے تین سال میں ہندوستان آیا کرتے تھے بعد ازاں دو سال بعد اور پھر متواتر ایک سال بعد آنے لگے اور ان کی توجہ صرف تجارت تک محدود نہ رہی بلکہ یہ ان علاقوں میں جہاں تجارت کرتے تھے کے انتظامی معاملات میں دخل دینے لگے اور ان علاقوں کی مقامی رعایا کو تنگ کرنے لگے۔ جیسے کے منشی اعتصام الدین کی معلومات کے مطابق پرتگالی اکبر کے زمانے میں مالا بار اور سیلون کے جزیروں پر قابض ہو گئے اور وہاں کی مقامی رعایا کو تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ بردہ فروشی کا کام کرنے لگے۔[۸۳] ان کی انہی حرکات کے پیش نظر اکبر انہیں ہندوستان میں رہنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا مگر جہانگیر کے زمانے میں فرنگی اقوام اپنی خوشامدی پالیسیوں اور عجیب و غریب یورپی سوغاتیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے لیے تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس طرح پرتگالیوں نے ہوگلی میں نہ صرف اپنی تجارتی کوٹھی قائم کی بلکہ کلیسا بھی تعمیر کر لیا اور نواب شائستہ خان کی عملداری کے زمانے میں ہوگلی کے فوجدار سے لڑنے جھگڑنے لگے نیز اشیائے خرید و فروخت میں اپنی من مانیاں چلانے لگے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بچوں کو اغوا کر کے سمندر کے دوسرے جزائر پر فروخت کرتے اور اتوار کے دن گھنٹے بجا بجا کر لوگوں کی عبادت اور سکون کے اوقات میں خلل ڈالتے۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق پرتگالی اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے مگر وہ اپنے توپ خانے اور گولوں و بارود کی طاقت کے زعم میں ہوگلی کے فوجدار سے سرکشی کرنے لگے اور اس کے ساتھ

جنگ پر آمادہ ہوئے مگر ہوگلی کے فوجدار کے ایک شاہی منصب دار شکر اللہ خاں کی بہادری اور عقلمندی کی بدولت پرتگالیوں کو ہوگلی سے نکلنا پڑا اور وہ جزائر سیلون اور مالا بار کی طرف بھاگ نکلے۔اس طرح ابتداء میں جزائر مالا بار اور سیلون اُن کے جائے مسکن بنے اور بعد ازاں یہ لوگ مدراس، تمبتی اور پانڈیچری میں آباد ہو گئے۔ مگر پرتگالیوں کی سرکشی اور تجارتی عروج زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔اعتصام کی رائے میں چونکہ یہ قوم بہت سرکش ہو چکی تھی اور مخلوقِ خدا پر ظلم ڈھاتی تھی اس لیے خدا کے قہر کا شکار ہوئی۔ وہ اس طرح کے پرتگال میں ایک زبردست زلزلہ آیا اور ان لوگوں کا تمام مال و اسباب اور سامانِ تجارت پانی میں غرق ہو گیا۔ اس تباہی کے بعد پرتگال کا بادشاہ بہت کمزور ہو گیا۔[۵۵] جیسا کہ تاریخی مطالعات بھی اس حوالے سے ہمیں جو معلومات و رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق پرتگالی قوم کے زوال کے باعث ۱۵۸۰ء میں سپین کے بادشاہ فلپ دوم نے پرتگال پر قبضہ کر لیا تھا۔ دوسری طرف سترھویں صدی کے شروع میں انگریزوں اور ولندیزیوں کے بحرِ ہند کے پانیوں میں داخل ہونے کے بعد پرتگالیوں کا تجارتی طلسم بھی ٹوٹ گیا اور ان دونوں یورپی اقوام نے انہیں بحرِ ہند سے نکال باہر کیا۔[۵۶]

پرتگالیوں کے بعد دوسری یورپی اقوام کیونکر ہندوستان پہنچیں اور ہندوستان میں انہوں نے خاص طور پر انگریزوں نے اپنی تجارتی حیثیت کو کس طرح مستحکم کیا؟اعتصام الدین اس حوالے سے اپنے مطالعہ کی بنیاد پر کافی معلومات رکھتے تھے۔ چنانچہ اعتصام کی رائے میں پرتگالیوں کو ہندوستانی مصنوعات کی یورپی منڈیوں میں تجارت سے حاصل ہونے والے منافع نے دوسری یورپی اقوام کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا کی کے وہ بھی ہندوستان سے براہ راست تجارت کریں۔اعتصام کی معلومات کے مطابق پرتگالیوں کی تحریر کردہ وہ کتابیں جس میں ہندوستان تک کے بحری راستوں کے نقشے بنائے گئے تھے نیز ان میں ہندوستان کی مختلف خصوصیات بھی درج کی گئیں تھیں بہت جلد پورے یورپ میں مشہور ہو گئیں۔یہی کتب دراصل دوسری یورپی اقوام جیسے کے ولندیزوں،انگریزوں، جرمنوں اور فرانسیسیوں کے ہندوستان پہنچنے میں ان کی مددگار اور معاون ثابت ہوئیں۔ پرتگالیوں کی تحریر کردہ کتب سے غالبا اعتصام کی مراد واسکوڈے گاما اور اس کے ساتھیوں کی سفری احوال اور ہندوستان سے متعلق معلومات پر مبنی ڈائریاں تھیں۔

اعتصام کی رائے میں مختلف یورپی اقوام نے ہندوستان آمد کے بعد مختلف شہروں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں جیسے کے انگریزوں نے پہلی کوٹھی کہول گھاٹ میں قائم کی۔ اسی طرح جرمنوں نے نواب گنج، ولندیزیوں نے چرچرہ اور ڈنمارک نے سیر امپور میں اپنی کوٹھیاں قائم کیں۔ ان اقوام میں منشی اعتصام الدین نے جرمنوں کے ہندوستان سے فرار ہونے نیز انگریزوں کے ہندوستان کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لینے کا مختصر حال بھی بیان کیا۔ منشی

اعتصام الدین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جرمن قوم نے اپنے ہندوستان قیام کے دوران ہوگلی کے فوجدار سے نواب علی وردی خاں مہابت جنگ کے زمانے میں سرکشی کی۔

نواب کے بخشی جعفر علی خاں اور جرمن قوم کے درمیان چھ ماہ تک لڑائی جاری رہی۔ آخرکار جرمن ثابت قدم نہ رہ سکے اور اپنے جہازوں پر سوار ہو کر فرار ہو گئے اور دوبارہ کبھی ہندوستان نہ آئے۔

پرتگالیوں اور جرمنوں کے برعکس انگریزوں کی ہندوستان میں تجارت چمکنے کے اسباب کے متعلق منشی اعتصام الدین نے جو معلومات فراہم کیں اُن کے مطابق انگریزوں نے اپنی ابتدائی کوٹھی اگرچہ کھول گھاٹ میں ہوگلی کے قلعہ کے قریب بنائی تھی مگر ناقوس بجانے اور دوسری نامناسب حرکات کی وجہ سے ان کے اور ہوگلی کے فوجدار کے درمیان مخالفت پیدا ہو گئی۔ یہاں انگریزوں کے حوالے سے یہ بات دلچسپی اور غور و فکر کی بھی حامل ہے کہ منشی اعتصام الدین نے پرتگالی قوم کی ہندوستان میں نامناسب حرکات اور سرگرمیوں کے متعلق تو شگرف نامہ میں قدرے تفصیل سے بیان کیا مگر انگریزوں کی نامناسب حرکات و سرگرمیاں بیان کرنے سے گریز کیا۔ منشی اعتصام الدین کی معلومات کے مطابق ہوگلی کے فوجدار کے انگریزوں سے تنازعہ کی بنا پر اُس نے انگریزوں کو کھول گھاٹ چھوڑنے کا حکم دیا اور انگریزوں نے (پرتگالیوں کی طرح) بجائے مزید لڑنے جھگڑنے کے مفاہمانہ پالیسی اپناتے ہوئے ہوگلی کے فوجدار کے حکم کی تابعداری کی اور مسٹر چانک جو اس وقت کوٹھی کا گورنر تھا، اس نے بعد ازاں جس علاقے کو کوٹھی کے لیے منتخب کیا وہ اسی کے نام چانک سے منسوب ہو گیا۔ چانک کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے منشی اعتصام الدین نے خود پر مسلط برطانوی نوآبادکاروں کو بلند حوصلہ اور عالی ہمت قرار دیا جنہوں نے صلح کل کا طریقہ اپنا کر قوموں میں ہر دل عزیزی حاصل کی۔[۸۷]

اعتصام الدین نے شگرف نامہ میں انگریزوں کی طرف سے اختیار کردہ کچھ ایسی مفاہمانہ تدابیر کی نشاندہی بھی کی جنہیں اختیار کر کے وہ نہ صرف اورنگ زیب عالمگیر کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئے بلکہ انہوں نے عالمگیر سے کمپنی کے تجارتی محصول معاف کرانے نیز دیگر مراعات حاصل کرنے کی سند بھی حاصل کی۔ مثلاً اعتصام کی معلومات کی مطابق اورنگ زیب عالمگیر جب دکن میں گولکنڈہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا تو طویل قیام کی وجہ سے اس کا فوجی ساز و سامان اور غذائی اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی۔ اُس وقت مسٹر چانک غلے سے بھرا ہوا جہاز کلکتہ سے لے کر دکن پہنچا نیز اس نے قلعہ فتح کرنے کے لیے اورنگ زیب کو کچھ ایسی تدابیر بھی بتائیں جن کی بدولت قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔ اس طرح ان خدمات کے صلے میں اورنگ زیب نے کمپنی کو چالیس بیگہ زمین کوٹھی کے لیے عطا کی اور کمپنی نے اپنے تجارتی محصول معاف ہونے کی سند بھی حاصل کی اور کلکتہ میں اپنی کوٹھی قائم کی۔[۸۸] مگر اعتصام کے لیے یقیناً یہ بات

باعث حیرت تھی کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے سترھویں صدی میں خالصتاً تجارتی کمپنی کی حیثیت سے ہندوستان میں اپنے تجارتی سفر کا آغاز کیا تھا اور جو اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں اپنی تجارت چمکانے کے لیے اس کی خوشامدیں کر رہی تھی آخر کیسے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد محض پچاس سال کے اندر اندر نہ صرف ایک مضبوط سیاسی قوت بن گئی بلکہ بنگال، بہار اور اوڑیسہ جیسے اہم صوبوں کے دیوانی حقوق حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آدھے ہندوستان پر بھی قابض ہو گئی۔ اٹھارہویں صدی میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ و تجزیہ نے اعتصام پر یہ بات واضح کی کہ عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں پیدا ہونے والے انتشار اور مغل بادشاہوں کی تعیش پرستی اور کردار کی کمزوری ہی دراصل ہندوستان میں انگریزوں کے غلبہ حاصل کر لینے کا سبب بنی۔ اس حوالے سے انہوں نے محمد شاہ کے عہدِ حکومت کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بھی بنایا اور ایسے اسباب و محرکات کی نشاندہی کی جن کی بدولت یورپی اقوام ہندوستان میں نہ صرف اپنی من مانیاں کرنے لگیں بلکہ سیاسی مداخلت بھی کرنے لگیں۔ منشی اعتصام الدین کی معلومات اور تجزیہ کے مطابق محمد شاہ ایک عیاش بادشاہ تھا جو دن رات عیش و عشرت کی محفلوں میں مگن رہتا تھا۔ ملک کے نظم وضبط کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس کے زمانے میں بھانڈوں اور ناچنے والوں کا بازار گرم تھا اور ہر طرف انہی کا راج تھا۔ ان حالات کے پیش نظر امراء اور شرفاء نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور ملک میں فوجی بھرتی کا نظام سست پڑ گیا تھا۔ بادشاہ کی تعیش پرستی اور کردار کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے معتمدین نے بغاوت اور سرکشی کی روش اختیار کر لی تھی۔ ان حالات میں یورپی اقوام نے صوبوں کے ناظموں اور فوجداروں سے مل کر ہر جگہ سازشوں کا جال پھیلا دیا تھا۔ اعتصام کی رائے میں مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کی اسی تعیش پرستی، غرور و تکبر اور ناعاقبت اندیشی نے انگریزوں کو جو ایک تجارتی کوٹھی قائم کرنے کے لیے بھی زمین کے محتاج تھے، آدھے ہندوستان کا مالک بنا دیا۔[۵۹]

یوں اعتصام الدین کی یورپی اقوام خاص کر پرتگالیوں، جرمنوں اور انگریزوں کے ہندوستان آنے، ان کی سرگرمیوں اور انگریزوں کی ہندوستان میں بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت اور غلبہ کے متعلق فراہم کردہ تاریخی معلومات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ یورپی اقوام بظاہر ہندوستان تجارتی مقاصد کی غرض سے ہی آئی تھیں مگر ان کے نوآبادکارانہ عزائم بھی ہمیشہ سے ہی ان کے ساتھ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے دورِ حکومت تک اس کی مستحکم پالیسیوں کے تحت اپنے عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے مگر اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں پیدا ہونے والے سیاسی انتشار اور بادشاہوں کی ناعاقبت اندیشی نے انہیں اور خاص طور

پر انگریزوں کو اپنی طاقت اور منظم نوآبادکارانہ حکمت عملیوں کی بنا پر ہندوستان پر غاصبانہ قبضے اور نوآبادیات قائم کرنے کے مواقع فراہم کیے۔

۵۔ جنوب ایشیائی سفر ناموں میں ہندوستانی ابتدائی نوآبادیاتی صورت حال کے اہم حقائق: نوآبادیاتی تجزیاتی مطالعہ

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں کی اہمیت صرف یہی نہیں ہے کہ یہ اٹھارہویں صدی کے ابتدائی نوآبادیاتی باشندوں کے یورپ کے متعلق معلومات، برطانوی نوآبادکاروں اور چند دیگر یورپی اقوام و ممالک کے براہِ راست مشاہدات پر مبنی معلومات کے ابتدائی ماخذات ہیں بلکہ یہ سفر نامے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی صورتِ حال کے چند تلخ حقائق پر مبنی تاریخی دستاویزات بھی ہیں جبکہ یہ دستاویزات تیار کرنے والے اس دور کے عینی شاھدین تھے۔

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور جنگ بکسر (۱۷۶۴ء) ہندوستان کے ساتھ ساتھ انگلستان کی تاریخ میں بھی میں خاص اہمیت رکھتی ہیں کیوں ان جنگوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح کے بعد ۱۷۶۵ء میں مغل بادشاہ 'شاہ عالم' کی طرف سے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیئے گئے۔ ان علاقوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی زرکشی اور تجارتی لوٹ کھسوٹ نے بنگال کو کنگال جب کے انگلستان کو خوشحال بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل بنگال کے قصبوں کے ہی رہائشی تھے اور ان کے سفر یورپ اختیار کرنے سے پہلے ہی کمپنی کو بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق حاصل ہو چکے تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کے ان کے سفر یورپ اختیار کرنے کا سبب ہی بنگال کی دیوانی کے حقوق کمپنی کو مل جانے کے بعد بنگال میں پیدا ہونے والے حالات بنے۔ اعتصام الدین دراصل جنگ بکسر اور معاہدہ الہ آباد کے عینی شاہد تھے۔ اسی طرح منشی اسماعیل بنگال میں رونما ہونے والے قحط (۱۷۶۹ء-۱۷۷۳ء) اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کے چشم دید گواہ تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کے شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے جنگ بکسر اور معاہدہ الہ آباد کی تفصیل اور حقائق جب کے تاریخ جدید میں منشی اسماعیل نے قحط بنگال جیسے اہم تاریخی واقعات کو قلمبند کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اس لیے ہمارے یہ جاننا اہم بھی ہے اور دلچسپی کا حامل بھی کے ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے نوآبادیاتی باشندوں کی حیثیت سے بنگال کی تاریخ کے ان اہم واقعات کے حوالے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپ میں یورپی (برطانوی) نوآبادکاروں کے کردار اور سرگرمیوں کے متعلق کس قسم کی آراء و تاثرات کا اظہار کیا۔

نو آباد کار جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ کسی خطے میں اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے نو آبادیاتی صورتِ حال کو مسلط کرتا ہے۔ وہ اس صورتِ حال کو مسلط کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرتا ہے۔ جیسا کے فینن نے کہا تھا کے نو آباد کار، نو آبادیاتی باشندوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے اور انہیں اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے ہتھیاروں کا استعمال کرتا ہے اور پولیس چوکیاں اور فوجی چھاؤنیاں بناتا ہے۔[90] ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوٹھیاں ہندوستان میں دراصل برطانوی نو آباد کاروں کے فوجی اڈوں کا کردار نبھا رہی تھیں اور فوج اور فوجی ساز و سامان سے لیس تھیں۔ اسی لیے کمپنی یکے بعد دیگرے اپنی طاقت کے استعمال اور مقامی باشندوں سے ساز باز کر کے ہندوستانی حکمرانوں اور نوابوں کو بے بس کرتی ہوئی مختلف علاقوں اور صوبوں پر قابض ہوتی چلی جا رہی تھی۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک مغل بادشاہ شاہ عالم اور دوسرے حکمران ہندوستان میں کمپنی کی فوجی قوت و طاقت کے سامنے کس قدر بے بس ہو چکے تھے اس کا اندازہ منشی اعتصام الدین کے سفر نامے میں موجود معاہدہ الٰہ آباد کی تفصیل سے لگایا جا سکتا ہے جو منشی صاحب کے دعویٰ کے مطابق خود انہوں نے ہی تحریر کیا تھا۔ شنگرف نامہ میں جنگ بکسر اور معاہدہ الٰہ آباد کی تفصیل دراصل اسے بنگال اور اودھ کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ بھی بناتی ہے۔

جنگ بکسر اور معاہدہ الٰہ آباد کے حوالے سے جو معلومات شنگرف نامہ میں ملتی ہیں ان کے مطابق شجاع الدولہ اور مرہٹوں نے جب مل کر کوڑا جہاں آباد پر لشکر کشی کی تو جنرل کارناک نے شیوراج پور کے گھاٹ سے گنگا کو عبور کر کے ان کا مقابلہ کیا۔ اس طرح اس جنگ میں شجاع الدولہ اور ملہار اؤ مرہٹہ کی متفقہ فوج کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد شجاع الدولہ نے انگریزوں سے صلح کی بات چیت کی اور شاہ عالم سے خلعت حاصل کر کے الٰہ آباد کے قلعہ میں داخل ہوا۔ شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے یہ دعویٰ کیا کے وہ جنگ بکسر اور معاہدہ الہ آباد کے چشم دید گواہ تھے کیوں کے وہ اس وقت جنرل کارناک کے میر منشی کی حیثیت سے فرائض منصبی انجام دے رہے تھے جب اس کی زیر کمان انگریزی افواج نے کوڑا جہاں آباد میں شجاع الدولہ اور مرہٹوں کی متفقہ فوج کو شکست دی تھی۔ اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق انہوں نے مسٹر ولسٹرٹ کی ایماء پر ایک اور منشی محمد معز کے ہمراہ انگریزوں اور شجاع الدولہ کے درمیان صلح و صفائی کے بعد جو معاہدے طے پائے ان کے مسودے بھی تیار کیے تھے۔[91] چنانچہ شنگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے معاہدہ الٰہ آباد کی تفصیل و حقائق بیان کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔[92]

شنگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے نہ صرف معاہدہ الٰہ آباد کے متعلق اہم تاریخی معلومات فراہم

کیں بلکہ بکسر کی جنگ میں شکست کے بعد شاہ عالم کی حالتِ زار اور بے بسی کی وہ تصویر بھی دکھائی کہ جس میں خود ہندوستان کا بادشاہ اپنی جان کی امان اور تحفظ کے پیشِ نظر لارڈ کلائیو سے انگریزی فوج کی مدد مانگ رہا تھا تا کہ وہ بحفاظت دہلی تک پہنچ سکے مگر کلائیو نے بغیر بادشاہ انگلستان کی اجازت کے فوجی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے اس شاہی مہم کے حقائق کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں جو درحقیقت ان کے سفر یورپ اختیار کرنے کا سبب بنی تھی۔ اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جنگ بکسر میں شکست کے بعد کلائیو کی بغیر بادشاہ انگلستان کی اجازت کے بادشاہ شاہ عالم کو دہلی تک بحفاظت پہنچانے کے لیے انگریزی فوج کی مدد دینے سے انکار پر شاہ عالم نے اپنے دو وزرا منیر الدولہ اور راجہ شتاب رائے کی مشاورت سے بادشاہ انگلستان کے نام انگریزی فوج کی مدد کے حصول اور دہلی جا کر ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کے انتظام کو سنبھالنے کی خاطر خط تحریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طے کر کے نواب منیر الدولہ اور راجہ شتاب رائے لارڈ کلائیو کے ہمراہ کلکتہ گئے اور وہاں دوسرے ممبران کونسل کو مطلع کیے بغیر بادشاہ شاہ عالم کی طرف سے انگلستان کے بادشاہ 'جارج سوم' کے نام خط تحریر کیا گیا۔ اس خط کے ہمراہ ایک لاکھ روپیہ اور کچھ تحائف بھی بادشاہ انگلستان کی خدمت میں بھجوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کپتان سوینٹن کو بطور ایلچی مقرر کر کے خط ان کے حوالے کیا گیا اور ان کے ساتھ اعتصام الدین کو بطور مددگار اور فارسی دان منشی منتخب کیا گیا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اعتصام الدین ۱۰ جنوری ۱۷۶۷ء کو کلکتہ سے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے مگر دو سال اور نو ماہ بعد لارڈ کلائیو کی شاہ عالم سے مکاری اور غداری کے باعث اپنے مقصد میں ناکام ہو کر وطن واپس لوٹ آئے۔ اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ہوا کچھ یوں کہ کلائیو نے کپتان سوینٹن سے ایک لاکھ روپیہ، تحائف اور خط یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیے کہ جب وہ آئندہ سال انگلستان جائے گا تو خط اور نظرانہ خود بادشاہ انگلستان کی خدمت میں پیش کر دے گا۔ منشی اعتصام الدین کو یہ خبر کپتان سوینٹن کی زبانی سفر شروع ہو جانے کے بعد ملی جو سفر یورپ اور قیام یورپ کے دوران ان کے لیے پریشانی اور افسردگی کا باعث بنی رہی۔ مگر اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق کلائیو جب انگلستان پہنچا تو اس نے شاہ عالم کا خط بادشاہ انگلستان تک نہ پہنچایا اور ایک لاکھ روپیہ اور تحائف اپنی جانب سے ملکہ انگلستان کی خدمت میں پیش کر کے اس کی خوشنودی حاصل کی۔ [۹۳] اعتصام الدین نے اپنے سفر نامے میں اگرچہ ان تاریخی واقعات کو بیان کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی نو آبادکارانہ لوٹ کھسوٹ اور خاص طور پر کلائیو کی مغل دشمنی پر سے پردہ تو اٹھایا مگر حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے کلائیو کی شاہ عالم سے مکاری پر اس کے متعلق چند مزمتی جملے تک تحریر نہ کیے۔

بہر حال شنگرف نامہ میں بیان کردہ یہ تاریخی و سیاسی حقائق ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں کہ انگریز (نوآبادکار) تو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہی اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر بادشاہِ ہندوستان کو سیاسی طور پر مغلوب کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

نوآبادیاتی نظام جیسا کے ہم جانتے ہیں کے اپنے اندر دو دنیاؤں کو تشکیل دیتا ہے جس میں نوآبادکار کی دنیا ظاہر ہے کہ اسی کی طرح اعلیٰ، بہترین اور حسین ہوتی ہے جبکہ نوآبادیاتی باشندوں کی دنیا انہی کی طرح ادنیٰ، کمتر اور بدترین ہوتی ہے جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات جیسے کے روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ نایاب ہوتی ہیں۔ [۹۴] اس حوالے سے اگر ہم نوآبادیاتی عہد میں تحریر کیے گئے ادب اور تاریخی کتب کا بغور مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نوآبادکار دراصل خود ایسے حالات پیدا کرتا ہے کہ ان میں اور نوآبادیاتی باشندوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز کبھی ختم نہ ہو سکے یعنی وہ نوآبادیاتی باشندوں کو سیاسی طور پر مغلوب کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں معاشی و اقتصادی بدحالی میں بھی مبتلا کر دیتا ہے اور زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم رکھتا ہے تاکہ وہ ان کے حصول کے لیے نوآبادکاروں کے در کے گداگر بنے رہیں مگر نوآبادیاتی باشندوں میں سے اکثر کو اس حقیقت کا ادراک نہیں ہو پاتا کہ یہ دراصل نوآبادکاروں کی ہی چال ہے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگریزوں کی بنگال کے اثاثوں پر لوٹ کھسوٹ اور ناقص انتظامی پالیسیوں کے تحت ۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۳ء تک ایک بدترین قحط پیدا ہوا جس نے لاکھوں انسانوں کو لقمۂ اجل بنایا۔ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اسماعیل نے اپنے سفر نامے تاریخِ جدید میں ایک نوآبادیاتی باشندے کی حیثیت سے اس قحط کے متعلق جو معلومات و حقائق بیان کیے وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ منشی اسماعیل نے اپنی سادگی کے پیشِ نظر بارش نہ ہونے اور ہندوستانی لوگوں کے اعمالِ بد کو قحط کے اسباب قرار دیا۔ اُن کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق قحط کے زمانے میں غربا اور مساکین بھوکوں مرنے لگے جبکہ شرفاء کو بھی غلہ مہنگے داموں یعنی ایک روپے کا تین سیر اور وہ بھی کیڑے مکوڑوں سے آلودہ بمشکل دستیاب ہونے لگا۔ بنگال کے لاکھوں لوگوں کی طرح منشی اسماعیل اور ان کا گھرانہ بھی اس قحط سے متاثر ہوا اور انہوں نے اس زمانے میں اپنے گھر کی قیمتی اشیاء جیسے کے سونے، چاندی کے زیورات، قیمتی برتن اور قالین وغیرہ بیچ کر گزارا کیا۔ [۹۵] مگر منشی اسماعیل کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق قحط کے زمانے میں انگریزوں یا اُن کی سرکار میں ملازمت کرنے والے لوگوں کی حالت کا جائزہ لیا جائے تو ایک طرح سے متضاد صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ منشی اسماعیل کے مطابق ایسے لوگ جو انگریز سرکار کی ملازمت میں تھے وہ اشیائے خورد و نوش کی ارزاں قیمتوں اور عدم دستیابی کے فکر و فاقے سے محفوظ رہے۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

انگریز صاحبان بڑے نوکر پرور واقع ہوئے ہیں اور اپنے ملازموں کی فلاح وبہبود کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں جیسا کہ قحط کے سال کے حوالے سے میں نے خود اپنی آنکھ سے ایک چٹھی دیکھی اور گرد و پیش سے بھی یہ بات سنی گئی تھی کہ جب تک غلہ بہ مہنگا رہا، نوکروں کو پندرہ آثار فی روپیہ کے حساب سے سرکار چاول دیتی رہی اور یوں ملازمانِ سرکار، بدبختی اور پریشان حالی کے زمانے میں بھی ان آفات سے محفوظ رہے۔ اس طرح سرکار کے تمام ملازم فکر و فاقہ سے آزاد ہیں اور حتی المقدور خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں اور سرور و شادمانی ان کا نصیب ہے حسبِ حال یہی ہے کہ میں بھی سرکار کے نوکروں کی صف میں شامل ہو جاؤں۔ [۹۶]

یعنی منشی اسماعیل نے کسی طور پر بھی انگریزوں یا ان کی انتظامی پالیسیوں کو قحط کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جبکہ تاریخی کتب کے مطالعہ سے ہمیں یہ بات سند کے طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بنگال کے دیوانی حقوق مل جانے کے بعد وہاں کمپنی کی بنگال کے اثاثوں پر لوٹ کھسوٹ اور ناقص انتظامی پالیسیاں ہی دراصل بنگال اور بہار کے ۱۷۷۰ء کے قحط کا باعث بنیں اور اس قحط کے باعث بنگال کی ایک تہائی آبادی بھوک و افلاس کی نظر ہو گئی اور ظلم تو یہ ہوا کہ سب سے زیادہ مصیبت کا شکار وہی علاقے ہوئے جو سب سے زیادہ زرخیز تھے مگر چند سالوں سے انگریزی تسلط میں تھے اور ان کی ہوس کا شکار تھے۔[۹۷] منشی اسماعیل کے برعکس باری علیگ اپنی کتاب **کمپنی کی حکومت** میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی قحط کے زمانے میں اختیار کردہ سنگ دلی کا حال کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

کمپنی کے ملازموں نے انسانی نعشوں کے اوپر کھڑے ہو کر محاصل اور مالیہ کا مطالبہ کیا۔ بربریت کی تاریخ میں اس سے زیادہ خوں چکاں حوادث کا ملنا امر محال ہے۔ کمپنی کے فلک بوس گوداموں کے سائے میں لوگ دانے دانے کو تڑپ کر مر گئے لیکن کمپنی نے گوداموں کو بدستور مقفل رکھا۔[۹۸]

اس صورت حال کے پیشِ نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں یعنی قحط کے زمانے میں کمپنی کے مقفل زدہ گودام صرف ان نوآبادیاتی باشندوں کے لیے کھولے گئے جنہوں نے اس کی حاکیت تسلیم کی، غلام ہوئے اور اس کے معاون و مددگار ہوئے۔ منشی اسماعیل کی طرح منشی اعتصام الدین کے سفر نامے میں بھی ہمیں معاشی تنگی اور حالات کا رونا ملتا ہے جیسے کے منشی اعتصام الدین خود اس بارے میں لکھتے ہیں کہ

مجھ ناچیز کو اپنی معاشی ضرورت کے باعث ملک انگلینڈ کے سفر کا اتفاق پیش آیا۔ ۱۰۹۹ ہجری میں جب میرا دل پراگندہ اور طبیعت بہت پریشان تھی اور انقلاب روزگار نے معاشی بدحالی میں مبتلا کر دیا تھا، میرے ہوش و حواس کا پرندہ دماغ کے محل سے اڑ گیا تھا اور عقل ماؤف ہو گئی تھی۔[۹۹]

ہمارے دونوں سفر نامہ نگاروں نے بنگال کے معاشی مسائل اور قحط کے اصل اسباب بیان کرنے سے صرف نظر کیا۔ منشی اسماعیل کے سفر نامے کا زیادہ تر حصہ اگرچہ ان کی معاشی مشکلات اور قحط کے مسائل کا احاطہ کرتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ انگریزوں کی نوکر پروری اور قصیدہ خوانی میں بھی رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مسٹر ڈیوڈ اینڈرسن جو بنگال کی نظامت کے معاملات کی ترجمہ نویسی پر مامور تھے، کے ہاں عارضی طور پر ان کے منشی کی حیثیت سے فرائض منصبی سرانجام دے رہے تھے۔ اس طرح اعتصام الدین بھی عرصہ دراز سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ تھے۔ اس لیے ایسا نہیں ہو سکتا کہ دونوں سفر نامہ نگاروں کو بنگال میں انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی سرگرمیوں جیسے کے بھاری بھر کم ٹیکسوں، زمینوں کی نیلامی، دیسی تاجروں کے کاروبار ختم کر کے کمپنی کی تجارت کو چمکانے کے متعلق علم نہ ہو۔ ہمارے سفر نامہ نگار چونکہ کمپنی کے اہلکاروں کی ملازمت میں تھے اور بنگال پر کمپنی کا تسلط بھی قائم تھا اس لیے انہوں نے شاید مصلحتاً اور ارادتاً انگریزوں کی بنگال میں ان سرگرمیوں کا ذکر نہیں کیا جو بنگال کی معاشی و اقتصادی بدحالی کا باعث بن رہیں تھیں۔ علاوہ ازیں ان جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامہ نگاروں کے ہاں ایسٹ انڈیا کمپنی یا اس کے اہلکاروں کے متعلق کسی منفی رائے یا نفرت انگیز تاثرات کا اظہار بھی نہیں کیا گیا جو دراصل ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی دور میں برطانوی نوآبادکاروں اور ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان نسبتاً کم پیچیدہ نوآبادیاتی تعلقات کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ مائیکل ایچ فشر(Michael H.Fisher)، "Early Asian Travellers to the West: Indians in Britain, C.1600-C.1850"، *World History Connected*(تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۵، ۲۰۱۹ء)، ص، ا۔
http://worldhistoryconnected.press.uillinois.edu>

۲۔ مائیکل ایچ فشر(Michael H.Fisher)، *Counterflows to Colonialism: Indian Travellers and settlers in Britain 1600-1857*،(دہلی: پرمانینٹ بلیک، ۲۰۰۴ء)، ص ۵۷۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۰۲۔

۴۔ مائیکل ایچ فشر، From Indian to England and Back: Early Indian Travel Narratives for Indian Readers Huntington Library Quarterly، پنسلوینیا: یونیورسٹی آف پنسلوینیا پریس، جلد ۷، نمبر ۱(۲۰۰۷)، ص ۱۶۰۔
http://www.jstore.org/stable/10.1525/hlq.2007.70.1.153

۵۔ ایضاً، ص، ۱۶۰۔۱۶۱۔

۶۔ نجیبہ عارف، *The West in South Asian Muslim Discourse- A study of Indian Muslim's Travel to the west 1757-1857*، جرنل آف انڈولوجی اینڈ ساؤتھ ایشین سٹڈیز، شمارہ ۳۰(۲۰۱۳ء)، ص ۳۳۔

۷۔ مرزاابوطالب اصفہانی، سفر نامہ فرنگ مترجم ثروت علی(نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۷۔۱۸۔

۸۔ نجیبہ عارف، "اٹھارہویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ رُوس وچین"، باز یافت، شمارہ ۲۵ (۲۰۱۴ء)، ص ۵۴۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ "Mape Of European Russia",Europe Nations Online Project (تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۵، ۲۰۱۹ء)، http://www.nationsonline.org>europe....

۱۱۔ نجیبہ عارف، "اٹھارہویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ رُوس وچین"، باز یافت، ص ۵

۱۲۔ امیر حسن نورانی، تعارف شگرف نامہ ولایت از منشی اعتصام الدین، مترجم امیر حسن نورانی(پٹنہ: خدابخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵)، ص، ایک۔

۱۳۔ نجیبہ عارف، "اٹھارھویں صدی کاایک نادر سفر نامہ روس وچین"،باز یافت، ص۵۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص۶۷۔

۱۵۔ محمد عبداللہ، "سفر نامہ روس وچین"، مترجم نجیبہ عارف، بازیافت، شمارہ ۲۵ (۲۰۱۴)ص۶۶۔

۱۶۔ نجیبہ عارف، *The West in South Asian Muslim Discourse- A study of Indian Muslim's Travel to the west 1757-1857*،ایضا،ص۲۶۔

۱۷۔ نجیبہ عارف، "جنوبی ایشیاء میں اولین سفر نامہ انگلستان: تاریخ جدید"، بنیاد، شمارہ ۵ (۲۰۱۴ء)، ص۱۱۹۔

۱۸۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف نے پروفیسر پیٹر مارشل کی مسٹر گرانٹ کے حوالے سے پیش کردہ تحقیق کے ذریعے یہ وضاحت پیش کی ہے کہ سفر نامہ میں مسٹر گرانٹ سے مراد جیمز گرانٹ ہے جو Grant the informer کے نام سے مشہور تھے جبکہ انہی دنوں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک اور گرانٹ صاحب بھی موجود تھے مگر ان کا پورا نام چارلس گرانٹ تھا۔ چارلس گرانٹ ۱۷۷۱ء میں ہندوستان چلے گئے تھے جبکہ ۱۷۷۴ء میں وہ دوبارہ ہندوستان (کلکتہ) آگئے۔ مسٹر جیمز گرانٹ نامی شخص ۱۷۷۲ء میں ہندوستان سے چلا گیا تھا اور ہندوستان واپسی کے لیے وہ اسی یورپا نامی جہاز پر سوار تھا جس جہاز میں منشی اسماعیل نے بھی ہندوستان واپسی کا سفر طے کیا۔

نجیبہ عارف، جنوبی ایشیا میں اولین سفر نامہ انگلستان، ایضاً، ص۱۳۴۔

۱۹۔ سائمن ڈگبی، An eighteenth century Narrative of a journey-from Bengal toEngland: Munshi Ismail's New history"، *Urdu and Muslim South Asia* مرتب کرسٹوفر شیکل (Christopher Shackle)(لندن: سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، ۱۹۸۹ء)، ص۶۱۔

۲۰۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، مترجم جواد ہمدانی، بنیاد، شمارہ ۵ (۲۰۱۴ء)، ص۱۴۳۔

۲۱۔ ایضاً، ص۱۳۷۔۱۳۸۔

۲۲۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۲۳۔ ڈگبی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق مسٹر کلاڈ رسل نے انڈیا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت اپنی ملازمت کا آغاز قلعہ سینٹ جارج، مدراس چھاؤنی سے کیا۔ ۱۷۶۵ء میں وہ فورٹ ولیم کلکتہ میں تعینات کر دیے گئے۔ پھر ۱۷۷۰ء میں انہیں کلکتہ کا اکاؤنٹنٹ اور کلکٹر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۷۷۱ء میں انہیں دوبارہ سینٹ جارج جانے کا حکم ملا مگر خرابی صحت کے باعث انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور یورپ چلے گئے۔ انہیں امید تھی کہ یورپ سے واپسی پر انہیں پھر سے کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔

سائمن ڈگبی، ایضاً، ص۵۴۔

۲۴۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، بنیاد، ایضا، ص۵۴۔

۲۵۔ منشی اسماعیل نے اُس بحری جہاز کا نام اپنے سفر نامے میں نہیں بتایا جس پر وہ انگلستان کے سفر کی غرض سے سوار ہوئے تھے،

البتہ ڈگبی نے منشی اسماعیل کے سفر نامے سے متعلق اپنے تحریر کردہ مقالے "An Eighteenth century narrative of a journey from Bengal to England: Munshi Ismail's New history" میں اس جہاز کا نام مورس (Morse) لکھا ہے۔

سائمن ڈگبی، ایضاً، ص ۵۶۔

۲۶۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، بنیاد، ایضا، ص ۱۵۱۔۱۴۷۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۴۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۶۳۔۱۶۴۔

۳۰۔ سائمن ڈگبی، An eighteenth century Narrative of a journey from Bengal to England: Munshi Ismail's New history"، *Urdu and Muslim South Asia*، ایضا، ص ۶۰۔

۳۱۔ منشی اعتصام الدین، شنگرف نامۂ ولایت ۱۷۶۷ء۔۱۷۶۹ء، ص ۲۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۔۵۔

۳۴۔ اعتصام الدین نے اپنے سفر نامہ شنگرف نامۂ ولایت میں کپتان سوینٹن کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں اُن کے مطابق سوینٹن، اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے اور علم طب سے واقفیت رکھتے تھے انہوں نے انسانی جسم کے اعضاء واندرونی نظام سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ایک شخص کو قتل کرڈالا اور پھر فرار ہو کر جزیرہ ملائی میں پناہ گزیں ہوئے۔ اس جزیرہ پر بھی کافی عرصہ تک وہ لوگوں کے علاج معالجہ میں مصروف رہے۔ بعدازاں وہاں سے پہلے مدراس اور پھر کلائیو کے ہمراہ کلکتہ چلے گئے۔ اس کے بعد وہ عظیم آباد میں فوج کے کپتان مقرر ہوئے اور جنرل کارناک کے ساتھ کئی لڑائیوں میں شرکت کرتے رہے اور انعامات وخطابات سے نوازے جاتے رہے۔ میجر آدم کی ماتحتی میں قاسم علی کی جنگ عظیم آباد میں حصہ لیا جبکہ جنرل کارناک کے ساتھ کوڑا جہاں آباد اور کالپی کی جنگ میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ انگریزوں اور شجاع الدولہ کے درمیان جنگ کے بعد صلح وصفائی کے معاملات میں جنرل کارناک کے مشیر رہے اور آخر کار شاہ عالم کا خط دے کر ولایت بھیجے گئے۔

منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص ۱۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۔۶۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۶۔۷۔

۳۷۔ میر محمد حسین لندنی، مشاہدات فرنگ، مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی (لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، سن ندارد)، ص ۱۷۶۔

۳۸۔ گلشاں خاں، *Indian Muslim Perception of the west during the Eighteenth Century*(پی۔ایچ۔ڈی۔مقالہ، یونیورسٹی آف آکسفورڈ،۱۹۹۳ء)، ص۱۰۷۔

۳۹۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی، مقدمہ مشاہدات فرنگ،از میر محمد حسین مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی (لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد)، ص۱۷۷۔

۴۰۔ غلام ہمدانی مصحفی، عقدِ ثریا (تذکرہ فارسی گویاں) مرتب شہاب الدین ثاقب (علی گڑھ: مسلم ایجوکیشنل پریس، ۲۰۱۲ء)، ص۲۹۷۔

۴۱۔ گلشاں خاں، *Indian Muslim Perception of the west during the Eighteenth Century*، ص۱۰۷۔

۴۲۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی، مقدمہ مشاہدات فرنگ،از میر محمد حسین مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی ،ایضاً، ص۱۷۹۔۱۸۰۔

۴۳۔ گلشاں خاں، *Indian Muslim Perceptions of the west during the Eighteenth Century*، ص۱۰۸۔

۴۴۔ میر محمد حسین لندنی،مشاہدات فرنگ ،ایضا، ص۲۲۶۔

۴۵۔ مظہر محمود شیرانی، تعارف مشاہدات فرنگ میر محمد حسین، مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی(لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد) ، ص۹۔۱۰۔

۴۶۔ حکیم سید محمود احمد برکاتی، مقدمہ مشاہدات فرنگ،از میر محمد حسین مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی ،ایضاً، ص۱۸۵۔

۴۷۔ ایضاً ، ص۱۸۲۔

۴۸۔ محمد عبداللہ، "سفر نامہ روس وچین"،باز یافت، ص۶۱۔

۴۹۔ ایضاً، ص۶۲۔

۵۰۔ ایضاً، ص۶۳۔

۵۱۔ "The founding of St. Petersburg, Russia"، U Mass Boston، (تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۷، ۲۰۱۹ء)، blogs.umb.edu>buildingtheworld

۵۲۔ "Saint Petersburg" ,Wikipedia تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۰۱۹، ۲۰، en.m.wikipedia.org

۵۳۔ نجیبہ عارف، "اٹھارہویں صدی کاایک نادر سفر نامہ روس وچین"،باز یافت، ص۴۷۔

۵۴۔ ایضاً، ص۵۵۔

۵۵۔ گلشاں خاں، *Indian Muslim Perceptions of the west during the*

Century Eighteenth، ص ۱۳۳ ۔

۵۶۔ نجیبہ عارف، The West in South Asian Muslim Discourse- A study of Indian Muslim's Travel to the west 1757-1857، ایضا، ص ۲۴۔

۵۷۔ گلفشاں خان، European Polities At The Close Of The Eighteenth Century: Indian Perspective Of The West", Indian History Congress,vol.52(1991),p.333
http://www.jstore.org/stable/44142602

۵۸۔ گلفشاں خان، Indian Muslim Perception of the West ، ص، ۱۳۳۔

۵۹۔ منشی اعتصام الدین، شگرف نامہ و لایت، ایضا، ص ۱۷۷۔

۶۰۔ میر محمد حسین لندنی، مشاہدات فرنگ، ص، ۲۲۷۔۲۲۸۔

۶۱۔ منشی اعتصام الدین، شگرف نامہ و لایت ، ص، ۷۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۷۵۔۷۶

۶۳۔ میر محمد حسین، مشاہدات فرنگ، ص، ۲۳۰

۶۴۔ شگرف نامہ ولایت، ص، ۷۶

۶۵۔ میر محمد حسین، ص، ۲۲۸۔۲۲۹

۶۶۔ ایضاً، ص۔ ۲۳۱

۶۷۔ ایضاً، ۲۳۴۔۲۳۷

۶۸۔ منشی اعتصام الدین، ص، ۱۱۸

۶۹۔ "Europe and the age of Exploration"Heilbrunn Time line Of The Art History, تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۰۱۹، ۲۰۲۰ء
www.metmuseum.org>toah>expl>hd-ex

۷۰۔ منشی اعتصام الدین، شگرف نامہ ولایت، ص۔ ۱۱۷۔

۷۱۔ میر محمد حسین، مشاہدات فرنگ، ص، ۲۳۱۔

۷۲۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۱۱۸۔

۷۳۔ ایضاً، ص، ۹۔

۷۴۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۳۱۔۲۳۲۔

۷۵۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۱۱۸۔

۷۶۔ ایضاً، ص، ۱۱۹۔

۷۷۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص،۲۳۲۔

۷۸۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۱۲۰۔

۷۹۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص،۲۳۳۔

۸۰۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۱۲۰۔

۸۱۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص،۲۳۲۔

۸۲۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۱۲۱۔

۸۳۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۳۷ء)، ص،۳۵۔

۸۴۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۹۔۱۰۔

۸۵۔ ایضاً، ص،۱۱۔۱۲۔

۸۶۔ باری علیگ، ایضاً، ص،۳۵۔

۸۷۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۱۳۔۱۴

۸۸۔ ایضاً، ص،۱۳۔

۸۹۔ ایضاً، ص،۱۱

۹۰۔ فرانز فینن، افتادگان خاک، مترجم سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۲۔۳۷۔

۹۱۔ منشی اعتصام الدین ،ایضاً، ص،۴۔

۹۲۔ ایضاً

۹۳۔ معاہدہ الہ آباد کی تفصیل جاننے کے لیے دیکھیے منشی اعتصام الدین، شگرف نامہ ولایت، مترجمہ امیر حسن نورانی، خدا بخش اور ینٹل لائبریری پٹنہ، ص،۵۔۶۔

۹۴۔ فرانز فینن، افتادگان خاک، ایضاً، ص ۳۲۔۳۳۔

۹۵۔ منشی اسماعیل، تاریخ جدید، ایضاً، ۱۳۸۔۱۴۳۔

۹۶۔ ایضاً، ص،۱۴۰۔

۹۷۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی، تاریخ جنگِ آزادی ہند ۱۸۵۷ء (لاہور: بُک پبلشرز، ۲۰۰۷ء)، ص،۱۱۱

۹۸۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، ایضاً، ص،۱۳۵۔

۹۹۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۲۔

باب سوم

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں مشاہدات و تاثرات انگلستان: نو آبادیاتی مطالعہ

باب سوم:

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں مشاہدات وتاثرات

انگلستان: نوآبادیاتی مطالعہ

ا۔اٹھارہویں صدی کا نصف آخر، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت اور جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کا سفر یورپ

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں تجارتی سفر ۱۶۰۸ء میں سورت میں ایک فیکٹری کے قیام سے شروع ہوا اور صرف سات سال بعد ہی سر طامس رو اپنی بہترین سفارتی پالیسیوں کی بدولت جہانگیر کو متاثر کرنے اور کمپنی کے لیے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔یوں کچھ عرصہ میں ہی کمپنی کی کوٹھیاں ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے کہ احمد آباد، برہان پور، اجمیر، آگرہ اور کھمبات وغیرہ میں قائم ہو گئیں۔ابتداً کمپنی کی زیادہ تر توجہ ہندوستان میں اپنی تجارتی سرگرمیوں اور ان سے حاصل ہونے والے کثیر منافع پر ہی رہی۔[۱] مگر اٹھارہویں صدی کے ابتدائی عشرہ میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد جب ہندوستان کی مرکزی حکومت انتشار و خلفشار کا شکار اس طرح ہونے لگی کہ بیرونی حملہ آور (نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی) آزادانہ لوٹ مار کرنے لگے، مقامی باغی قوتیں (مرہٹے، سکھ اور جاٹ وغیرہ) مرکز سے بغاوت کرنے لگیں، صوبے اور ریاستیں اپنی اپنی خودمختاری کا اعلان کرکے بادشاہ کو نذرانہ اور خراج دینے سے انکار کرنے لگے اور آپس کی جنگوں میں یورپی اقوام (انگریزوں اور فرانسیسیوں) سے مدد حاصل کرنے لگے تو ان حالات میں کمپنی کو ہندوستان میں اپنی نوآبادیات قائم کرنے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ ان آثار کے حقیقت میں بدلنے کا گمان کمپنی کو اس وقت ہوا جب ارکاٹ کی مشہور لڑائی میں انگریزی فریق محمد علی کا پلڑا اس کے بالمقابل فرانسیسی حریف پر بھاری رہا۔اس جنگ میں کمپنی کی افواج کی شرکت اور فتح کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف کمپنی کا حوصلہ بلند ہوا بلکہ ہندوستانی نوابوں کی افواج کی ہیبت اور خوف بھی ان کے دلوں سے جاتا رہا اور اپنی پسند کے حکمرانوں کو تخت وتاج پر بٹھا کر اپنے لیے مراعات حاصل کرنا خود کمپنی کے لیے سود مند رہا۔اس طرح ابتداً کرناٹک کی ریاست سے دولت کی لوٹ کھسوٹ کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے کمپنی کو اتنا لطف اور نفع پہنچایا کہ وہ بہت جلد ہی بنگال، بہار اور اوڑیسہ جیسے بڑے اور اہم صوبوں میں کمپنی راج قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوئی۔[۲] اس طرح

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں ہندوستان میں دواہم جنگیں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ پلاسی جو ۱۷۵۷ء میں انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ میں انگریزی کمپنی کی فتح نے ہندوستانی حکمرانوں کو یہ باور کرادیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اب محض ایک تجارتی کمپنی نہیں رہی بلکہ ایک مضبوط سیاسی قوت کی حیثیت بھی حاصل کرچکی ہے۔[۳] جنگِ پلاسی میں فتح کے بعد بقول محمد طفیل:

"فورٹ ولیم میں سونے کا مینہ برسنے لگا۔ میر جعفر کی طرف سے تین لاکھ پونڈ یعنی تیس لاکھ روپیہ کلائیو کو نذر دیا گیا اور کلکتہ کا جنوبی علاقہ اسے جاگیر میں دیا گیا جس کی آمدنی دس لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔ اسی طرح ساٹھ ہزار پونڈ یعنی چھ لاکھ روپیہ کونسل کے ممبروں کو پیش کیا گیا۔ یہ تو ذاتی انعامات تھے۔ کمپنی کے خرچہ اور تاوان کے مطالبات ان سے الگ تھے جن کو اس وقت پورا کرنے کی گنجائش خزانہ میں نہ تھی اس لیے صرف نصف کی ادائیگی ہو سکی، چوبیس پرگنہ کا علاقہ کمپنی کی جاگیر ٹھہرا۔"[۴]

اس طرح پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) میں فتح حاصل کرکے کمپنی نے اپنی خالصتاً تجارتی حیثیت تبدیل کرکے ایک مضبوط سیاسی قوت کی حیثیت حاصل کرنے کا سفر تقریباً ڈیڑھ سو سال میں طے کرلیا۔

۱۷۶۴ء میں کمپنی کی افواج کی مغل شہنشاہ شاہ عالم اور بنگال اور اودھ کے نوابوں کی متفقہ افواج کے درمیان جنگ بکسر لڑی گئی جس میں انگریزی کمپنی کو فتح حاصل ہوئی اور اس کے بعد ۱۷۶۵ء میں الہٰ آباد کا مشہور صلح نامہ جسے ہمارے ایک سفر نامہ نگار منشی اعتصام الدین نے ہی تحریر کیا تھا طے پایا۔ اس معاہدے کے تحت بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق کمپنی کو مل گئے۔ اس کے بعد کمپنی نے لارڈ ویلزلی کے عہد میں اپنے ملک گیری کے عزائم کا رخ گورکھ پور، روہیل کھنڈ اور جنوبی دوآبہ کے علاقوں کی طرف موڑا اور ان پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ ان کامیابیوں کے بعد آخرکار کمپنی جنوبی ہند میں اپنے مضبوط ترین سیاسی حریف سلطان ٹیپو کو شکست دینے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ یوں اٹھارہویں صدی کا نصف آخر کمپنی کی ایک سیاسی قوت کی حیثیت سے حاصل کردہ کامیابیوں کے حوالے سے بہت اہم رہا اور کئی اہم صوبے اور ریاستیں کمپنی کے زیرِ تسلط آگئیں۔[۵]

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) اور جنگ بکسر (۱۷۶۴ء) میں کمپنی کی فتح اور ۱۷۶۵ء میں کمپنی کو شاہ عالم کی طرف سے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق مل جانا ہندوستان اور انگلستان کی سیاسی تاریخ کے اہم واقعات تو ہیں ہی مگر ان صوبوں کی دیوانی کے حقوق مل جانے کے بعد کمپنی کی ان کے اثاثوں پر تجارتی لوٹ کھسوٹ، زرکشی اور ناقص انتظامی پالیسیوں نے ہندوستان اور انگلستان کے معاشی واقتصادی حالات بھی یکسر بدل کر رکھ دیئے۔ بقول سید مصطفیٰ رضوی:

بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے حقوق حاصل کرتے ہی کمپنی نے ان کا لگان پہلے ہی سال (۶۶۔۱۷۶۵ء) میں دوگنا یعنی سترہ لاکھ چالیس ہزار پونڈ کر دیا جو کے پہلے آٹھ لاکھ گیارہ ہزار تھا۔ جنگ پلاسی کے بعد سے ہی یہ لوٹ انگلستان کو سیراب کرنے لگی، وہاں کا مشہور صنعتی انقلاب اسی کا نتیجہ تھا اور ایک سرسری اندازے کے مطابق تیس چالیس سال کے عرصے میں ہندوستان سے پندرہ عرب روپیہ انگلینڈ جا چکا تھا۔[۶]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں بنگال، بہار اور اوڑیسہ کی دیوانی کے حقوق کمپنی کو مل جانے کے بعد دراصل ہندوستانی تجارت اور معیشت کی تباہ حالی جب کے انگلستان کی معاشی و اقتصادی خوشحالی کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ انگلستان اٹھارہویں صدی کے اختتام تک اپنے معاشی و اقتصادی خوشحالی کے دور میں تمام یورپی طاقتوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی نوآبادیاتی طاقت بن چکا تھا۔[۷] اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے اپنے تمام یورپی حریفوں کو ہندوستان کی تجارت اور سیاست سے بے دخل کرنے میں بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ یوں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر یعنی ہندوستان میں برطانوی ابتدائی نوآبادیاتی دور میں انگلستان ہی بحیثیت مجموعی یورپ کا نمائندہ تصور کیا جانے لگا اور اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

اس دور میں ہندوستانی باشندوں خاص کر کمپنی کے زیرِ تسلط علاقوں، ریاستوں اور صوبوں کے اشرافیہ میں مختلف مقاصد کے تحت انگلستان جانے نیز وہاں کی تہذیب و تمدن، سائنسی ایجادات و ترقی اور دیگر موضوعات کے متعلق نہ صرف معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی لی گئی بلکہ ان معلومات کو تحریری طور پر قلمبند کرنے کا رجحان بھی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے ہی ہندوستانی اشرافیہ اور متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ افراد میں باقاعدہ طور پر رواج پایا۔

یوں تو ہماری ہندوستانی اشرافیہ کلکتہ میں برطانوی زندگی کا کسی حد تک مشاہدہ کر چکی تھی مگر جو معلومات براہِ راست مشاہدہ سے حاصل ہوئیں وہ یقیناً ہندوستانی پس منظر رکھنے والوں کے لیے نئی تھیں۔ ہمارے لیے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتی کہ یورپ کا سفر کرنے والے ہمارے ابتدائی سفر نامہ نگاروں کا تعلق بنگال اور اودھ سے تھا جہاں ان سفر نامہ نگاروں کے یورپ کا سفر اختیار کرنے سے پہلے ہی کمپنی راج قائم ہو چکا تھا اور یہ سفر نامہ نگار کمپنی کے اہلکاروں کی ماتحتی میں عارضی نوعیت کی ملازمتیں بھی انجام دے رہے تھے۔ ہمارے ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین جنگ بکسر اور معاہدہ الہ آباد کے چشم دید گواہ تھے اور خود ان کے دعوی کے مطابق معاہدہ الہ

آباد کو تحریر کرنے والے بھی وہ خود ہی تھے۔ اسی طرح منشی اسماعیل بنگال میں ۱۷۷۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص انتظامی پالیسیوں کی وجہ سے رونما ہونے والے قحط اور اس کی ہولناکیوں کے چشم دید گواہ تھے۔ ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں بنگال کی تاریخ کے ان اہم واقعات کا تذکرہ بھی کیا مگر حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے بنگال میں انگریزوں کی تجارتی لوٹ کھسوٹ اور زرکشی پر مبنی سرگرمیوں کے متعلق نہ تو کوئی خاص معلومات فراہم کیں اور نہ ہی انہیں تنقید کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں اپنی ذاتی زندگی کے جو حالات و واقعات بیان کیے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال کی دیوانی کے حقوق کمپنی کو مل جانے کے بعد وہاں پیدا ہونے والے معاشی و اقتصادی بحران کا شکار بنگال کی عام آبادی کی طرح ہمارے یہ دونوں سفر نامہ نگار بھی ہوئے اور انہوں نے اپنے معاشی و مالی حالات کو بہتر بنانے کی خاطر ہی سفر یورپ اختیار کیا تھا۔ دراصل ہمارے ان سفر نامہ نگاروں نے جب سفر یورپ اختیار کیا تھا اور اس کے متعلق اپنے سفر نامے تحریر کیے تھے تب بنگال میں انگریزوں کا سکہ چل رہا تھا اور بنگال کے نوابوں کی حیثیت محض کٹھ پتلی حکمرانوں کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ بنگال کا اصل اقتدار برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں تھا اور وہ بہت طاقتور بھی تھی۔ ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کو بھی بنگال میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر رسوخ اور فوجی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا اور وہ ان کی طاقت سے مرعوب و متاثر بھی تھے شاید اسی وجہ سے انہوں نے بنگال میں انگریزوں کی دولت کی لوٹ کھسوٹ پر مبنی سرگرمیاں اور حقائق بیان کرنے سے قدرے گریز کیا۔ اس طرح ہمارے تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دراصل ایک ایسے دور میں ہندوستان سے برطانیہ کی طرف سفر اختیار کیا تھا جب ہندوستان کی سیاست اور معیشت مجموعی طور پر اور بنگال کی سیاست اور معیشت بالخصوص زوال کے سفر کی طرف گامزن ہو چکی تھی جب کہ برطانیہ میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ صنعتی انقلاب کا زمانہ تھا۔

فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید کے نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ اہم نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یورپی نوآبادیاتی نظام اپنے اندر چونکہ یورپی مرکزیت کا تصور لیے ہوتا ہے اس لیے نوآبادکار اور ان کی تہذیب و تمدن، زبان، ثقافت، مذہب، نظام سیاست غرض کہ ہر شے اپنے اندر اعلیٰ و ارفع کا تصور لیے ہوتی ہے۔ جب کہ نوآبادیاتی باشندوں کی تہذیب و تمدن، زبان، ثقافت غرض کہ ہر شے اپنے اندر ادنیٰ اور کمتر کا تصور لیے ہوتی ہے۔ مگر یورپی مرکزیت اور برتری کا تصور نوآبادیاتی باشندوں پر مختلف طرح سے اثر انداز ہوتا ہے اور ان کے اندر مختلف رویوں (انجذابی، بغاوتی اور آفاقی) کو جنم دیتا ہے۔ یعنی نوآبادیاتی باشندے یا تو

یورپی نوآبادکاروں کی اعلیٰ و برتر حیثیت کو قبول کر کے ان کی تہذیب و ثقافت کا انجذاب کرتے ہیں اور ان کی اطاعت اختیار کرتے ہیں، یا وہ ان کی اعلیٰ و برتر حیثیت اور غاصبانہ قبضے کو رد کرتے ہوئے ان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں یا پھر آفاقیت کے نقطہ نظر کے تحت اپنی تہذیبی و ثقافتی شناخت کھوئے بغیر نوآبادکاروں کی تہذیب و ثقافت کے اعلیٰ عناصر کو سراہتے ہیں اور ان سے فیض و اکتساب حاصل کرتے ہیں۔ مگر نوآبادیاتی باشندے ان میں سے چاہے جو رویہ بھی اختیار کر لیں وہ نہ تو نوآبادکار کے ہم پلہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی نوآبادکار کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت کو ختم کر سکتے ہیں کیونکہ نوآبادیاتی صورت حال نوآبادکار کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت کی متقاضی ہوتی ہے اس لیے نوآبادکار نوآبادیاتی نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے 'اعلیٰ' و 'ادنیٰ' کی تمیز کو کبھی ختم نہیں ہونے دیتا۔[۸] اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کو دراصل ہندوستان کی تاریخ کے ایک ایسے دور میں برطانوی نوآبادکاروں کی حقیقی دنیا 'انگلستان' کو براہ راست دیکھنے کا موقع ملا تھا جب پورا ہندوستان ابھی برطانوی نوآبادی میں شامل نہیں ہوا تھا یعنی کچھ حصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سامراجیت کا شکار ہو چکا تھا جب کے بقیہ حصہ ابھی نام کو ہی سہی مگر مغلیہ اقتدار کے حکمرانوں کی ملکیت میں تھا اور انگریزوں کے سامراجی تسلط سے چھٹکارا پانے کی کچھ امیدیں ابھی باقی تھیں مگر بنگال میں بہر حال اس دور میں انگریزوں کی نوآبادکارانہ سرگرمیاں اور تجارتی لوٹ کھسوٹ اپنے عروج پر تھی۔ اس لیے ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں تحریر کیے گئے سفر نامے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سفر ناموں میں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے اپنی اپنی دلچسپی کے تحت برطانوی و دیگر یورپی زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً بحری سفر کا جدید یورپی نظام، یورپی تہذیب و تمدن،، ثقافت، رسوم و رواج، مادی ترقی، نظام سیاست، سائنسی ترقی اور مذہب وغیرہ پر اپنے مشاہدات و تاثرات کو اپنے سفر ناموں میں قلمبند کیا۔ یہ جاننے کے لیے کے ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں ہمارے یہ سفر نامہ نگار یورپی مرکزیت اور برطانوی نوآبادکاروں کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت کے تصور سے کس قدر متاثر تھے اور انہوں نے برطانوی و دیگر یورپی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مشاہدات و معلومات کے حوالے سے کس قسم کی آراء و تاثرات اور رویوں کا اظہار کیا؟ ہم نوآبادیاتی صورت حال کے نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سفر ناموں کے تحقیقی و تنقیدی جائزہ کی طرف بڑھیں گے۔ اس باب میں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے بحری سفر کے مشاہدات و تجربات اور برطانوی مادی و صنعتی ترقی اور معاشرتی و سماجی زندگی جیسے کچھ عمومی پہلوؤں کے حوالے سے ان کے پیش کردہ مشاہدات و تاثرات کا نوآبادیاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا جب کے آئندہ باب میں برطانوی و دیگر یورپی زندگی کے اہم پہلوؤں (مذہب، نظام

سیاست، سائنسی ترقی اور مستشرقیت) پر جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے پیش کردہ مشاہدات اور تصورات و تاثرات کا نوآبادیاتی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ یورپی بحری سفر کے مشاہدات واحوال

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے لیے یورپ کا بحری سفر یقیناً ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا اور ان کے سفر ناموں میں بحری سفر کے متعلق بیان کردہ ان کے مشاہدات و تاثرات سے بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کے انہوں نے یورپ کا بحری سفر اختیار کرنے سے پہلے اتنا طویل بحری سفر زندگی میں پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اسماعیل کے حوالے سے خاص طور پر یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کے طویل بحری سفر کے حوالے سے وہ روایتی ہندوستانی سوچ کے اسیر دکھائی دیئے جس میں سفر کو اور خاص طور پر بحری سفر کو تکلیف دہ اور خطرات سے بھرپور ایک سرگرمی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ منشی اسماعیل کی فراہم کردہ ان معلومات سے ہوتا ہے کے مسٹر کلاڈرسل سے پہلے ایک اور انگریز صاحب نے بھی انہیں اپنے ساتھ انگلستان جانے کی پیش کش کی تھی مگر انہیں اپنوں کی دوری کے ساتھ ساتھ چونکہ طویل بحری سفر کا خوف بھی لاحق تھا اس لیے انہوں نے انگلستان جانے سے انکار کر دیا۔ مسٹر کلاڈرسل کے ہمراہ جاتے ہوئے بھی اگرچہ انہیں اسی قسم کے خوف لاحق تھے مگر بے روزگاری اور بھوک سے مرنے کا خوف طویل بحری سفر کے خوف پر غالب آگیا اور آخرکار انہیں یہ طویل بحری سفر اختیار کرنا پڑا۔[9]

جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کے حوالے سے خاص طور پر یہ بات توجہ کی حامل ہے کے انہوں نے یورپی خاص کر برطانوی بحری جہازوں اور جہاز رانی کے جدید نظام کو بہت سراہا۔ منشی اعتصام الدین کے ساتھ ساتھ میر محمد حسین نے بھی تمام یورپی اقوام میں برطانوی قوم کو خاص طور پر جہاز رانی کا ماہر قرار دیا۔[10] شگرف نامہ میں انگریزوں کی جہاز رانی کے طریقہ کار کی تعریف کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے واقعات درج کیے گئے ہیں جو برطانوی قوم کی جہاز رانی میں مہارت نیز سمندری طوفانوں اور خطرات سے نمٹنے کی صلاحیت پر دلالت کرتے ہیں۔ منشی اعتصام الدین نے ان واقعات کو جن کا ماخذ و منبع یقیناً کپتان سوینٹن، دوسرے انگریز مسافران یا جہاز کے خلاصی تھے بیان کرنے کے بعد ان سے برطانوی قوم کی جہاز رانی میں مہارت کے حوالے جو نتائج اخذ کیے وہ یقیناً حیران کر دینے والے ہیں۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق:

انگلستان کے لوگ فن جہاز رانی میں اپنی مہارت کے باعث سب کی رہنمائی کرتے ہیں اور یہ مشکل اور خطروں سے بھرے ہوئے کام اپنی ہمت اور جرات سے انجام دیتے ہیں۔ یہ کام اسی قوم کے دم سے پورے ہوتے ہیں۔ کسی دوسری قوم کے بس کی بات نہیں ہے۔ [۱۱]

شگرف نامہ میں بحری سفر کے احوال کے بعض واقعات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود انگریزوں اور کمپنی کے اہلکاروں کو نہ صرف اپنی جہاز رانی اور بحری جہازوں پر فخر تھا بلکہ وہ اس کا کھلم کھلا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو منشی اعتصام الدین نے شگرف نامہ میں قلمبند کیا۔ اعتصام الدین کے مطابق انگلستان کے بحری سفر کے دوران مخالف سمندری ہوا کی وجہ سے جب ان کا بحری جہاز ڈگمگانے لگا اور انہیں یوں محسوس ہوا کہ شاید جہاز ڈوبنے والا ہے تو انہوں نے اپنے اس اندیشہ کا اظہار کپتان سوینٹن سے کیا تو اس پر جو جواب اسکاٹش النسل کپتان سوینٹن نے اعتصام کو دیا اس میں یقیناً ایک یورپی نو آباد کار کی طاقت کے غرور کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے:

کپتان سوینٹن نے کہا کہ یہ تمہارے ملک کی کشتی نہیں ہے کہ ڈوب جائے۔ [۱۲]

کپتان سوینٹن کا یہ جواب بلاشبہ ہندوستانی بحری جہازوں پر انگریزی بحری جہازوں کی مضبوطی اور تکنیکی ترقی و برتری کے تفاخر کا احساس لیے ہوئے تھا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کی طرف سفر کرنے والے ابتدائی فارسی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور مرزا ابو طالب کے حوالے سے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں یورپ کے بحری سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات نیز سمندری جزائر اور سمندری عجائبات و مخلوقات کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان سے یورپ جانے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی مگر عام تعلیم یافتہ افراد یورپ والوں کے حالات جاننے کے ساتھ ساتھ بحری سفر اور سمندری عجائبات و مخلوقات کے متعلق معلومات حاصل کرنے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جیسے کہ اعتصام نے اپنے سفر نامے کی تالیف کا سبب اپنے اعزاء و اقارب کے اصرار اور خواہش کو قرار دیا تا کہ وہ ان کو یورپ کے سفر اور خطہ یورپ کے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کر سکیں۔ [۱۳]

اٹھارہویں صدی کے تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین میں سے منشی اعتصام الدین نے یورپ کی طرف کیے جانے والے بحری سفر کے حالات اور مشاہدات و تجربات کو سب سے زیادہ تفصیل اور دلچسپی سے بیان کیا اور اپنے قارئین کو قبلہ نما یعنی کمپاس کی ایجاد، اس کی بدولت سمندر میں سمتوں

کے تعین میں سہولت کے ساتھ ساتھ جہازوں کی قسموں، جہازوں کے درجات اور ہوا کی قسموں اور ان کے فوائد و نقصانات کو تکنیکی نقطۂ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے بیان کیا نیز سمندری جزائر اور سمندری مخلوقات و عجائب کے متعلق دلچسپ اور انوکھی معلومات فراہم کرنے میں بھی دلچسپی لی۔ جب کے منشی اسماعیل کے بحری سفر کے مشاہدات واحوال چند ایک سمندری جزائر اور سفر کے دوران پیش آنے والے چند ایک دلچسپ واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ان دونوں سفر نامہ نگاروں کے برعکس میر محمد حسین کے ہاں یورپی بحری سفر کے مشاہدات واحوال بیان کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی گئی۔

شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین کی بحری جہازوں کی مختلف اقسام، بناوٹ اور اسٹائل کے متعلق فراہم کردہ معلومات جدید یورپی خاص کر برطانوی بحری جہازوں میں ان کی دلچسپی اور ان کے عمیق مشاہدہ پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً اعتصام الدین کی جہازوں کی مختلف اقسام کے متعلق فراہم کردہ معلومات کے مطابق ایک بادبان والے جہاز کو سلف، دو بادبانوں والے جہاز کو غراب جبکہ چھ بادبان والے کو جہاز کہا جاتا تھا۔ جہاز کے نیچے کی لکڑی جو بہت مضبوط ہوتی تھی ڈول کہلاتی تھی اور شدید طوفان میں بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔ جب کے ڈول کے اوپر درمیانی لکڑی ڈول سے پتلی ہوتی تھی اور ٹوٹ بھی جاتی تھی۔ اس لیے جہاز کے عملے کے لوگ جب آسمان پر طوفان کے آثار دیکھتے تھے تو تمام بلند بادبانوں کو نیچے کر دیتے تھے یہ دراصل طوفان سے بچنے کی ایک حکمت عملی ہوا کرتی تھی۔ [۳۱]

منشی اعتصام الدین کو اس بات کا پورا شعور تھا کے قدیم زمانے میں قبلہ نما جسے وہ جانتے تھے کے انگریزی میں 'کمپاس' کہا جاتا ہے کی دریافت نے جب سمندروں میں سمت شناسی کی امید دلائی تو یورپیوں نے جہاز سازی کی صنعت اور جہاز سازی کے جدید طریقوں کو متعارف اور استعمال کرنے کی طرف خاص توجہ دی اور اسی کی بدولت یورپی (عہد دریافت میں) دنیا کے دور دراز خطوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ منشی اعتصام الدین کو جہاز سازی کے علاوہ جہاز رانی کے جدید انگریزی طریقہ کار نے بھی بے حد متاثر کیا۔ برطانوی بحری جہاز، جہاز رانی میں جو جدید آلات واشیاء استعمال کر رہے تھے ان میں اعتصام نے صرف کمپاس اور ان کتابوں کی نشاندہی کی جن میں ان کی معلومات کے مطابق برطانوی جہاز سمندر میں آنے جانے کے راستوں کا حال اور نقشے وغیرہ بنا کر درج کرتے تھے۔ ان کتابوں سے اعتصام کی مراد غالباً پائلٹ بکس(pilot books)اور لوگ بکس(log books) تھیں جن کی انگریزی اصطلاحات سے وہ شاید واقف نہ تھے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں کمپاس، لاگ بکس، اور پائلٹ بکس کے استعمال کی مدد سے انگریزی جہاز رانی کے جدید طریقہ کار کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے منشی اعتصام الدین لکھتے ہیں :

اس وقت کمپاس کے اطراف اور جوانب کے خطوط کو دیکھ کر جہازوں کی آمدورفت کا پتہ چلایا جاتا ہے اور آنے جانے کے راستوں کا تعین کرتے ہیں اور ان کے نقشے بنا کر پورا حال کتابوں میں درج کرتے ہیں۔ اس طرح جو معلومات پہلے لوگ لکھ گئے ہیں ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنے تجربات لکھتے ہیں۔ ان ہی کی مدد سے یہ بتا سکتے ہیں کہ اس جگہ سے فلاں مقام کتنے میل دور ہے اور وہاں تک کتنے دنوں میں پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کام میں یہ لوگ کمال رکھتے ہیں.... قصہ مختصر یہ کہ جہاز کا کپتان اور اس کے نائب باری باری جہاز کے پتوار کے قریب رہتے ہیں اور کمپاس و جہاز کے اگلے گوشے پر خاص نظر رکھتے ہیں تاکہ بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہو جائے اور حالتِ اعتدال میں ایک گورہ ملازم اس چرخی کو گھماتا ہے جس پر بادبانوں کو گردش دینے والی رسی لپٹی ہوتی ہے اور تیز و تند طوفان کے وقت دو چرخیوں کو مضبوط پکڑ کر سیدھا گھماتے ہیں اس وقت کپتان اور اس کے نائب ہر لحہ کمپاس کے خط کا نام لیتے ہیں تاکہ پتوار کو سیدھی سمت مضبوط پکڑیں اور بال برابر بھی غلطی نہ کریں۔ اس طریقہ پر جہاز رات دن چلتا ہے۔[۱۵]

انگریزی بحری جہازوں اور جہاز رانی کے نظام کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ منشی اعتصام الدین نے سمندر کے سفر کے دوران آنے والے بے شمار جزائر میں سے چند ایک جزائر جیسے کہ جزیرہ موریشئس، مندیلہ، پیکو، مالدیپ، بلکاس، مالا بار، سیلون، مردم خوار، کاف، سامون، سنبلہ اور جزیرہ فاکر کے متعلق مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کیں۔ یہ معلومات ان جزائر کے جغرافیائی اور زمینی و سیاسی حالات، وہاں آباد باشندوں کی وضع و قطع خوراک، لباس، مذہب، زبان اور رسم و رواج کا احاطہ کرتی ہیں۔ منشی اعتصام الدین نے سمندر کے بحری سفر کے دوران ان میں سے بعض سمندری جزائر جیسے کے جزیرہ موریشئس، کاف اور سامون کا وہاں بحری جہاز کے لنگر انداز ہونے کی بنا پر براہِ راست مشاہدہ کیا تھا۔ جب کے باقی جزائر کے متعلق اعتصام کی معلومات کے ماخذات شیخ جمال الدین حسین انجو کی کتاب 'روضتہ الطاہرین' انگریز مسافران مسٹر مجمندری چک نار لیک، مسٹر کرنیکل اور جہاز کے خلاصی وغیرہ تھے۔[۱۶] اعتصام کے لیے یہ بات باعث حیرانی تھی کے ہندوستان سے یورپ تک کے بحری سفر میں آنے والے بہت سے آباد اور غیر آباد جزائر ایسے تھے جنہیں یورپیوں نے اپنی نو آبادیوں میں شامل کر لیا تھا اور وہاں اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً اعتصام کی معلومات کے مطابق جزیرہ موریشئس فرانسیسیوں، جزیرہ کاف ولندیزوں اور ولایت مغرب (ویسٹ انڈیز) انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ جزیرہ سنبلہ کو اعتصام کی معلومات کے مطابق انگریزوں نے آباد کیا تھا جب کے جزیرہ فاکر اور بعض دوسرے جزائر پر پرتگال کی حکومت قائم تھی۔ اعتصام اپنے وسیع مطالعہ اور دانشورانہ سوچ کے باعث یورپیوں کے جارحانہ اور توسیع پسندانہ رجحان کے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے تھے اور اس حقیقت

سے بخوبی آگاہ تھے کے یورپی عہد دریافت میں مختلف یورپی بادشاہوں نے بحری مہموں کا آغاز دراصل اسی غرض اور خواہش کے تحت کیا تھا تاکے سمندر کے دور دراز جزیروں اور ان جانے خطوں کو تلاش اور تسخیر کر کے ان کی نادر و نایاب اشیاء کی تجارت سے فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ اعتصام کی معلومات کے مطابق اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف یورپی طاقتوں نے سمندر کے آباد جزائر میں بسنے والی جاہل و جنگلی اقوام کو اپنی طاقت اور شان و شوکت سے اپنا مطیع و فرمانبردار بنایا۔ جب کے غیر آباد جزائر کو بنگال اور حبش وغیرہ سے خریدے گئے غلاموں سے آباد کیا اور ان کی مدد سے وہاں کاشت کاری اور تعمیر سازی کو ترقی دی۔[۷] یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کے اعتصام کو اس بات کا ادراک تھا کے یورپی اقوام نے اپنی علمی و سائنسی ترقی کی اور جدید آلات حرب کی بدولت ہی دنیا کی غیر ترقی یافتہ اقوام کو مغلوب کیا تھا۔

اعتصام نے سمندر کے بحری سفر کے دوران آنے والے چند ایک جزائر کے متعلق ایسی عجیب اور حیرت انگیز معلومات و حقائق بیان کیے جو دراصل اپنے اندر افسانوی و داستانوی رنگ لیے ہوئے ہیں جن پر یقین کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جزیرہ کاف میں بہنے والے ایک دریا کی حقیقت کے متعلق منشی اعتصام الدین نے اپنی معلومات کے مطابق کچھ یوں لکھا کے:

> ...ملک کاف کی سرحد اسی دریا تک ہے اور اس دریا میں ایک دیو موکل ہے جو سرحد کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر کسی غیر ملک کا آدمی دریا کو عبور کرنے کے ارادے سے پانی میں پاؤں رکھتا ہے تو اسی وقت دریا کے پانی میں جوش پیدا ہوتا ہے اور طوفان اٹھتا ہے اور اس کو غرق کر دیتا ہے اور وہی دیو اس کو کھا جاتا ہے۔[۱۸]

سمندر کے عجائب جو یورپ کے بحری سفر کے دوران اعتصام نے خود دیکھے اور جن کے بارے میں صرف سنا اور اُن کے بیان کرنے میں دلچسپی لی اُن میں اڑنے والی مچھلی جو مکڑی کے جالے سے مشابہ معلوم ہوئی۔ ہاک فش، جس کا سر خنزیر کی مانند جبکہ دو پیر بھی تھے۔ دریائی مگرمچھ، جس کی جسامت دو بڑے ہاتھیوں کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔ سمندری گائے جس کے بارے میں انہوں نے سنا تھا کے وہ رات کو خشکی میں چرتی تھی اور اس کے گوبر سے عنبر بنتا تھا شامل ہیں۔ سمندری مخلوقات میں سب سے دلچسپ اور انوکھی مخلوق جس کے متعلق منشی اعتصام الدین نے صرف بہت سی باتیں سنی مگر وہ ان کے مشاہدہ میں نہ آئی۔ وہ شکل مردم فریب (جل پری) تھی۔ ان کی رائے میں یہ سمندری مخلوق جو جنوں کی دنیا سے تعلق رکھتی تھی شکل و شباہت میں سر سے کمر تک ایک خوبصورت عورت کی طرح دکھائی دیتی تھی لیکن کمر کے نیچے سے اس کا جسم دُم دار مچھلی کی طرح ہوتا ہے۔ اعتصام کی رائے میں جنوں کی دنیا سے تعلق رکھنے والی اس مخلوق کا مسافران جہاز کو دکھائی دینا دراصل اچھا شگون نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ انگریزوں کی جدید جہاز رانی کی تکنیکوں کو سراہنے والے منشی اعتصام الدین ایسی عجیب وغریب سمندری مخلوقات کے وجود سے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا دکھائی نہیں دیتے جن کے متعلق انہوں نے صرف جہاز والوں کی زبانی مختلف قصے اور کہانیاں سنی تھیں اور خود اپنی آنکھوں سے اُن کا مشاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات قرار دے کر اُن کے سچ ہونے کا گمان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔[19]

سمندر کے عجائب وغرائب کے ساتھ ساتھ خود سمندر کی وسعت اور گہرائی نے بھی انہیں بہت حیرت زدہ کیا اور انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سمندر کی وسعت اور گہرائی ناپنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے انہوں نے شیخ نظامی کے اس دعویٰ کو بھی بے بنیاد ٹھہرایا جس کے مطابق سکندر نے سارے سمندر کو ناپا تھا۔ اس حوالے سے اعتصام نے یہ دلیل پیش کی کہ سکندر کے زمانے میں چونکہ قبلہ نما دریافت نہ ہوا تھا اس لیے بغیر کمپاس کی مدد کے اتنے طویل سمندر کو صرف جریب کی مدد سے ناپنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اعتصام کے مطابق بعد ازاں انہیں فرنگستان (یورپ) کی تاریخ کے مطالعہ سے بھی یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہوگئی کہ اگرچہ سکندر نے خشکی اور تری کو ناپنے کا کام کیا تھا مگر وہ صرف روم سے فرنگستان تک چند منزل سمندر کے کنارے کی پیمائش تھی۔ اعتصام کی معلومات کے مطابق فرنگستان کے دانشور (مستشرقین) سکندر کے متعلق عربی اور فارسی مورخوں کے علم کو ناقص قرار دیتے تھے کیونکہ ان کی رائے میں عربی اور فارسی کے مورخوں اور دانشوروں نے سنی سنائی روایات کے بموجب سکندر کے متعلق کچھ ایسی باتیں مشہور کر دیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور چونکہ سکندر کا تعلق فرنگستان (روم) سے تھا اس لیے سکندر کے متعلق مستند معلومات بھی انہی کے پاس تھیں۔[20]

منشی اسماعیل کے بحری سفر کے تجربات ومشاہدات کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو انہوں نے اگرچہ منشی اعتصام الدین کی طرح نہ تو جہاز رانی کے جدید انگریزی نظام کے متعلق کوئی معلومات فراہم کرنے کی طرف توجہ دی اور نہ ہی سمندری عجائبات ومخلوقات یا ان کے متعلق کوئی دلچسپ معلومات فراہم کرنے میں کوئی دلچسپی لی۔ البتہ انہوں نے یورپ کے بحری سفر کے دوران آنے والے چند ایک ایسے جزائر کے زمینی و جغرافیائی حالات کے متعلق اپنے مشاہدات ضرور قلمبند کیے جہاں ان کا قیام ہوا اور چند ایک دلچسپ واقعات کو بیان کیا جو بحری سفر کے دوران پیش آئے۔

بحری سفر کے آغاز میں انہوں نے خاص طور پر جس بات کا ذکر کیا وہ یہ تھی کہ انہیں اس بحری سفر میں ویسے تو کوئی پریشانی نہ تھی مگر انہیں اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ وہ اس سفر کے دوران رمضان کے مہینے کی برکتوں اور نمازوں کی ادائیگی اور ثواب حاصل کرنے سے محروم رہے۔[21] منشی اسماعیل نے اس کی کوئی معقول وجہ تو بیان نہیں کی

مگر شاید بحری سفر کے روز و شب یا جہاز کے نامساعد حالات اُن کے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ بنے ہوں گے جنہیں بیان کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔اس کے بعد منشی اسماعیل نے انگلستان تک سفر کے دوران آنے والے تین جزائر کیپ کدوب، جزیرہ سنتلین اور ایک اور جزیرے (جس کا نام نہیں لیا) کے حالات، وہاں کی آب و ہوا ، وہاں کے باشندوں اور اُن کی خوراک کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ منشی اعتصام الدین کی طرح منشی اسماعیل بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کے ہندوستان سے یورپ تک کے بحری سفر کے دوران آنے والے بہت سے آباد اور غیر آباد سمندری جزائر پر مختلف یورپی اقوام نے قبضہ کر رکھا تھا اور وہاں پر پہلے سے آباد باشندوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔

بحری سفر کے دوران آنے والے پہلے جزیرے جہاں منشی اسماعیل نے اپنے قیام کا ذکر کیا وہ کیپ کدوب تھا۔ منشی اسماعیل کے مطابق وہ سفر کے دو ماہ اور بارہ روز بعد پندرہ فروری کو کیپ کدوب [۴۲] (Cap of Good Hope) پہنچے۔ یہ جزیرہ اس وقت اگرچہ ولندیزیوں کے قبضہ میں تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز مورس کا وہاں لنگر انداز ہونا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں کا وہاں قیام یقیناً اسی وجہ سے تھا کے اس زمانے میں انگریزوں اور ولندیزوں کے درمیان تعلقات خوشگوار تھے۔ منشی اسماعیل کا قیام یہاں مسٹر کلاڈرسل کے ہمراہ بارہ روز تک رہا۔اس علاقے کے پہاڑوں اور اس میں پائے جانے والے خوش ذائقہ پھلوں کے علاوہ منشی اسماعیل نے جس چیز کے بیان کرنے میں سب سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا وہ 'ساکنان کوہ' تھے۔ منشی اسماعیل نے انہیں کیپ کدوب کی عجیب الخلقت مخلوقات میں سے ایک قرار دیا۔انہوں نے ساکنان کوہ کی وضع قطع، لباس اور خوراک کے متعلق جس انداز میں معلومات فراہم کیں ان سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کے وہ 'مہذب انسانوں' کے غلام بننے کے ہی لائق تھے مثلاً منشی اسماعیل کے مطابق ساکنان کوہ کا لباس عجیب و غریب تھا اور ان کی خوراک کچا دودھ اور ناگوار گوشت تھا جبکہ ان کی رنگت حبشیوں سے کچھ کم سیاہ تھی اور وہ ولندیزیوں کی رعایا اور غلاموں کی مانند ہر وقت ان کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے کیونکہ وہ پہاڑ جہاں یہ رہتے تھے ولندیزیوں کے قبضہ میں تھا۔ [۴۳]

بحری سفر کے دوران آنے والے اگلے جزیرے جس کا حال منشی اسماعیل نے اپنے طرز تحریر کے برخلاف قدرے تفصیل سے لکھا وہ جزیرہ سنتلین [۴۴] ہے۔ ان کا بحری جہاز اس جزیرے پر آٹھ ذی الحج بمطابق ۱۳ مارچ کو لنگر انداز ہوا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں انہیں اپنے سفر کے احوال قلمبند کرنے کا خیال بھی آیا۔ یہ جزیرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت تھا۔ منشی اسماعیل نے اس جزیرے کے قدرتی مناظر کی منظر کشی نہایت عمدہ طور پر کی اور اس کے انتظام و انصرام اور وہاں پائی جانے والی اشیائے خورد و نوش کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں بھی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ان کے مشاہدہ کے مطابق جزیرہ سنتلین میں چار بلند و بالا پہاڑ تھے جن کے اطراف میں کھاری پانی والا ٹھاٹھیں مارتا ہوا

لامحدود سمندر دکھائی دیتا تھا۔ سمندر کے کنارے قلعہ تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں توپیں نصب کر دی گئیں تھیں اس طرح کوئی جہاز بھی قلعدار و کی اجازت کے بغیر وہاں سے گزر نہیں سکتا تھا۔ منشی اسماعیل کے مطابق یہ جزیرہ جو پہاڑی نوعیت کا تھا وہاں صرف ایک خاص قسم کے کیلے جسے امر تمان کہا جاتا تھا جو بنگال میں بھی شاذ و نادر دکھائی دے جاتا تھا اور کجھو (زبان خار) کے علاوہ کسی اور چیز کی کاشت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ جلانے کی لکڑی اور چشمے کا میٹھا پانی دستیاب تھا۔ دیگر اشیائے خورد و نوش وہاں دوسرے ممالک جیسے کہ انگلستان اور بنگال وغیرہ سے آنے والے جہازوں پر لاد کر لائی جاتی تھیں اور اگر اتفاق سے کبھی جہازوں کی آمد و رفت میں تاخیر ہو جاتی تو وہاں کے لوگ اپنی بھوک لعاب کجھو سے دور کرتے تھے۔[25] ڈیگبی نے لعاب کجھو کو نیگرو باشندوں اور سور کی خوراک قرار دیا۔[26] منشی اسماعیل کو بھی اس جزیرہ پر قیام کے دوران غالباً پیسوں کی کمی کے باعث لعاب کجھو کھا کر اپنی بھوک مٹانی پڑی مگر ان کے مطابق اسے کھاتے ہی ان کی زبان پر حلق تک خارش ہونے لگی جسے کئی قسم کے اچار کھا کر دور کرنے کی کوشش کی گئی مگر اُن کی تکلیف دور نہ ہو سکی۔ آخر کار منشی اسماعیل نے اپنے آقا مسٹر کیلاڈرسل کو اس واقعہ کی اطلاع دی جس پر انہوں نے منشی صاحب کو کچھ پیسے عنایت کیے جس کے سبب انہوں نے وہاں مرغ و مچھلی کھا کر خیر و عافیت سے گزر بسر کی۔ اس عنایت پر منشی اسماعیل نے اپنے آقا کی فراخ دلی اور مہربان طبیعت کی بہت مدح سرائی کی۔

جزیرہ سنتلین میں منشی اسماعیل اور مسٹر کیلادرسل کا قیام تقریباً اکیس، بائیس روز تک رہا۔ اس طویل قیام کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مورس جہاز میں پانی داخل ہونے کی خبریں گردش میں تھیں جو کسی حد تک درست بھی تھیں جبکہ دوسری وجہ یہ تھی کہ جہاز کے کپتان سے کچھ ناشائستہ حرکات سرزد ہوئیں جنہیں رازداری کے پیش نظر منشی اسماعیل نے بیان کرنے سے گریز کیا۔ اس طرح جزیرہ سنتلین ہی وہ مقام تھا جہاں مسٹر کیلاڈرسل نے باقی افسران کے مشورہ سے مورس جہاز کو ترک کیا اور باقی کا سفر چین کی بندرگاہ سے آنے والے مال بردار جہاز سے طے کیا۔ منشی اسماعیل اپنے آقا کے ہمراہ ۱۶ اپریل ۱۷۷۴ء کو اس جہاز میں سوار ہوئے اور ان کے مطابق اس جہاز میں اگرچہ سامان کی بہتات تھی (جیسے چین سے آئے برتن، چائے، مصری اور کپڑے وغیرہ) مگر اس کے باوجود انہیں اس جہاز میں الگ سے جگہ عنایت کی گئی اور جہاز کے کپتان کے حکم سے انہیں باقاعدگی سے اشیائے خورد و نوش فراہم کی جاتی رہیں۔ منشی اسماعیل پر غالباً یہ عنایات اس وجہ سے کی جا رہی تھی کیونکہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکار مسٹر کلاڈرسل کی ملازمت میں تھے اور ان کے ساتھ انگلستان جا رہے تھے۔

منشی اسماعیل کے مطابق جزیرہ سنتلین سے روانگی کے چھ روز بعد ان کا بحری جہاز ایک اور جزیرے پر جس کا نام انہوں نے تحریر نہیں کیا پر کچھوؤں کے شکار کی غرض سے لنگر انداز ہوا۔[27] ڈیگبی کی معلومات کے مطابق یہ

جزیرہ'Ascension Island' تھا۔[۴۸] منشی اسماعیل نے اس جزیرے کے حوالے سے جہاز والوں کے کچھوؤں کے شکار کے علاوہ ان شیشے کی بوتلوں کے متعلق دلچسپ معلومات فراہم کرنے میں دلچسپی لی جن کے اندر وہاں آنے جانے والے جہازوں کا اپنے مقام روانگی، منزل مقصود اور سفر کے متعلق دیگر مفید معلومات درج کر کے رکھنے کرنے کا رواج تھا۔[۴۹] منشی اسماعیل کی طرح منشی اعتصام الدین کے سفر نامے میں بھی 'جزیرہ سامون' کے حوالے سے کچھوؤں کے شکار اور شیشے کی بوتلوں میں وہاں شکار کی غرض سے رکنے والے جہازوں کے اپنے سفر کے حالات لکھنے کے حوالے سے معلومات فراہم کی گئیں تھیں۔[۵۰] جس سے اندازہ ہوتا ہے کے اٹھارہویں صدی میں جب باہمی رابطہ کے جدید ذرائع اور جہاز رانی کے جدید آلات اور تکنیکیں ابھی معرض وجود میں نہ آئی تھیں تب سمندر میں سفر کرنے والے یورپی بحری جہاز ایک دوسرے کی خبر گیری اور سمندر میں ان جانے جزیروں اور پرخطر مقامات کے متعلق مفید معلومات کا تبادلہ ان شیشے کی بوتلوں میں اپنے بحری سفر کے احوال و حوادث کو درج کر کے اس طور پر کیا کرتے تھے کہ پہلے کا تجربہ دوسرے کے لیے رہنمائی کا سبب بن جاتا۔ اس طرح دور دراز کے خطوں کے بحری سفر کے دوران محفوظ اور پُرخطر مقامات کے متعلق پیشگی آگہی، آئندہ کے لیے حکمت عملی تیار کرنے میں مدد دیتی۔

ایک اور قابل ذکر واقعہ جو منشی اسماعیل نے اپنے بحری سفر کے بیان میں خاص دلچسپی کے ساتھ سپردِ قلم کیا جو یقیناً ان کے اور ان کے بحری جہاز کے ساتھی مسافروں کے لیے بھی ایک حقیقی خطرہ کا سبب بنا تھا وہ ایک بڑے ہسپانوی جنگی جہاز کا منشی اسماعیل کے بحری جہاز کے قریب نمودار ہونے کا ذکر تھا جو ایک سو تین توپوں سے لیس تھا۔ اس جہاز کی موجودگی نے منشی اسماعیل کے جہاز کے کپتان کے ساتھ ساتھ جہاز کے باقی تمام مسافروں کو بھی فکر مند کر دیا مگر جب بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ جنگی جہاز امن و سکون سے اپنے ملک کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا تو تمام اہل جہاز مطمئن ہو گئے۔

بیان کردہ جزائر کے علاوہ انگلستان کے بحری سفر کے دوران آنے والے کسی اور جزیرے یا کسی خاطر خواہ واقعہ کا ذکر منشی اسماعیل نے نہیں کیا اور اُن کے مطابق وہ ۳ جون کو شہر انگلینڈ کے ساحل پر **پانچ گئے**۔[۵۱]

منشی اعتصام الدین نے اپنے سفر نامہ میں واپسی کے سفر کے متعلق کچھ الگ سے درج نہیں کیا مگر منشی اسماعیل نے اس کے برعکس اپنے واپسی کے بحری سفر کے دوران آنے والے دو جزیروں (پرتگال اور جوہانہ) کا حال درج کیا جو حیرت انگیز طور پر مختصر ہے۔ جزیرہ پرتگال کے بیان میں انہوں نے صرف وہاں کے پہاڑوں کی بلندی اور اس حوالے سے کچھ اشعار درج کیے جبکہ جزیرہ جوہانہ میں پائی جانے والی جن چند چیزوں کا ذکر کیا ان میں خوبصورت پہاڑ، ناریل کے خوبصورت باغات اور فلوس (آبی جانوروں کی ایک قسم) شامل ہیں۔ اس اختصار کی وجہ خود منشی اسماعیل نے اپنوں

سے دوری اور سفر کی صعوبتوں کو ٹھہرایا۔[۲۲] غرض کے منشی اسماعیل نے اپنے واپسی کے سفر کے حال بیان کرنے میں کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی بلکہ اکتاہٹ اور بے زاری اُن کے لہجے سے نمایاں ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے انگلستان کے سفر اور وہاں جا کر حاصل ہونے والی کامیابی سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ شاید پوری نہ ہو سکی تھیں۔

یوں مجموعی طور پر جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل کے بحری سفر کے مشاہدات و احوال پر اگر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کے منشی اعتصام الدین نے اپنے بحری سفر کے احوال تفصیل سے بیان کرنے میں دلچسپی لی۔ انہوں نے بحری سفر میں کمپاس کے استعمال کی اہمیت اور جہاز رانی کے جدید انگریزی نظام کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ جہازوں کی اقسام سے لے کر ہوا کی اقسام، سمندری جزائر سے لے کر سمندری عجائب اور سمندر کی وسعت و گہرائی سے لے کر یورپی بحری جہازوں کے اس میں سفر کرنے کے طریقہ کار تک غرض کے بحری سفر سے جڑی تقریباً تمام چیزوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں دلچسپی لی۔ ان چیزوں کے بیان کرنے میں منشی اعتصام الدین کا انداز زیادہ تر منطقی اور سائنسی رہا مگر کچھ چیزوں کے بیان کرنے میں جیسے کے پر اسرار سمندری جزائر سے جڑی حکایات اور سمندری عجائب (سمندری گائے اور شکل مردم فریب وغیرہ) کے بیان کرنے میں روایتی مشرقی سوچ اور انداز بھی غالب رہا۔ بحری سفر کے مشاہدات و احوال بیان کرنے کے حوالے سے منشی اسماعیل کا انداز نہایت سادہ اور اختصار پر مبنی رہا۔ انہوں نے منشی اعتصام الدین کی طرح نہ تو جہاز رانی کے جدید یورپی نظام کے متعلق کوئی معلومات فراہم کیں اور نہ ہی سمندری عجائب و غرائب کے متعلق اپنے کوئی مشاہدات پیش کیے۔ انہوں نے بحری سفر کے دوران آنے والے صرف انہی جزائر کا ذکر کیا جہاں ان کا قیام ہوا اور صرف انہی واقعات کو بیان کیا جو دوران سفر پیش آئے۔

شہر لندن کی خصوصیات:

چھاپہ خانوں اور قہوہ خانوں کی بدولت اخباری صنعت کا فروغ اور ادبی و تدریسی کتب کی اشاعت، فنون لطیفہ کی ترقی، دنیا کی تجارت اور نئی مصنوعات کی منڈی ہونے کی بدولت اٹھارہویں صدی میں لندن دنیا کا اہم ترین شہر بن گیا۔ اس طرح لندن اپنی وسیع تجارت اور بحری جہازوں کی صنعت کی بدولت نہ صرف انگلستان بلکہ پوری دنیا کی اقتصادی سرگرمیوں کا مرکز بھی بن گیا اور انیسویں صدی کی ابتداء تک لندن یورپ کا سب سے بڑا شہر بن گیا۔ پہلا سینسس جو ۱۸۰۱ء میں پیش کیا گیا اس وقت تک لندن کی آبادی ایک ملین تک پہنچ چکی تھی۔ لندن دراصل ایک وسیع اور عظیم سلطنت کا دار لحکومت ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ معاشی و اقتصادی اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز و محور بھی تھا اس لیے روزگار کے حصول اور بہتر معیار زندگی کی خواہش لیے نہ صرف انگلستان بلکہ دوسرے

ممالک جو انگلستان کی اطاعت اختیار کر چکے تھے جیسے کے اسکاٹ لینڈ وغیرہ کے باشندوں نے بھی اس شہر کا رخ کیا۔[۳۳] یہی وجہ تھی کہ انگلستان کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کے زمانے میں سفر کرنے والے تقریباً تمام سفر نامہ نگاروں نے سیاسی، ثقافتی اور تجارتی حوالے سے دنیا کا اہم ترین شہر ہونے کے ناطے اپنے سفر ناموں میں لندن کے مشاہدات اور تصورات بیان کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور میں انگلستان کا سفر کرنے والے تینوں جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کو بھی لندن میں قیام اور برطانوی نوآبادکاروں کی حقیقی دنیا کو براہ راست دیکھنے کا موقع ملا تھا جو ان کی دنیا سے قدرے مختلف تھی۔ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی حقیقی دنیا(بنگال)اور برطانوی نوآبادکاروں کی حقیقی دنیا(لندن)میں تقریباًوہی فرق پیدا ہو چکا تھا جسے فینن نے نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کی دو الگ دنیاؤں کے حوالے سے اجاگر کیا تھا۔فینن نے کہا تھا کے نوآبادکار کی دنیا روشنیوں سے معمور، پختہ گلی کوچوں پر مشتمل ایک صاف ستھری دنیا ہوتی ہے جہاں زندگی کی تمام سہولیات میسر ہوتی ہیں۔جب کے نوآبادیاتی باشندوں کی دنیا انہی کی طرح بد شکل اور بدترین ہوتی ہے جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات روٹی، کپڑا اور روشنی وغیرہ نایاب ہوتی ہیں۔[۳۴] یوں محسوس ہوتا ہے کے اس فرق کو ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل نے بھی محسوس کیا تھا اسی لیے انہوں نے اپنے سفر ناموں میں لندن کی مادی و تکنیکی ترقی سے متعلق اپنے مشاہدات و تصورات بیان کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب ان دونوں سفر نامہ نگاروں کی اپنی حقیقی دنیا(بنگال)ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص انتظامی پالیسیوں کی بدولت پیدا ہونے والے قحط اور اس کی ہولناکیوں کے خوفناک نتائج بھگت رہی تھی۔اس زمانے میں بنگال کے لوگ روٹی، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات اور سہولیات سے بھی محروم تھے مگر برطانوی نوآبادکاروں کی نوآبادیاتی دنیا کلکتہ کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقی دنیا لندن میں بھی صورت حال اس کے برعکس تھی۔اس روشنیوں اور بلند و بالا عمارتوں والے شہر میں زندگی کی تمام سہولیات میسر تھیں۔بنگال کے قصبوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے یہ دونوں سفر نامہ نگار اگرچہ ہندوستان میں کلکتہ جیسے انگریزی طرز کے شہر کا مشاہدہ کر چکے تھے مگر اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کے دنیا کے جدید ترین شہر 'لندن' کی مادی و اقتصادی ترقی اور عوامی سہولیات نے انہیں حیران اور بے پناہ متاثر کیا۔اسی لیے لندن کی تکنیکی و مادی ترقی کے بعض مظاہر جیسے کے لندن کی اسٹریٹ لائٹس کا نظام، پختہ سڑکیں، پانی کی فراہمی کا جدید نظام اور چند دیگر عوامی و تفریحی سہولیات جیسے کے رقص کدے اور باغات وغیرہ جنوب ایشیائی ابتدائی نوآبادیاتی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل اور منشی اعتصام الدین کے لیے یکساں طور پر توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنے اور ان سہولیات کے متعلق ہمارے ان

دونوں سفر نامہ نگاروں نے تقریباً ملتے جلتے تاثرات و تبصرے پیش کیے۔ جس یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے ہندوستان اس وقت اس قسم کی تکنیکی، مادی اور صنعتی ترقی سے محروم تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کے 'ہم' مادی و صنعتی ترقی کے لحاظ سے 'وہ' پر فضیلت رکھتا تھا۔ مگر ہمارے ان ابتدائی نو آبادیاتی دور کے سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے یہ بات بھی توجہ اور غور و فکر کی حامل ہے کے لندن اور بحیثیت مجموعی انگلستان کی صنعتی و مادی ترقی اور عوامی سہولیات کے متعلق بیان کردہ ان کے مشاہدات و تاثرات سے اگرچہ حیرت، مسرت، دلچسپی اور کہیں کہیں حسرت جیسے ملے جلے تاثرات کا اظہار ضرور ہوتا ہے مگر ان کے ہاں لندن کی مادی و صنعتی ترقی کو دیکھ کر احساس کمتری جیسے احساسات و تاثرات کا اظہار نہیں ہوتا۔ اعتصام کے ہاں اگرچہ لندن کی چند ایک عوامی سہولیات کو دیکھ کر ان کے ہندوستان میں نہ ہونے کا شکوہ ضرور ملتا ہے مگر اس شکوہ میں بھی احساس کمتری کا تاثر نہیں ابھرتا۔ جب کے منشی اسماعیل کے ہاں بھی لندن یا بحیثیت مجموعی انگلستان کی مادی و تکنیکی اور صنعتی ترقی کے مظاہر کا ہندوستان سے تقابل یا اس حوالے سے کسی قسم کے احساس کمتری کے اظہار کا شائبہ تک نہیں ملتا۔

لندن کے حوالے سے ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین نے اپنے مشاہدات لندن میں سب سے پہلے لندن میں اپنے برطانوی میزبانوں کے خود کو (یعنی ایک ہندوستانی کو) خوش آمدید کرنے کے انداز کو نہایت دلچسپی سے بیان کیا۔ لندن پہنچنے پر برطانوی لوگوں کے منشی اعتصام الدین کے 'سیاہ' رنگ، وضع قطع اور ان کے لباس کو دیکھ کر دیئے گیے تاثرات اور اپنائے گئے رویوں کے حوالے سے فراہم کردہ اعتصام الدین کی معلومات دراصل 'ہم' اور 'وہ' کے درمیان رنگ و نسل اور ثقافتی افتراقات اور رنگ و نسل کی بنیاد پر 'ہم' کی 'وہ' پر برتری کی سائیکی کے تصور کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ مگر منشی اعتصام الدین نے جس طرح محظوظ ہو کر شگرف نامہ ولایت میں لندن کے لوگوں کے ان کے رنگ و لباس کے متعلق تاثرات اور رویوں کو بیان کیا ان سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کے منشی اعتصام الدین اپنے سیاہ رنگ اور اپنی ثقافتی پہچان (لباس) کے حوالے سے کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھے۔ مثلاً منشی اعتصام الدین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جب وہ اپنے روایتی ہندوستانی لباس میں لندن کی گلیوں میں نکلتے تو لوگوں کی ایک بھیڑ ان کے گرد جمع ہو جاتی۔ اکثر عورتیں اور بچے ان کو عجیب و غریب مخلوق سمجھ کر دوسرے لوگوں کو ان کے آنے کی اطلاع دیتے اور اکثر لوگ ان کی وضع قطع دیکھ کر اپنی زبان میں انہیں 'کالا دیو' کہتے۔ کچھ لوگ ان کے لباس (قبا، صافہ، شال، کمربند اور کمر میں خنجر) کو پسند کرتے، کچھ لوگ اسے عورتوں کے لباس سے مشابہ قرار دیتے جبکہ کچھ لوگ ان کے لباس کو دیکھ کر انہیں بنگال کے نواب کے خاندان کا فرد سمجھتے۔ منشی اعتصام الدین نے برطانوی لوگوں کے ان کے روایتی ہندوستانی لباس پر پیش کردہ تاثرات اور تمسخر آمیز رویوں کی وجہ

کسی احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر 'انگریزی مہذب لباس' کے مقابلے میں ہندوستانی لباس کے غیر مہذب یا غیر معقول دکھائی دیئے جانے کو قرار نہیں دیا بلکہ انہوں نے اس کی وجہ برطانوی لوگوں کے ہندوستانیوں کے لباس، زبان اور عادات و اطوار سے ناواقفیت کو قرار دیا اور یہ خیال ظاہر کیا کے چونکہ ان سے پہلے جاٹگام اور جہانگیری کے خلاصیوں کے علاوہ کوئی اور منشی روایتی پر تکلف ہندوستانی لباس میں وہاں نہ گیا تھا اسی لیے انہوں نے اعتصام کے لباس کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ لندن کے لوگوں کے تمسخر آمیز رویے کے باوجود اعتصام نے اپنا دیسی لباس پہننا ترک نہ کیا۔ اسی لیے اعتصام کے مطابق جب دو ماہ تک وہاں کے لوگ انہیں اسی حلیے میں دیکھتے رہے تو ان سے مانوس ہو گئے اور اچھے اخلاق سے پیش آنے لگے۔[۲۵] یہ حیرت کی بات ہے کے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر ۱۷۹۹ء میں اعتصام سے تقریباً تیس سال بعد سفر یورپ اختیار کرنے والے ہندوستانی سفر نامہ نگار مرزا ابو طالب خان اصفہانی نے بھی اپنے سفر نامے میں اپنی شخصیت اور یورپ میں اپنی موجودگی کو یورپی لوگوں کی حیرت اور دلچسپی کا باعث قرار دیا مگر جس طرح اعتصام نے اپنے متعلق برطانوی لوگوں کے تاثرات کو محظوظ ہو کر بیان کیا ابو طالب بھی اسی طرح یورپی لوگوں کے اپنے متعلق تاثرات سن کر محظوظ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔[۲۶] جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یعنی ہندوستان میں برطانوی ابتدائی نو آبادیاتی دور میں سفر کرنے والے سفر نامہ نگاروں میں اپنے رنگ و نسل اور لباس کے حوالے سے کسی قسم کا احساس کمتری نہیں پایا جاتا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کے جوں جوں ہندوستان میں برطانوی مقبوضات میں اضافہ ہوتا گیا اور نو آبادیاتی نظام اپنے عروج کی جانب بڑھنے لگا توں توں ہندوستانی باشندوں میں رنگ و نسل اور لباس کے حوالے سے احساس کمتری بھی بڑھنے لگا جیسے کے انیسویں صدی کے بعض سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں اور ان کی تحریر کردہ دوسری تصانیف سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ منشی اعتصام الدین نے اپنے لباس اور وضع قطع کے حوالے سے ایک اور دلچسپ انکشاف جو شگرف نامہ میں کیا وہ یہ تھا کے اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد جب انہوں نے ہندوستان واپسی کا ارادہ کیا تو کپتان سوئنٹن نے انہیں انگلستان میں بحیثیت فارسی استاد روکنے کے لیے دیگر پیش کشوں کے ساتھ یہ پیش کش بھی کی کے وہ اعتصام کو یورپ کے مشہور مقامات کی سیر کرائیں گے مگر اعتصام کی رائے میں اس سے کپتان سوئنٹن کی غرض دراصل یہ تھی کے برطانوی معزز لوگ چونکہ اعتصام کے پر تکلف ہندوستانی لباس کی بنا پر انہیں بنگال کے نواب کے خاندان کا فرد تصور کرتے تھے اس لیے جب وہ کپتان سوئنٹن کے ہمراہ سفر پر جائیں گے تو اس سے یورپی لوگوں میں کپتان کی اہمیت اور قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا اور جب کپتان دوبارہ بنگال جائے گا تو اس کی عزت اور شہرت میں میں اضافہ ہوگا۔[۲۷] منشی اعتصام الدین کی فراہم کردہ یہ معلومات دراصل اس اہم نقطہ کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کراتی ہے کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک برطانیہ اور

دوسرے یورپی ممالک بنگال اور بنگال کے نوابوں کی امارت سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ متاثر بھی تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کی دیوانی کے حقوق مل جانا یقیناً ان کے لیے ایک غیر معمولی کامیابی تھی اس لیے اس زمانے میں بنگال کے نواب یا نواب کے خاندان والوں سے ذاتی مراسم دراصل خود انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کے لیے فخر کی بات تھی۔

جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین کو شہر لندن کی بلند و بالا اور خوبصورت عمارتوں نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے مشاہدہ کیا کے لندن میں پتھر کی عمارتیں کم اور اینٹوں سے بنی عمارتیں زیادہ تھیں مگر گرجاگھر زیادہ تر پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ لندن میں واقع گرجا سینٹ پال، پل ویسٹ منسٹر، شاہی محل، بادشاہ بیگم کی حویلی، مدرسہ آکسفورڈ اور رصد خانہ کی عمارتوں کی ظاہری آرائش وزیبائش کے ساتھ ساتھ منشی اعتصام الدین نے ان کی بناوٹ اور ساخت کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ مثلاً گرجا سینٹ پال کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ لندن کے تمام گرجاگھروں سے زیادہ مشہور اور بلند تھا۔ اس کی نصف عمارت سات گوشوں والی تھی جو درمیان سے گول تھی اور اس میں تھوڑا سا برآمدہ بھی تھا۔ اس کی چھت گول گنبد جیسی تھی۔ اس کے جنوب میں کتب خانہ اور مدرسہ وغیرہ عمارتیں سب پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ اعتصام الدین کو یہ مقام اور عمارت نہایت خوشنما اور دلکش معلوم ہوئی اور اسے دیکھ کر انہوں نے یہ رائے پیش کی کے پتھروں سے بنی ہوئی ایسی مضبوط اور بلند عمارتیں ہندوستان میں نہیں بنائی گئی تھیں اور دکن میں قلعہ دولت آباد کے سوا کہیں نہیں تھیں۔[۳۸] منشی اعتصام الدین کے اس دعویٰ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی اس کے علاوہ آگرہ اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اسی لیے وہ مغلیہ فنِ تعمیر کے شاہکار نمونوں اور خوبصورت پتھروں سے بنی بلند و بالا عمارتوں کو دیکھنے سے محروم رہ گئے تھے کہ جن کی تعریف میں خود یورپی سیاح اور دانشور بھی رطب اللسان رہے ہیں مثلاً فرانس کا ایک مشہور دانشور پیر لوتی جسے اس کی ادبی خدمات کے صلے میں اکیڈمی آف فرانس کی رکنیت سے نوازا گیا جو فرانس کے دانشوروں کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ لوتی ۱۹۰۰ء میں ہندوستان آیا اور اس نے ایک کتاب ہندوستان انگریزوں کے بغیر تحریر کی۔ لوتی مغلیہ فنِ تعمیر اور ثقافت کو سراہنے کے ساتھ ساتھ تاج محل کے بارے میں خاص طور پر لکھتا ہے کہ

> تاج جسے ساری دنیا نے دیکھا ہے اور اس کی عظمت کو تسلیم کیا ہے کہ تاج عجائبات میں سے ایک ہے۔[۳۹]

مگر اعتصام الدین تک شاید تاج محل کی نہ شہرت پہنچ سکی تھی نہ اسے دیکھنے کا موقع میسر آسکا تھا۔ بہر حال

اعتصام نے اپنی لاعلمی کی بناپر اگرچہ لندن جیسی پتھروں کی بنی عمارتوں کی ہندوستان میں کمی کا اظہار ضرور کیا مگر نہ ہونے کا دعوی نہیں کیا۔ یہ دلچسپ بات ہے کے منشی اعتصام الدین کو جہاں لندن کی عمارتوں نے متاثر کیا وہیں انہیں بادشاہ کے محل کی عمارت کو دیکھ کر حیرانی بھی ہوئی۔ شاید اس لیے کے وہ انہیں ہندوستان کے نوابوں اور رئیسوں کے محلوں کی عمارتوں کے مقابلے میں بہت سادہ اور کم حیثیت معلوم ہوئی اسی لیے بادشاہ کے محل کی ظاہری حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتصام الدین نے یہ رائے پیش کی کے بادشاہ کا محل باہر سے معمولی دکھائی دیتا تھا جس کی دیواروں پر پلاسٹر بھی موجود نہیں تھا اور اسی لیے یہ محل ہندوستان کے کسی مہاجن کی حویلی جیساد کھائی دیتا تھا۔ [۴۰]

یہ حیرت کی بات ہے کے منشی اعتصام الدین کے مقابلے میں منشی اسماعیل کے ہاں لندن کی مشہور اور بلند و بالا عمارتوں کی خوبصورتی اور مضبوطی کی تعریف تو در کنار ان کا تذکرہ تک نہیں ملتا۔ البتہ لندن میں بنائے گئے پل اپنے منفرد ڈیزائن اور خوبیوں کی بناپر منشی اعتصام الدین کے ساتھ ساتھ منشی اسماعیل کی توجہ کا مرکز بھی بنے۔ دونوں سفر نامہ نگاروں کی معلومات کے مطابق اٹھارہویں صدی میں لندن میں ان کے قیام تک بنائے گئے پلوں کی تعداد تین تھی۔ منشی اعتصام الدین نے لندن میں بنائے گئے ان تین پلوں میں سے 'پل ویسٹ منسٹر' جس کا انہوں نے بذات خود مشاہدہ کیا تھا کے ڈیزائن کے ساتھ ساتھ اس کے مصرف بیان کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اعتصام کے مشاہدہ کے مطابق اس پل کی لمبائی دریا کی چوڑائی کے برابر تھی اور یہ اس قدر چوڑا تھا کے اس پر چار گاڑیاں ایک دوسرے کے برابر چل سکتی تھیں۔ [۴۱] منشی اسماعیل نے بھی اگرچہ لندن میں بنائے گئے تین مزین پلوں کا ذکر تو کیا مگر حیرت کی بات ہے کے انہوں نے ان تین پلوں میں سے کسی ایک کے بھی نام کی نشاندہی نہیں کی البتہ ان پلوں کی خوبیوں اور ان کے مصرف بیان کرنے میں منشی اسماعیل نے دلچسپی ضرور لی۔ چنانچہ ان کی معلومات کے مطابق لندن شہر کے بیچ میں چونکہ دریا بہتا تھا اس لیے یہ پل لوگوں کی آمدورفت میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر بنائے گئے تھے۔ [۴۲] سائمن ڈگبی نے منشی اسماعیل کے بیان کردہ تین مزین پلوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انہیں دراصل لندن برج، ویسٹ منسٹر برج اور بلیک فرائر برج قرار دیا۔ ان میں سے بلیک فرائر برج منشی اسماعیل کی لندن آمد سے دو سال پہلے ۱۷۶۹ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ [۴۳]

ابتدائی جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کو جہاں لندن کی بلند و بالا عمارتوں اور مزین پلوں کی مضبوطی اور خوبصورتی نے متاثر کیا وہیں لندن اور بحیثیت مجموعی برطانوی عورتوں کا حسن اور خوبصورتی بھی انہیں بہت بھائی۔ یورپ اور بالخصوص برطانوی عورتوں کی خوبصورتی اور آزادی دراصل اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ کا سفر کرنے والے زیادہ تر جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کا پسندیدہ اور محبوب ترین موضوع رہا اور انہوں نے اپنے

سفر ناموں میں برطانوی عورتوں کے حسن اور آزادی کو اپنی اپنی حس جمالیات اور نقطہ نظر کے تحت سراہا اور جانچا۔اٹھارہویں صدی میں ابتدائی طور پر یورپ کا سفر کرنے والے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اعتصام الدین، منشی اسماعیل اور میر محمد حسین کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ان میں بلاشبہ منشی اعتصام الدین نہ صرف برطانوی عورتوں کے حسن سے بے پناہ متاثر دکھائی دیئے بلکہ شگرف نامہ میں انہوں نے برطانوی عورتوں کے حسن اور خوبصورتی کا برملا اظہار کرتے ہوئے انہیں حوروں کی مانند حسین قرار دیا بلکہ اس حوالے سے انہوں نے مبالغہ سے کام لیتے ہوئے برطانوی عورتوں کے حسن کو حوروں سے سے بڑھ کر قرار دیا کے جن کے حسن کو اگر حور و غلمان بھی دیکھ لیتے تو شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیتے۔مثلاً لندن میں ولیم جیمس پارک میں حسین برطانوی عورتوں کو دیکھ کر اعتصام بے اختیار یہ کہہ اٹھے:

> اس پارک کے ہر گوشے میں حسین و مہ جبین خواتین ناز و انداز کے ساتھ محو خرام نظر آتی ہیں، پری وش و حور نماد و شیزائیں رقص کناں اور غزال خواں دکھائی دیتی ہیں۔ حسن و جمال اور رنگ و بو کے دلکش مناظر، رعنائی و زیبائی کے روح افزا اور نزہت آگیں نظارے دیکھ کر حور و غلماں کے سر بھی شرمندگی سے جھک جاتے ہیں۔[۳۴]

مگر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کے منشی اعتصام الدین کو جہاں برطانوی عورتیں حسین معلوم ہوئیں وہیں وہ انہیں بہت بے باک بھی محسوس ہوئیں شاید اس لیے کے اعتصام کو ان میں ہندوستانی عورتوں جیسی شرم و حیاد کھائی نہ دی تھی۔انہوں نے شگرف نامہ میں برطانوی معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی کے حوالے بھی پیش کیے جن کا مشاہدہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ مثلاً لندن میں ولیم جیمس پارک میں حسین اور سرسبز نظاروں میں اگرچہ انہیں بہت سی حسین عورتیں دیکھنے کو ملیں مگر ان میں سے اکثر حسین عورتوں کو انہوں نے معاشرتی و سماجی اور اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آزادانہ اپنے محبوبوں سے بوس و کنار کرتے ہوئے دیکھا۔ برطانیہ میں قیام کے دوران کچھ ایسے مسافر خانے اور سرائے بھی ان کے مشاہدہ میں آئے جہاں برطانوی عورتیں جسم فروشی کا کام کرتی تھیں۔ منشی اعتصام الدین اگرچہ برطانوی عورتوں کے حسن کے معترف تھے مگر یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کے جب کپتان سوینٹن نے انگلستان کے معززین کو فارسی پڑھانے کے لیے منشی اعتصام الدین کو بحیثیت فارسی استاد انگلستان میں ہی روکنا چاہا تو برطانوی عورتوں کے لیے منشی اعتصام الدین کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے کپتان سوینٹن نے دیگر پیش کشوں کے ساتھ منشی اعتصام الدین کو یہ پیش کش بھی کی کے انگلستان میں رک جانے کی صورت میں وہ اعتصام کی خواہش پر ان کی شادی کسی خوبصورت انگلش عورت سے کروادیں گے۔ مگر منشی اعتصام الدین کو چونکہ اپنے وطن کے

ساتھ ساتھ اپنی عزت اور وقار بھی بہت عزیز تھا اس لیے انہوں نے یہ جواز پیش کرتے ہوئے کپتان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا کے انگلستان کے شرفاء کی عورتیں یقیناً ان سے شادی کرنا پسند نہیں کریں گی اور کسی رذیل خاندان کی گوری عورت سے وہ خود شادی کرنا پسند نہیں کریں گے۔ کپتان سوینٹن کے سامنے اعتصام کا یہ اعتراف کے ہندوستان کی (عزت دار) سانولی عورت انہیں انگلستان کی (رذیل) گوری پری سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے[۴۵] یقیناً اس بات پر دلالت کرتا ہے کے اعتصام کو برطانوی عورتوں کا حسن تو اگرچہ بھایا تھا مگر برطانوی عورتوں کی بے باکی اور مردوں سے آزادانہ میل جول انہیں بالکل پسند نہ آیا تھا۔

منشی اعتصام الدین کے برعکس منشی اسماعیل کے ہاں اگرچہ برطانوی عورتوں کی خوبصورتی کا کچھ کھل کر تو اظہار نہیں کیا گیا البتہ اس حوالے سے ہلکا سا اشارہ ضرور ملتا ہے:

ولایت کے پر مسرت خطے میں دل فریب اور نازک اندام حسینائیں محو خرام رہتی ہیں۔[۴۶]

لندن کی معاشرت اور شہری زندگی کے رہن سہن کے چند ایک پہلو جیسے کے لندن کے گھروں کے یکساں ڈیزائن اور گھروں اور دکانوں کے دروازے ہمیشہ بند رکھنا ہمارے ہندوستانی پس منظر رکھنے والے سفر نامہ نگاروں منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل کے لیے یکساں طور پر حیرت اور دلچسپی کا باعث بنے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ہندوستانی قارئین کے لیے لندن کی شہری زندگی کے مشاہدہ کردہ ان انوکھے پہلوؤں کے متعلق اپنے سفر ناموں میں معلومات فراہم کرنا ضروری خیال کیا۔ جارجین عہد کے لندن کے گھروں کی عمارتوں کے یکساں ڈیزائن اور گھروں اور دکانوں کے دروازے بند رکھنے کے متعلق اعتصام الدین نے اپنے جو مشاہدات پیش کیے ان کے مطابق لندن میں گلی کوچے اور سڑکیں صاف اور کشادہ تھیں جبکہ سڑکوں کے ارد گرد تین منزلہ یا پانچ منزلہ عمارتیں ایک طرز اور ترتیب سے بنائی گئیں تھیں۔ ان عمارتوں کے دروازوں پر پیتل کی تختیاں لگائی گئی تھیں اور ان تختیوں پر ان عمارتوں میں رہنے والوں کا نام تحریر کیا گیا تھا اور وہ جس پیشے سے منسلک تھے اُس کی تصویر لٹکائی گئی تھی۔ مثلاً اگر گھر کی عمارت کے اندر رہنے والا موچی ہوتا تو وہ دروازے پر جوتے کی تصویر لٹکا لیتا۔ اسی طرح روٹی پکانے والا روٹی کی تصویر لٹکا لیتا۔ اعتصام کی رائے میں اس طریقہ کار کو لندن کے لوگ صاحب خانہ کی شناخت کے ساتھ ساتھ دراصل پیشہ وروں کی شناخت کا بھی ایک عمدہ طریقہ تصور کرتے تھے۔ اعتصام کے مشاہدہ کے مطابق لندن کے لوگ اپنے مکان کی نچلی منزل میں دکان بناتے تھے اور وہاں کے رہنے والوں کا دستور یہ تھا کہ وہ مکان اور دکان کا دروازہ رات دن بند رکھتے تھے۔ منشی اعتصام الدین کو ان لوگوں کا یہ دستور دراصل سردی اور چوروں سے محفوظ رہنے کا بھی ایک عمدہ طریقہ معلوم ہوا۔[۴۷]

جارجین (Georgian) عہد کے لندن کے گھروں کی یکساں ڈیزائن والی عمارتیں منشی اعتصام الدین کے لیے حیرت سے زیادہ دلچسپی کا باعث بنی تھیں مگر منشی اسماعیل کے لیے لندن کے گھروں کی یکسانیت حیرت کے ساتھ ساتھ کسی قدر پریشانی کا باعث بھی بنی تھی۔ جیسے کے اپنے سفر نامے 'تاریخ جدید' میں منشی اسماعیل نے اس حوالے سے خود اعتراف کیا کے وہ اکیلے اس شہر میں دور تک سیر کے لیے اس لیے نہ جاتے تھے کہ کہیں وہ اس وسیع و عریض شہر کی یکسانیت میں کھو نہ جائیں اور گھر تک واپس نہ پہنچ سکیں۔ انہوں نے لندن میں جو چند ایک باغات اور رقص خانے دیکھے وہ بھی اپنے مالک مکان مسٹر ولیم کے ہمراہ دیکھے۔ لندن کے گھروں اور عمارتوں کی یکسانیت کے حوالے سے منشی اسماعیل لکھتے ہیں کہ:

> شہر کا طول و عرض آٹھ ولایتی کروہ ۴۸ سے کم نہ ہوگا اور تمام چھوٹے بڑے لوگوں کی حویلیاں، پانچ منزلہ اور بالکل ایک جیسی شکل میں بنائی گئی تھیں اور عقل ان کی پہچان سے عاجز آجاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ بندے کو محلے، صاحبِ خانہ کا نام اور نمبر وغیرہ ٹھیک سے معلوم ہو جس سے فرق ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک مستطیل، مربع یا ہشت پہلو، خوبصورت کانسی کی تختی پر، جیسے کہ مساجد و مقابر کی دیواروں پر مکتوب ہوتا ہے، تحریر کیا جاتا اور گھر کے دروازے کے اوپر لگا دیا جاتا ہے۔ جو شخص بھی اسے پڑھ سکے صرف اسے ہی اس گھر کا پتہ چل سکے گا بصورتِ دیگر یہ ممکن نہیں۔ وہاں کے باسی بھی اسی طریقے سے ایک دوسرے کے گھروں کو پہچانتے اور جانتے ہیں۔ [۴۹]

ہندوستانی پس منظر رکھنے والے ہمارے دونوں سفر نامہ نگار جو بنگال میں ہر شخص کی حیثیت کے مطابق الگ الگ طرح کے گھر دیکھنے کے عادی تھے ان کے لیے لندن کے گھروں کی یہ یکسانیت یقیناً چونکا دینے والی چیز تھی۔ گھروں اور دکانوں کے دروازوں کا ہمیشہ بند رکھنا منشی اسماعیل کے لیے بھی اتنا ہی حیران کن تھا جتنا کہ منشی اعتصام الدین کے لیے، اسی لیے انہوں نے اپنے سفر نامہ میں انگلستان کے لوگوں کے گھروں اور دکانوں کے دروازوں کو بند رکھنے کو ان کا ایک اہم اور خاص دستور تصور کرتے ہوئے اپنے قارئین کو اس کے متعلق معلومات فراہم کرنا بھی ضروری خیال کیا۔ جیسا کہ یہ بات ابھی بھی ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ ہمارے برصغیر (ہندوپاک) کے خطہ میں دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں زیادہ تر ایسی دکانیں ہی پائی جاتی ہیں جن کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور گاہک جب چاہیں دکاندار سے براہِ راست اپنی مطلوبہ چیز پیسوں کے عوض خرید لیتے ہیں۔ اس لیے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے بنگال کے قصبوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے دونوں سفر نامہ نگاروں کے لیے دکانوں کے دروازے ہمیشہ بند دیکھنا یقیناً ایک نئی اور انوکھی بات ہوگی۔

یورپ کے جدید ترین شہر لندن کی مادی ترقی اور بعض عوامی سہولیات جیسے کے پختہ وو سیع سڑکیں، سڑکوں کے کنارے بنے فٹ پاتھ، لندن کی اسٹریٹ لائٹس، پانی کی فراہمی کا جدید نظام اور تفریح گاہوں نے ہمارے دونوں ہندوستانی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل اور منشی اعتصام الدین کی توجہ کو یکساں طور پر اپنی جانب مبذول کرایا۔ منشی اعتصام الدین نے اپنے سفر نامے میں لندن میں یورپ کی مادی و تکنیکی ترقی کے شاہکاروں اور عوامی سہولیات کے متعلق معلومات قدرے تفصیل سے فراہم کیں جس سے نہ صرف لندن کی صنعتی ومادی ترقی کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کی حیرت ودلچسپی کا عنصر واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے بلکہ ان معلومات کے فراہم کرنے کا انداز اس بات پر دلالت کرتا ہے کے اعتصام کو اس بات کا اچھی طرح سے احساس تھا کے ہندوستان، لندن جیسی مادی و تکنیکی ترقی سے محروم تھا۔ ہمارے یہ سفر نامہ نگار اگرچہ لندن میں دستیاب بعض سہولیات کا مشاہدہ ہندوستان میں کلکتہ جیسے انگریزی طرز کے شہر میں کر چکے تھے مگر کلکتہ میں دستیاب سہولیات ناکافی اور دراصل لندن کی ترقی کا ایک ادنی انمونہ تھیں۔ جیسے کے شگرف نامہ میں اعتصام الدین نے اس بات کا اقرار کیا کے وہ لندن جیسے گلی کوچوں اور صاف وشفاف اور کشادہ بازاروں کے ایک ادنی 'نمونہ کا مشاہدہ ہندوستان میں کلکتہ میں کر چکے تھے۔[50] مگر لندن میں یورپ کی سائنسی و تکنیکی ترقی کے شاہکاروں نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کردیا۔ جیسے کے لندن کی اسٹریٹ لائٹس اور پانی کی ترسیل کے جدید نظام کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً لندن کی اسٹریٹ لائٹس کے نظام کے حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہوئے جو بات اعتصام الدین کو پسندیدہ معلوم ہوئی وہ یہ تھی کے لندن میں سڑکوں کے اطرف میں لگے شیشے کے لیمپوں کی روشنی رات گئے تک پیدل اور سوار لوگوں کو یکساں طور پر مستفید کرتی تھی اور اس سہولت کی بدولت (بنگال کے لوگوں کے برعکس) لندن کے لوگوں کو رات کے اندھیرے میں بھی اپنے ساتھ مشعل یا چراغ اٹھانے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لندن میں پینے کے پانی کی ترسیل کا نظام بھی منشی اعتصام الدین کو خاصا جدید معلوم ہوا جو ان کی معلومات اور مشاہدہ کے مطابق پہاڑ کے چشمے سے تالاب اور تالاب سے دھاتوں کے بنے ہوئے نلوں کے ذریعے گھر گھر پہنچایا جاتا تھا۔ لندن میں سڑکوں کے کنارے بنائے گئے فٹ پاتھ منشی اعتصام الدین کے لیے وہ حیرت انگیز چیز تھی جسے انہوں نے سڑک اور مکانات سے متصل ایک ایسا کشادہ راستہ قرار دیا جو سڑک سے کچھ بلند دکھائی دیتا تھا اور اس کے شروع اور آخر میں گھومنے والی لکڑی کی چرخی دراصل اس بات کی غمازی کرتی تھی کے یہ راستہ جانوروں یا گھڑ سواروں کے لیے نہیں بلکہ پیدل چلنے والوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ لندن میں صفائی اور کوڑا کرکٹ کی ری سائکلنگ کا نظام بھی منشی اعتصام الدین کی توجہ کا مرکز بنا۔ اعتصام نے مشاہدہ کیا کے لندن میں گلیوں میں گندگی پھیلانے کی سختی سے ممانعت تھی۔ اس لیے لوگ اپنے گھروں کے احاطوں کو صاف ستھرا

رکھتے جب کے کوڑے کرکٹ کو اپنے گھروں میں بنائے گئے گھڑوں میں پھینک دیتے۔ صفائی کا کام کرنے والی گاڑیاں ہفتہ میں ایک بار آکر ہر گھر سے اس قدرتی کھاد کو خرید کر لے جاتی اور شہر سے باہر لے جاکر کاشتکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیتیں۔ منشی اعتصام الدین کے لیے صفائی اور کوڑا کرکٹ کی ری سائیکلنگ کا یہ نظام اگرچہ انہوں نے اس کے لیے ری سائیکلنگ کی اصطلاح استعمال نہیں کی یقیناً حیران کر دینے والا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اس طریقہ کار کو برطانوی لوگوں کی عقلمندی کا شاخسانہ قرار دیا۔ جسکی بدولت وہ کوڑا کرکٹ جیسی معمولی چیز کو بھی کام میں لا کر اس سے نفع حاصل کر لیتے تھے۔ [۵۱]

منشی اعتصام الدین کی طرح منشی اسماعیل کو بھی لندن میں سڑکوں کے کنارے بنائے گئے فٹ پاتھ، اسٹریٹ لائٹس اور پانی کی فراہمی کا جدید نظام غیر معمولی عوامی سہولیات محسوس ہوئیں اسی لیے انہوں نے مختصر الفاظ میں ان سہولیات کے متعلق اپنے سفر نامے میں معلومات فراہم کیں مگر منشی اسماعیل کے اختصار کے باوجود ان عوامی سہولیات میں ان کی دلچسپی اور حیرت کے عنصر کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً منشی اعتصام الدین کی طرح منشی اسماعیل کو بھی سڑکوں کے کنارے بنائے گئے فٹ پاتھ ایک انوکھی مگر مفید چیز معلوم ہوئے کیونکہ ان کی بدولت پیدل چلنے والوں کو کسی سواری کی طرف سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا تھا۔ لندن کی اسٹریٹ لائٹس کے نظام میں منشی اعتصام الدین کی طرح منشی اسماعیل کے لیے بھی جو بات دلچسپی اور مسرت کا باعث بنی وہ یہ تھی کے لندن کی سڑکوں کے کنارے لگے شیشے کے فانوسوں کی روشنی ہر خاص و عام کو دستیاب تھی اور کسی کو بھی رات کے اندھیرے میں اپنا چراغ پکڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ لندن میں دریائے ٹیمز کے پانی کو لکڑی کی چرخیوں کی مدد سے زیر زمین نالیوں کی بدولت گھر گھر پہنچانے کا طریقہ کار منشی اسماعیل کے نزدیک دراصل برطانوی حکمت و دانائی کا شاخسانہ تھا۔ [۵۲]

یوں محسوس ہوتا ہے کے لندن منشی اعتصام الدین کے لیے وہ حیرت کدہ ثابت ہوا تھا جہاں ایک کے بعد ایک چیز ان کی توجہ اور داد حاصل کرنے کی منتظر تھی۔ منشی اعتصام الدین نے جہاں لندن کی بلند و بالا عمارتوں اور عوامی سہولیات کو بے حد سراہا وہیں انہیں لندن کی تفریح گاہیں، باغات اور پارک وغیرہ بھی بے حد پسند آئے جو ان کے نزدیک دراصل ایسی سہولیات تھیں جو لوگوں کو لطف و انبساط اور خوشی اور راحت پہنچانے کا سامان تھیں۔ انہوں نے شگرف نامہ میں لندن کے جن پارکوں اور تفریح گاہوں کا ذکر کیا اُن میں بادشاہ باغ، ناچ گھر، رقص خانہ خاکساں اور برٹش میوزیم کا حال شامل ہے۔ یوں تو منشی اعتصام الدین نے لندن کی ان تمام تفریح گاہوں کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کرنے میں بڑی گرمجوشی اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا مگر ان سب میں لندن کے ناچ گھر انہیں تفریح کے سستے اور سب سے دلچسپ ذرائع معلوم ہوئے۔ اعتصام کے مشاہدہ اور معلومات کے مطابق لندن میں چند ناچ گھر جیسے کم گارڈن، ماس،

مل اور کاک سال بہت مشہور تھے اور یہ ناچ گھر اتنے بڑے تھے کہ ایک وقت میں دس ہزار تک لوگ ان میں سما سکتے تھے۔ ان ناچ گھروں کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کو جو بات بہت پسند آئی وہ یہ تھی کے ان ناچ گھروں میں مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے اُن کی حیثیت کے مطابق بیٹھنے کی جگہیں بنائی گئی تھیں اور اسی حساب سے ٹکٹوں کی قیمتیں بھی رکھی گئی تھیں۔ چنانچہ اس طرح ان کے خیال میں ایک ہی جگہ پر غریب اور امیر لوگ بیک وقت سستے میں ہی نہایت عمدہ نغمات، قصے، کہانیاں، رقص، بازی گری، حیرت انگیز جادو اور کرتبوں کے علاوہ ورزشی کھیل بھی دیکھ لیتے تھے اور ان تماشوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

لندن میں تفریح کے ایسے ذرائع دیکھ کر منشی اعتصام الدین کو ہندوستان میں تفریح کے ایسے ذرائع دستیاب نہ ہونے کا قلق بھی ہوا اور انہوں نے ایسے ہندوستانیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو تفریح کے ایسے ذرائع ہندوستان میں دستیاب نہ ہونے کے باعث صرف ایک رات کے لیے ناچ گانا دیکھنے اور بھانڈوں کی نقلوں سے محظوظ ہونے کے لیے تیس چالیس سے لے کر ڈیڑھ سو روپیہ تک خرچ کر ڈالتے تھے اور اس طرح فضول خرچی کر کے اپنے باپ دادا کا پیسہ حرام کرتے تھے جبکہ انگلستان کے غریب اور امیر لوگ صرف چند روپوں کے عوض شاندار رقص و سرود اور تماشے دیکھ لیتے تھے۔ [۵۳] ناچ گھروں کے علاوہ لندن کے شاہی میوزیم (برٹش میوزیم) میں رکھے گئے خشکی اور تری کے نوادرات، ممیاں اور سمندری مخلوقات کے ڈھانچے بھی منشی اعتصام الدین کی توجہ کا مرکز بنے۔ [۵۴] جبکہ ولیم جیمس پارک کے سرسبز نظاروں نے اعتصام کو کشمیر کا حسن یاد دلا دیا اور بادشاہ باغ میں باغوں کے کناروں پر لگائی گئی مہندی کی ٹٹیوں نے انہیں ہندوستانی مہندی کی ٹٹیوں کی یاد دلا دی۔ [۵۵] ہندوستان اور انگلستان کے حوالے سے اعتصام کی بیان کردہ یہ مماثلتیں دراصل انگلستان قیام کے دوران ان کی ناسٹیلجیائی (Nostalgic) کیفیت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔

لندن کی تفریح گاہوں کے متعلق منشی اسماعیل نے بس اس قدر تذکرہ کیا ہے کہ وہ اپنے مالک مکان کے ساتھ دن کے وقت باغات اور راتوں کو عشرت کدوں میں جاتے جہاں انہیں عجیب و غریب تماشے اور تصاویر دیکھنے کو ملتیں۔ [۵۶] مگر منشی اعتصام الدین کی طرح منشی اسماعیل نے نہ تو ان باغات اور رقص کدوں کے نام بتائے اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات فراہم کیں۔ ڈگبی منشی اسماعیل کے تذکرہ کردہ باغات جن کا نام انہوں نے نہیں بتایا کہ متعلق قیاس کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> He does not mention by name Ranelag Garden and the Spring Gardens at Vauxhall,but these favourite

resorts were probably the pleasant gardens and wonderful tableaux,which he recalls. [۵۷]

سیاسی و ثقافتی اور تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اٹھارہویں صدی میں لندن علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بھی بن چکا تھا۔ چنانچہ لندن کا علمی ماحول اور آکسفورڈ جیسے تعلیمی ادارے منشی اعتصام الدین کی توجہ کا خاص مرکز بنے اور اس طرح منشی اعتصام الدین اٹھارہویں صدی کے وہ پہلے ہندوستانی سفر نامہ نگار ہیں جنہوں نے پہلی مرتبہ اپنے سفر نامے میں آکسفورڈ یونیورسٹی اور اس کے مختلف شعبہ جات کے متعلق اپنے مشاہدات پیش کیے۔ منشی اعتصام الدین نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے لیے بحیثیت مجموعی مدرسہ آکسفورڈ اور اس کے مختلف شعبہ جات کے لیے بھی مدارس کی اصطلاحیں استعمال کیں۔ مثلاً اعتصام نے آکسفورڈ کے جن دیگر شعبہ جات کے مشاہدات بیان کیے ان میں رصد خانہ، علم ہیئت کا مدرسہ اور مدرسہ طبیبہ شامل ہیں۔ منشی اعتصام الدین کو مدرسہ آکسفورڈ کی قدیم عمارت کے ساتھ ساتھ اس کا کتب خانہ (Bodleian Library) بھی بہت پسند آیا اور انہیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہاں عربی اور فارسی کی بہت سی کتب موجود تھیں۔ اس کتب خانے میں منشی اعتصام الدین کی ملاقات سر ولیم جونز سے ہوئی۔ ولیم جونز دراصل مستشرق تھے۔[۵۸] اور اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ کلکتہ کی عدالت میں ملازمت کرتے تھے۔ اس کتب خانہ میں عربی اور فارسی کی کتب کے علاوہ کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ اور فرہنگ جہانگیری کا خاتمہ جو منشی اعتصام کے مطابق انہوں نے کپتان سوینٹن کو نقل کر کے دیا تھا وہ بھی کتب خانے میں موجود تھا۔ جسے دیکھ کر منشی اعتصام الدین کو اندازہ ہوا کہ انگلستان میں جیسے ہی کوئی کتاب تالیف و ترجمہ ہوتی اسے فوراً کتب خانوں کی زینت بنا دیا جاتا۔ اس کتب خانے میں انہیں ایسی نادر و نایاب کتب اور تصاویر بھی دیکھنے کو ملیں جو ان کی رائے میں وہاں کے امراء و شرفاء دوسرے ممالک سے خرید کر لائے تھے۔ اسی طرح سنگِ مرمر سے بنے عمدہ مجسمے بھی ان کی نظروں سے گزرے جو ان کی رائے میں غالباً یونان اور مصر کے بنے ہوئے تھے۔ ان مجسموں کی عمدگی اور نفاست کو دیکھ کر اعتصام نے یہ رائے پیش کی کہ اگرچہ اٹھارہویں صدی میں انگلستان تمام علوم و فنون کا مرکز تھا مگر وہاں یونان و مصر جیسی عمدہ مجسمہ سازی اور مصوری کا کام ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم اعتصام کی رائے میں وہ لوگ قدیم اور نایاب تصاویر کے دلدادہ اور علم و ہنر کے قدردان ضرور تھے اور ایسی چیزوں کے حاصل کرنے میں وقت اور پیسہ لگانے سے گھبراتے نہیں تھے۔ منشی اعتصام الدین نے سفر نامہ میں انگریزوں کی فن کی قدردانی کے حوالے سے خاص طور کچھ حکایات بیان کیں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انگلستان کے لوگ چونکہ علم و ہنر کے ساتھ ساتھ انہیں حاصل کرنے والوں کی بھی قدر کرتے تھے اسی لیے ان کے ملک میں علم و ہنر کو ترقی حاصل ہوئی تھی جبکہ اس کے برعکس ہندوستان میں علم

وہنر کی ناقدری کے حوالے سے اعتصام نے یہ مؤقف پیش کیا کے ہندوستان میں کوئی شخص چاہے کتنا بھی ہنر سیکھ لیتا اور علم حاصل کر لیتا اُسے ذلیل وخوار ہی ہونا پڑتا تھا۔[۵۹] اعتصام غالباً اپنے جیسے منشیوں اور تعلیم یافتہ افراد کے علم وہنر کی ناقدری کے حوالے سے دلبرداشتہ تھے جنہیں معمولی سی نوکری حاصل کرنے کے لیے بھی دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی تھیں۔

آکسفورڈ کے کتب خانہ کے علاوہ منشی اعتصام الدین نے آکسفورڈ کے دیگر شعبہ جات کے متعلق اپنی عادت کے برخلاف اپنے مشاہدات قدرے اختصار سے بیان کیے۔ مگر اس اختصار کے باوجود ان مدارس کے حوالے سے ان کے بیان کردہ مشاہدات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے سائنسی علوم وفنون میں یورپی جدت اور ترقی دیکھ کر وہ متاثر ہوئے تھے۔ آکسفورڈ کے رصد خانہ کے حوالے سے اعتصام نے وہاں علم نجوم اور فن ہیت کی کتابوں کے علاوہ ایسی دوربینوں کا ذکر کیا جن سے ستاروں اور سیاروں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا جب کے علم ہیت کے مدرسے میں انہوں نے زمین وآسمان کے ماڈل اور زمین کا نقشہ دیکھ کر اس حوالے سے اپنے بہت سے شکوک وشبہات کو دور کیا۔ مدرسہ طبیہ میں اعتصام نے مشاہدہ کیا کہ انسانی اعضاء کو لوہے کی زنجیروں اور کیلوں کے ساتھ ایک ترتیب سے بہت حفاظت کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ اس لیے کوئی بھی شخص کسی بھی عضو کو براہِ راست دیکھ کر اس کے متعلق معلومات حاصل کر سکتا تھا۔[۶۰]

منشی اعتصام الدین کو جہاں علم وتعلیم کی ترسیل میں لندن کے مدرسہ آکسفورڈ کا کردار اہم معلوم ہوا وہیں منشی اسماعیل کو لندن میں خبروں کی جمع وترسیل میں قہوہ خانوں (کافی ہاؤسز) کے کردار نے متجسس کیا اور انہوں نے مشاہدہ کیا کے قہوہ خانے صرف کافی ہی پیش نہیں کرتے بلکہ خبروں کی ترسیل اور تبادلے کا بھی اہم ذریعہ تھے۔ وہاں آنے والے گاہک جو مختلف علاقوں، بازاروں، ممالک اور بندرگاہوں وغیرہ کے متعلق معلومات رکھتے تھے اس پر قہوہ خانے میں بیٹھ کر بات چیت کرتے تھے جبکہ قہوہ خانہ کا مالک جو قہوہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی کا کردار بھی نبھاتا تھا ان کی فراہم کردہ خبروں کو ایک سفید کاغذ پر مخبر کے نام، تاریخ اور وقت کے ساتھ تحریر کر کے پیسوں کے عوض طابع کے حوالے کر دیتا تھا اور پھر یہ اخبار ہفتہ وار یا ماہانہ وار بنیادوں پر متعلقہ لوگوں تک پیسوں کے عوض پہنچادیا جاتا تھا۔ اس طرح اس کاروبار کے ذریعے قہوہ خانوں کے مالک عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔[۶۱] یہاں ہمارے لیے یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہے کہ منشی اسماعیل کو برطانوی اخبار نویسی کا یہ طریقہ کار پسند نہ آیا اس لیے کے انہیں یہ طریقہ کار غیبت سے مشابہ ایک فعل معلوم ہوا جو ان کے نزدیک زنا سے بھی بڑا گناہ تھا کیونکہ ان کی رائے میں اس کے ذریعے دوسروں کے راز افشاں کیے جاتے تھے۔[۶۲] منشی اسماعیل کی برطانوی اخبار نویسی کے متعلق یہ رائے دراصل اس

بات پر دلالت کرتی ہے کے وہ چیزوں کو وسیع تر تناظر میں نہیں بلکہ اپنے مخصوص ثقافتی و معاشرتی تناظر اور روایات میں دیکھنے اور پرکھنے کے قائل تھے شاید اسی لیے انہیں اخبار نویسی کی اہمیت یا فوائد کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال منشی اسماعیل کی اٹھارہویں صدی کے انگلستان میں اخبار نویسی کے ابتدائی خدوخال اور ترسیل کے طریقہ کار کے متعلق فراہم کردہ معلومات یقیناً ہمارے لیے دلچسپ اور اہم ہیں۔

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لندن کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کے مشاہدات کافی وسیع تھے اور انہوں نے لندن کے حوالے سے تقریباً ہر وہ چیز بیان کرنے میں دلچسپی لی جس کی بدولت لندن اٹھارہویں صدی میں دنیا کا جدید ترین شہر بن گیا تھا۔ جیسے کے پختہ سڑکیں، روشن بازار، بلند و بالا اور خوبصورت عمارتیں، پانی کی ترسیل اور صفائی کا جدید نظام، تفریحی سہولتیں اور آکسفورڈ جیسے جدید تعلیمی ادارے ایسی چیزیں تھیں جن پر منشی اعتصام الدین نے اپنے مشاہدات صرف ایک نوآبادیاتی باشندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دانشور کی طرح وسیع تر تناظر میں اپنی ناقدانہ سوچ کو کام میں لاتے ہوئے پیش کیے۔ منشی اعتصام الدین کے مقابلے میں منشی اسماعیل کے لندن کے مشاہدات ان عوامی سہولیات اور لندن کی مادی ترقی کے شاہکاروں تک محدود رہے جو ان کے لیے دلچسپی یا حیرت کا باعث بنے تھے۔ تاہم ان دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں لندن کی مادی و صنعتی ترقی کے حوالے سے نہ تو ہندوستان سے کوئی خاص تقابل پیش کیا گیا اور نہ ہی اس حوالے سے ان کے ہاں کسی قسم کے احساس کمتری کے شائبہ کا تاثر ابھرتا ہے۔ البتہ منشی اسماعیل کے ہاں چیزوں کو اپنے مخصوص ثقافتی اور معاشرتی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا رجحان ضرور ملتا ہے جو ان کی ناقدانہ رائے کو ایک مخصوص دائرہ سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ مثلاً لندن کے قہوہ خانوں میں خبروں کی جمع و ترسیل کے طریقہ کار کو ان کی طرف سے غیبت قرار دیا جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کے وہ اپنی ناقدانہ سوچ کو اپنے مخصوص ثقافتی اور معاشرتی پس منظر تک محدود رکھے ہوئے تھے۔

۴۔ برطانوی سماجی و معاشرتی رجحانات اور رسم و روایات:

ہم دیکھتے ہیں کے کوئی بھی سماج تہذیب و تمدن، **ثقافت**، زبان و ادب اور رسوم و رواج جیسے شعبوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کے ہر خطے، ہر سماج کی **تہذیب و ثقافت**، رسم و رواج وغیرہ دوسرے سماج سے مختلف ہوتے ہیں مگر یورپی نوآبادیاتی نظام اپنے اندر چونکہ یورپ کی سماجی و ثقافتی مرکزیت کا **تصور** لیے ہوتا ہے اس لیے کسی نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکاروں کی طرح ان کی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج بھی اپنے اندر مثالی اور آفاقی ہونے کا تصور لیے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کے ہندوستان میں جیسے جیسے برطانوی نوآبادیاتی گرفت مضبوط ہوتی گئی ویسے ویسے ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں اور برطانوی نوآبادکاروں کے درمیان تہذیبی و ثقافتی

پیچیدگیاں بھی بڑھتی گئیں اور انیسویں صدی تک یہ تعلقات اتنے پیچیدہ ہو چکے تھے کے یورپی مستشرقین و مصنفین کی جانب سے ہندوستانیوں کے لباس اور کھانے پینے کے طریقہ کار تک کو وحشیوں، جنگلیوں اور جانوروں سے مشابہ قرار دیا گیا۔ جیسے کے سر سید احمد خان جنہوں نے انیسویں صدی میں یورپ کا سفر بھی اختیار کیا تھا انہوں نے اپنے ایک مضمون 'نئی تہذیب' میں خود اس بات کا اعتراف کیا کے یورپی ہندوستانیوں کو بندروں کے موافق قرار دیتے ہیں جو بندروں کی طرح زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں اور وہ ہندوستانیوں کے لباس کو وحشیوں کے لباس سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ [۶۳] یہی وجہ تھی کے انیسویں صدی میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں برطانیہ کا سفر کرنے والے تقریباً تمام ہندوستانی سفر نامہ نگاروں جیسے کے ابو طالب خان اصفہانی، یوسف خان کمبل پوش، لطف اللہ اور سر سید احمد خان وغیرہ نے برطانوی زندگی کے سماجی و ثقافتی مظاہر اور معاشرتی رویوں اور رجحانات وغیرہ کو خاص اہمیت دیتے ہوئے نہ صرف ان کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات پیش کیے بلکہ ان کے ہاں ہندوستانی اور برطانوی معاشرتی و سماجی زندگی کے بعض پہلوؤں پر دونوں اقوام کے رویوں اور رجحانات کا تقابل بھی پیش کیا گیا۔ مگر اٹھارہویں صدی کا نصف آخر چونکہ ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کا ابتدائی دور تھا اور برطانیہ میں یہ شرق شناسی کا بھی ابتدائی دور تھا۔ لہٰذا اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کے ہندوستانیوں اور برطانوی نوآبادکاروں کے درمیان تہذیبی و ثقافتی پیچیدگیاں بھی انیسویں صدی کے مقابلے میں نسبتاً کم تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کے اٹھارہویں صدی کے ہمارے تین ابتدائی ہندوستانی سفر نامہ نگاروں اعتصام الدین، منشی اسماعیل اور میر محمد حسین کے لیے برطانوی تہذیب و ثقافت اور سماجی و معاشرتی رجحانات ورویے یکساں طور پر اہم یا پسندیدہ موضوع نہیں تھا۔ اسی لیے ہمارے ان تینوں سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین کے علاوہ بقیہ دونوں سفر نامہ نگاروں نے برطانوی تہذیبی و معاشرتی اقدار اور رسم ورواج کو بالکل نظر انداز کیا اور ان کے متعلق اپنے سفر ناموں میں کسی قسم کے مشاہدات و تاثرات بیان کرنے سے گریز کیا۔ منشی اسماعیل کے ہاں بس لندن کی معاشرت کے چند ایک پہلو جو انہیں غیر معمولی محسوس ہوئے جن کا پہلے ذکر کیا گیا جیسے کے جارجین عہد کے لندن کے گھروں کی یکسانیت اور لوگوں کا گھروں اور دکانوں کے دروازے بند رکھنا کے علاوہ برطانوی معاشرت اور تہذیب و تمدن کے کسی اور پہلو کو منفرد یا اہم ہونے کی بنا پر اس کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی گئی۔ محمد حسین کے ہاں بھی برطانوی زندگی کے علمی رجحانات، سائنسی ترقی اور مذہب کے حوالے سے تو اگرچہ معلومات فراہم کرنے میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا گیا مگر برطانوی زندگی کے ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں کو ان کے ہاں بھی کوئی اہمیت نہیں ملی مگر ان دونوں سفر نامہ نگاروں کے برعکس ان کے ہم عصر منشی اعتصام الدین کے ہاں نہ صرف برطانوی سماجی و معاشرتی زندگی کے رجحانات کو اہمیت دیتے

ہوئے ان کی زندگی کے بعض اہم معاشرتی و سماجی رویوں اور رجحانات کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں بلکہ برطانوی لوگوں کی ثقافتی اور معاشرتی زندگی کے بعض رجحانات اور رسم و روایات کا ہندوستانی معاشرتی اور ثقافتی رجحانات اور رسم و روایات سے تقابل بھی پیش کیا گیا۔ یہاں تک کے بعض جگہ منشی اعتصام الدین کا پیش کردہ تقابل دراصل ایک نوآبادیاتی باشندے (وہ) کی طرف سے نوآبادکار (ہم) کے بعض تہذیبی و ثقافتی رویوں کی برتری پر دلالت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل اور منشی اعتصام الدین کی برطانوی زندگی کے حوالے سے سفر ناموں میں فراہم کردہ معلومات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کے وہ اپنی ثقافتی اور معاشرتی اقدار اور مذہبی حدود و قیود (حلال و حرام کی پابندی) اور غالباً انگریزی زبان میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے برطانوی لوگوں سے نہ تو زیادہ میل میلاپ بڑھا سکے اور نہ ہی ان میں گھل مل سکے۔ یہی وجہ ہے کے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں ہمیں ابو طالب اور انیسویں صدی کے بعض دوسرے سفر نامہ نگاروں کی طرح برطانوی لوگوں کی نجی محفلوں میں شرکت کرنے اور ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے قصے پڑھنے کو نہیں ملتے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کے انگلستان میں منشی اسماعیل کا حلقہ احباب ان کے مالک مکان مسٹر ولیم اور ان کے آقا مسٹر کیلاڈرسل کے حلقہ احباب اور عزیز و اقارب تک محدود رہا۔ جب کے منشی اعتصام الدین کا حلقہ احباب کپتان سوینٹن کے حلقہ احباب اور عزیز و اقارب تک محدود رہا۔ برطانوی سماجی اور معاشرتی رجحانات و رویوں اور رسم و روایات جن کا مشاہدہ اعتصام نے اپنی آنکھوں سے کیا تھا اور بعض کے متعلق معلومات انہیں اپنے یورپی احباب سے حاصل ہوئی تھیں ان کے حوالے سے اعتصام الدین کی توجہ کا مرکز زیادہ تر برطانوی متوسط طبقہ ہی رہا مگر چند ایک سماجی و معاشرتی اقدار میں تقابل کے واسطے برطانوی شرفاء اور نچلے طبقے کے رجحانات کے حوالے سے بھی معلومات فراہم کی گئیں۔

انگلستان میں منشی اعتصام الدین نے برطانوی لوگوں کے شادی بیاہ کے حوالے سے ہندوستان سے یکسر مختلف معاشرتی و ثقافتی رجحانات و رویے مشاہدہ کیے۔ اعتصام کے مشاہدہ اور معلومات کے مطابق برطانوی مردوں میں عموماً جلدی شادی کرنے کا رجحان نہیں پایا جاتا تھا بلکہ وہ چالیس برس کی عمر تک زیادہ تر روزگار کمانے اور دولت کے حصول میں مصروف رہتے تھے۔ اس مدت میں وہ دنیا کے دوسرے ممالک کی سیر کرتے اور عجائبات دیکھتے تھے۔ اس طرح وہ روزگار کمانے کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک کی سیر اور طرح طرح کے تجربات حاصل کرتے تھے اور مال و دولت جمع کر کے بے فکر ہو کر چالیس برس کی عمر میں شادی کرتے تھے۔ اس کے بعد سفر کو ترک کر دیتے تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارنا سے پسند کرتے تھے۔[۲۳] منشی اعتصام الدین نے برطانوی لوگوں کے شادی بیاہ کے

حوالے سے اس رجحان کو بہت سراہا جبکہ اس کے مقابلے میں ہندوستانی معاشرے کی اس رسم کو تنقید کا نشانہ بنایا جہاں والدین اپنے بچوں کی کم عمری میں ہی شادیاں کر دیتے تھے جب کے ان کے پاس کوئی معقول ذریعۂ روزگار بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح شادی کے بعد وہ اپنی ذمہ داریاں اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی بیویوں کو تنہا چھوڑ کر ملک کے دور دراز علاقوں یا دوسرے ممالک میں روزگار کی تلاش میں چلے جاتے تھے اور ان میں سے بعض کئی کئی برس تک اپنے گھروں اور بیویوں سے دور رہتے تھے اور اس طرح ان کی بیویوں کو ہجر و فراق کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔ لہٰذا شادی بیاہ کے حوالے سے اعتصام الدین نے برطانوی لوگوں کے طور طریقے اور رجحان کو ہندوستانی طور طریقوں اور رجحانات سے بہتر قرار دیا۔

> ولایت کے لوگ اس قسم کی جدائی کو عورتوں کے حق میں ظلم صریح سمجھتے ہیں اور اپنے مذہب و قانون میں اس کو بہت مذموم اور منحوس خیال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حق انہی کی طرف ہے۔ [۴۵]

برطانوی اشرافیہ میں لے پالک یا غریب بچوں کی شادی بیاہ کے حوالے سے پائی جانے والی رسم بھی اعتصام کو برطانوی لوگوں کے آپس کے بھائی چارے اور باہمی امداد کی ایک عمدہ مثال معلوم ہوئی۔ اعتصام کے مطابق برطانوی لوگوں میں یہ رسم پائی جاتی تھی کے امراء میں سے جب کوئی شخص کسی غریب لڑکے کی پرورش کرتا تو اخلاقی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اسکی شادی بیاہ کا بندوبست بھی کرتا مگر اس شادی کے اخراجات کے لیے وہ اپنے عزیز و اکارب سے مدد طلب کرتا۔ اعتصام نے اس مدد کو دراصل وہ چندہ قرار دیا جو ہندوستان میں لوگ کسی اچھے یا نیک مقصد کے پیش نظر لوگوں سے جمع کرتے تھے۔ اس جمع شدہ چندے کی بدولت اعتصام کی رائے میں اس غریب لڑکے کی شادی کی تقریب نہایت شاندار طریقے پر منعقد کی جاتی اور شادی میں شرکت کرنے والے مہمان رونمائی میں دلہن کو اتنا سونا اور چاندی دیتے جس سے اس غریب لے پالک کی مالی امداد بھی ہو جاتی اور اس کا گھر بھی بس جاتا۔ برطانوی غریب لوگوں کا شادی بیاہ کے حوالے سے اعتصام نے یہ رجحان دیکھا کے زیادہ تر غریب لوگ اپنی مفلسی کے باعث شادی ہی نہ کرتے تھے۔ [۴۶]

شادی بیاہ کے علاوہ اعتصام الدین نے اپنے سفر نامے میں اٹھارہویں صدی کے برطانوی لوگوں خاص کر زمینداروں اور جاگیر داروں کی گھریلو زندگی کے رجحانات و معاملات جیسے کے رہائش، خوراک، کاروبار، میاں بیوی کی ذمہ داریوں کے علاوہ برطانوی لوگوں کی کثرتِ اولاد، اور جائیداد کی تقسیم کے حوالے سے عمیق مشاہدات اور دلچسپ تبصرے پیش کیے۔

اعتصام کی رائے میں انگلستان کے زمینداروں اور جاگیرداروں کے پاس جب اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت

کافی ہو جاتی تو وہ جہاں کہیں بھی ہوتے وہاں سے اپنے ملک جاتے اور وہاں جاکر زمین خریدتے اور اپنے لیے گھر بنواتے۔ اپنی اور اپنے خاندان والوں کی خوراک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے گھر کے احاطے میں پالتو جانور پالتے۔ ان جانوروں سے اپنی گوشت، دودھ، دہی، بالائی اور پنیر کی ضروریات کو پورا کرتے جب کے گھر میں بنائے گئے باغیچے میں مختلف سبزیاں اور پھول اگاتے۔ جن میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی فروخت کر دیتے اور زمینداری کو اپنا ذریعہ معاش بناتے۔ ان میں سے کچھ لوگ کمائی گئی دولت کو سود پر دے کر ہر ماہ اس سے منافع حاصل کرتے جب کے کچھ لوگ شرکت میں تجارتی کاروبار کرتے اور اپنے تجارتی مال کو تجارتی جہازوں پر دوسرے ممالک میں بھجواتے اور اس طرح نفع و نقصان میں برابر کے حصہ دار بن جاتے۔ اعتصام کے مطابق برطانوی امراء کی زندگی بھی قدرے سادہ تھی اور ان کے ہاں ہندوستان کے امراء کی طرح کئی کئی ملازم رکھنے کا رواج نہیں تھا بلکہ ان کے ہاں ایسے ملازم رکھنے کا رواج تھا جو ایک وقت میں کئی کام کرنے کے قابل ہوتے۔ میاں بیوی کی گھریلو ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کے گھر کا حساب کتاب بیوی کی ذمہ داری تھی جب کے گھر کا مالک گھر کا خرچ چلانے کے علاوہ عموماً سیر و تفریح اور شکار جیسی سرگرمیوں میں مشغول رہتا تھا۔[۶۷]

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی لوگوں کی کثرتِ اولاد اور بڑے بڑے خاندان بنانے کے رجحان کو بھی انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ اعتصام کے مشاہدہ کے مطابق وہاں ایک شخص کے اگر پچیس بچے تھے تو دوسرے کے اگر کم بھی تھے تو پندرہ تھے اور اسی طرح بچوں کی کم سے کم تعداد رکھنے والے گھرانوں میں بھی سات، آٹھ بچے لازمی تھے مگر ان کے لیے یہ بات باعثِ حیرت تھی کہ کثرتِ اولاد کے باوجود زیادہ تر بچے زندہ رہتے تھے۔[۶۸]

انگلستان کے حوالے سے پیش کیے گئے تاریخی مطالعات اور اعداد و شمار سے بھی دراصل یہ بات ہمیں ثبوت کے ساتھ ملتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک انگلستان کی صنعتی ترقی کے زمانہ میں بہتر معیارِ زندگی، سائنسی ترقی اور صحت کی بہتر سہولیات کی فراہمی سے شرحِ اموات میں کمی، زرعی ترقی سے پیداوار میں اضافہ اور خوراک کی فراوانی وغیرہ چند ایسے عوامل تھے جن کی بنا پر انگلستان کی آبادی دوگنی سے بھی زیادہ ہو گئی۔[۶۹]

وراثت و جائیداد کی تقسیم کا نیا برطانوی قانون اپنی افادیت اور جدت کی بنا پر منشی اعتصام الدین کو برطانوی دانشوروں کی دانائی اور عقلمندی کا شاخسانہ معلوم ہوا۔ اعتصام کی معلومات کے مطابق برطانوی قوم کے مذہبی قانون کے مطابق تو اگرچہ باپ کی وفات کے بعد اس کی دولت و جائیداد کے حق دار تمام بیٹے ہی ٹھہرتے تھے مگر برطانوی

دانشوروں کو چونکہ اس مذہبی وراثتی قانون میں چند خامیاں نظر آئیں اور انہوں نے اس حوالے سے یہ دلیل پیش کی کے اگر باپ کے مرنے کے بعد اس کی دولت یوں تمام بیٹوں میں تقسیم کر دی جائے گی تو تھوڑی تھوڑی کئی جگہ تقسیم ہو کر کم ہو جائے گی اور اس طرح دولت کی کمی کے باعث عوام میں غربت بڑھے گی۔ اس لیے اس نقطہ نظر کو مد نظر رکھتے ہوئے برطانوی دانشوروں نے جو نیا وراثتی قانون متعارف کروایا اس کی رو سے باپ اگر چاہے تو اپنی زندگی میں اپنی نقد رقم تمام بیٹوں میں تقسیم کر سکتا تھا مگر باپ کی وفات کے بعد اس کی تمام جائیداد کا مالک و مختار بڑا بیٹا قرار پاتا تھا۔ لیکن اگر دوسرے بھائی کم عمر اور غیر شادی ہوتے تو ان کی کفالت اور تعلیم کے اخراجات اس بڑے بھائی کی ذمہ داری ہوتی جو باپ کی دولت اور جائیداد کا مالک و مختار ہوتا مگر جب چھوٹے بھائی جوان ہو جاتے اور اپنی تعلیم مکمل کر لیتے تو وہ اپنا الگ کاروبار کرنے، گھر بنانے، زمینداری کرنے اور سرمایہ کاری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح منشی اعتصام الدین نے نئے برطانوی وراثتی قانون کو جو ان کے مذہبی وراثتی قانون سے یکسر مختلف تھا بے حد سراہا اور ان کے مطابق برطانویوں کے اختراع کردہ اس قانون نے برطانوی معاشرے کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ [۷]

اعتصام کے برطانوی معاشرتی و سماجی زندگی کے مشاہدات کا دائرہ کار برطانوی شادی بیاہ کی رسومات اور گھریلو زندگی کے رجحانات تک محدود نہ رہا بلکہ انہوں نے برطانوی لوگوں کی عملی زندگی کے رجحانات خاص کر فکر معاش اور علم و ہنر کی تحصیل کے حوالے سے ان کے سماجی و معاشرتی رویوں کا نہ صرف بغور مشاہدہ کیا بلکہ فکر معاش اور علم و ہنر کے حصول کے حوالے سے اپنائے گئے برطانوی اقوام کے رویوں نے انہیں حیران و متاثر بھی کیا۔ منشی اعتصام الدین کے لیے اگرچہ یہ بات حیران کن تھی کے برطانوی لوگوں کی اکثریت مادیت پرست تھی اور وہ لوگ مذہب اور آخرت پر زیادہ ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وہ لوگ مذہب اور آخرت کی فکر کی بجائے دنیا کی زندگی اور آسائشوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ عملی زندگی کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کی رائے میں زیادہ تر برطانوی لوگوں کا یہی رجحان تھا کے وہ لوگ آغاز جوانی سے لے کر بڑھاپے تک علم و ہنر کی تحصیل کے علاوہ کسی اور کام میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ منشی اعتصام الدین نے اگرچہ عملی زندگی کے حوالے سے اختیار کردہ ان برطانوی رویوں کو بے حد سراہا مگر انہیں اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کے برطانوی لوگوں کے عملی زندگی کے حوالے سے اختیار کردہ ان سنجیدہ رویوں کے پیچھے دراصل ان برطانوی قوانین کا بھی بہت عمل دخل تھا جو برطانوی سماجی و معاشرتی زندگی کی فلاح و بہبود کی خاطر بنائے گئے تھے اور ان پر سختی سے عمل درآمد کروایا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی لوگوں کو ان پر عمل کرنا پڑتا تھا اور یہی قوانین ان کی خوشحالی کے ضامن تھے۔ اس لیے اعتصام کی رائے میں اگر کوئی برطانوی نوجوان اتفاقاً یا جان بوجھ کر علم و ہنر کی تحصیل میں سستی

کرتا اور استعداد ہونے کے باوجود نہ تو کوئی ہنر سیکھتا اور نہ ہی کوئی پیشہ اختیار کرتا بلکہ ہندوستانی نوجوانوں کی طرح اپنا وقت کھانے، پینے، سونے اور کھیل و تفریح میں ضائع کرتا تو پہلے اسے عدالت کی طرف سے تنبیہ و نصیحت کی جاتی اور اگر اس نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوتا تو عدالت کی طرف سے اسے سزا کا سامنا کرنا پڑتا۔[۱] یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ منشی اعتصام الدین نے اگرچہ بحیثیت مجموعی ہندوستانی نوجوانوں کو سست اور کاہل اور فکر معاش اور حصول علم کے حوالے سے غیر سنجیدہ رویوں کا حامل قرار دیا جب کہ انہوں نے عملی زندگی کے حوالے سے ہندوستانی رجحانات رکھنے والے برطانوی نوجوانوں کی تعداد کو بہت کم قرار دیا مگر اس مماثلت میں یہ بات بھی اہم ہے کہ انہوں نے بحیثیت مجموعی سخت قوانین کے باوجود بھی برطانوی نوجوانوں کو علم و ہنر اور فکر معاش کے حوالے سے غیر سنجیدہ رویوں سے مبرا قرار نہ دیا۔ بہر حال منشی اعتصام الدین کی رائے میں باپ کے ترکہ سے ملنے والی دولت برطانویوں کے لے در حقیقت مال مفت نہ تھی کہ جسے وہ جیسے چاہیں خرچ کر ڈالیں بلکہ ان کے لیے وہ دولت کو بڑھانے اور زندگی کو بہتر بنانے کا ایک ذریعہ تھی۔ منشی اعتصام الدین نے برطانوی اور ہندوستانی نوجوانوں کے عملی زندگی اور علم و ہنر کی تحصیل میں دلچسپی کے حوالے سے ان کے رجحانات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی اشرافیہ اور مڈل کلاس طبقے کے افراد اور ہندوستانی اشرافیہ کے علمی و ادبی ذوق کا بھی تقابل پیش کیا۔ اعتصام کا پیش کردہ یہ تقابل دراصل ہمیں فرانز فینن کے نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ اس نظریے سے اتفاق کرنے میں مدد دیتا ہے جس میں نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکاروں کے علوم و ادب کو اعلیٰ جب کہ نوآبادیاتی باشندوں کے علوم و ادب کو نوآبادکاروں کی طرف سے فرسودہ اور ادنیٰ ہونے کا تصور دیا جاتا ہے اور ان علوم و ادب کو نوآبادیاتی اقوام کے زوال اور ذہنی پسماندگی کا باعث قرار دیا جاتا ہے اور ان کے سامنے اپنے علوم و فنون کو مثالی اور آفاقی بنا کر بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جب کے نوآبادیاتی باشندوں میں سے اکثر اپنے اور اپنے علم و ادب کے متعلق نوآبادکاروں کے پیش کردہ تصورات سے اتفاق کرتے ہوئے نوآبادکاروں کے علوم و ادب کو مثالیہ اور آفاقی تصور کر لیتے ہیں۔[۲] مثلاً منشی اعتصام الدین کے مشاہدہ کے مطابق انگلستان میں ایسے افراد جن کی عمریں ستر، اسی برس کے قریب تھیں اور انہوں نے اپنی جوانی کے زمانے میں محنت و مشقت سے اتنی دولت جمع کر لی تھی کہ اس عمر میں وہ فکر معاش سے آزاد تھے مگر اعتصام کی رائے میں انہوں نے خود کو علم کی تحصیل سے آزاد نہ کیا تھا بلکہ وہ لوگ عمر کے اس حصے اور فارغ البالی کے اس زمانے میں بھی علم ہیئت کے حصول، تاریخی کتب کی تصنیف اور ایسے علوم و فنون میں خود کو مصروف رکھے ہوئے تھے جو عامتہ النّاس کے لیے فائدہ مند ہو سکتے تھے۔ اعتصام نے برطانوی اشرافیہ کے ان رجحانات کو بہت سراہا جب کے ان کے مقابلے میں ہندوستانی اشرافیہ کے اس رجحان کو تنقید کا نشانہ بنایا جو اپنی عمر کو برطانوی لوگوں کی طرح فائدہ مند علوم و ہنر کی تحصیل

کی بجائے فارسی اور ہندی کی ایسی شاعری جس میں عاشق و معشوق اور شراب و ساقی کے ذکر کے سوا اور کچھ نہ ہوتا، ضائع کرتے تھے اور موزوں فارسی تراکیب و اصطلاحات اور استعارات کی تلاش میں خوامخواہ اپنے دماغ کو الجھاتے رہتے تھے۔ منشی اعتصام الدین ہندی و فارسی شاعری کی بے معنویت و بے افادیت کے حوالے سے دراصل انگریزی خیالات کے زیر اثر تھے۔ جیسے کے اعتصام کے مطابق:

> ولایت کے لوگ اس طرح کی شاعری مقالہ نگاری کو بے کار اور بے فائدہ سمجھتے ہیں اور دواوین کو اسم باسمّی اجان کر مصنف کو دیوانہ کہتے ہیں۔ [۳۷]

منشی اعتصام الدین کے اس بیان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندی-فارسی ادب و شاعری کے خلاف ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور سے اور برطانیہ میں مستشرقیت اور شرق شناسی کے ابتدائی دور میں برطانوی نوآبادکاروں کی طرف سے پروپیگنڈہ کا آغاز ہو چکا تھا جس کی انتہائی صورت ہمیں بلاشبہ میکالے کی پیش کردہ تعلیمی رپورٹ میں ہندی-فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں اور علوم کی یورپی زبانوں اور ادب اور علوم کے مقابلے میں کم مائیگی کی صورت میں سند کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ ہندی و فارسی شاعری کے حوالے سے خود منشی اعتصام الدین کی رائے سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی علمی و ادبی رجحانات کے متعلق مغربی نوآبادکارانہ سوچ نے ہماری ہندوستانی اشرافیہ اور تعلیم یافتہ طبقے کی سوچ کو بھی کسی قدر تیزی سے بدلنا شروع کر دیا تھا۔

منشی اعتصام الدین نے برطانوی سماجی و معاشرتی رویوں اور رجحانات کو بحیثیت مجموعی صحت مندانہ اور مثبت سوچ کے حامل رویے اور رجحانات قرار دیا اور انہوں نے برطانوی فلاسفہ کے اس نقطہ نظر کو کہ دولت کے حصول کے لیے محنت و کوشش دراصل فہم و فراست کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی رہنمائی کا ذریعہ بھی بنتی ہے بے حد سراہا۔ اعتصام کی رائے میں اسی لیے برطانوی لوگ آغاز جوانی سے لے کر چالیس برس کی عمر تک علم و ہنر کی تحصیل اور دولت کمانے کی طرف خوب توجہ دیتے تھے۔ اس عرصہ کے دوران وہ دوسرے ممالک کی سیر و سیاحت کرتے اور اپنے علم و تجربے کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے اتنا مال و دولت جمع کر لیتے کہ پھر بے فکر ہو کر چالیس برس کی عمر میں شادی کرتے اور فکر معاش سے آزاد ہو کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے اور فارغالبالی اور بزرگی کے زمانہ میں فائدہ مند علوم کی تحصیل اور ترسیل میں خود کو مصروف رکھتے۔ برطانوی لوگوں کے برعکس منشی اعتصام الدین نے ہندوستانیوں کے بعض سماجی و معاشرتی رویوں کو غیر سنجیدہ اور غیر عقلمندانہ قرار دیا اور خاص طور پر مغلیہ سلطنت کے امرء و اراکین کے غیر سنجیدہ رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ جن کے پاس اگرچہ دولت کی کمی نہ تھی مگر وہ اپنی دولت کو برطانوی امراء کے برعکس فائدہ مند کاموں اور مشاغل میں صرف کرنے

کے بجائے اپنی عیش و عشرت اور شان و شوکت کی نمود و نمائش میں ضائع کر دیتے تھے۔ جب کے انگریز دولت کی ایسی نمود و نمائش کو غیر عقلمندانہ فعل قرار دیتے تھے۔ جیسے کے اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ :

> صرف کھانے پینے اور عیش و عشرت، عورتوں کے ساتھ رقص و سرود کا جشن منانے سے نہ دولت ملتی ہے نہ عزت اور جس طرح مغلیہ سلطنت کے امراء وارا کین سلطنت پیشواز نما پائجامے مسّی آلود ہونٹوں، کاجل لگی آنکھوں اور گھونگھریالے بالوں کی آرائش کے ساتھ سواریوں پر نکلتے ہیں مصاحبیں اور جوبدار آگے پیچھے دور باش، ہوش بیہوش اور عمر و دولت زیادہ باد، کی آوازیں لگاتے ہیں۔ اس کو انگریز شان و شوکت نہیں سمجھتے بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ نازنین صورت مردوں کو ناکارہ اور ان کے طریقوں کو لچر پوچ خیال کرتے ہیں۔ [۷۴]

منشی اعتصام الدین کو جہاں برطانوی معاشرے کے چند ایک سماجی و معاشرتی رویے اور رجحانات اور ثقافتی رسم و روایات مثالیہ اور آفاقی معلوم ہوئیں وہیں انہوں نے برطانوی سماج کی چند ایک برائیوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ سفر نامے میں منشی اعتصام الدین کی برطانوی نو آباد کاروں کے متعلق بیان کردہ اچھائیوں اور صفات کا پلڑا اگرچہ ان کی بیان کردہ برائیوں کے مقابلے میں کافی بھاری معلوم ہوتا ہے مگر برطانوی نو آباد کاروں کی برائیاں بیان کر کے دراصل منشی اعتصام الدین نے اس آفاقی حقیقت کو نظر انداز نہیں ہونے دیا کے کوئی قوم چاہے کتنی بھی مہذب یا ترقی یافتہ ہو برائیوں سے مبّرا نہیں ہو سکتی۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق برطانوی لوگوں میں کچھ ایسی مشترک سماجی برائیاں پائی جاتی تھیں جن کا وہ خود بھی اعتراف کرتے تھے۔ ان کے مشاہدہ کے مطابق ان کے ہاں ایک گالی جس کا مطلب تھا 'خدا کا قہر ہو تم پر' اگرچہ عام لوگوں کے تو زبان زد عام تھی مگر شرفاء اور اہل علم لوگ اس گالی کو بکنا اپنے تئیں بہت برا خیال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ منشی اعتصام الدین نے جن برائیوں کا ذکر کیا ان میں برطانوی لوگوں کا جوا کھیلنا، گفتگو کے دوران ایک دوسرے کو چور ڈاکو کہہ کر پکارنا اور طیش دلانا اور لڑائی کے لیے اکسانا یا پھر قتل کر ڈالنا جیسے ناپسندہ افعال شامل ہیں۔ [۷۵]

۵۔ برطانوی صنعتی و زرعی ترقی کے مشاہدات

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ برطانیہ میں زرعی و صنعتی ترقی کا زمانہ تھا۔ مشہور برطانوی صنعتی انقلاب جو تقریباً ایک صدی (۱۷۶۰ء-۱۸۶۰ء) پر محیط تھا اس کے ذریعے پہلے پہل برطانیہ اور پھر پورے یورپ میں زراعت، کان کنی اور مواصلات میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس نے یورپ کی سماجی و معاشی زندگی پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک برطانیہ میں انسانی اور حیوانی مشقت کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ اس

طرح کپڑے کی صنعت اور لوہے کی صنعت کو ترقی حاصل ہوئی جس کی وجہ سے کوئلے کا استعمال بڑھا۔ اس دور میں کوئلے کی مدد سے چلنے والے بھاپ انجن متعارف کروائے گئے۔[۴۶] اس طرح ہم دیکھتے ہیں کے اٹھارہویں صدی کا نصف آخر دراصل برطانوی معاشرے میں زرعی و صنعتی تبدیلیوں کا دور تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے تین سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین وہ سفر نامہ نگار تھے جنہوں نے منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل کے بعد سب سے آخر میں ۱۷۷۵ء-۱۷۷۶ء میں سفر یورپ اختیار کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگلستان میں اگرچہ زرعی و صنعتی انقلاب کا زمانہ شروع ہو چکا تھا مگر اس کے ثمرات ابھی پوری طرح حاصل نہ ہوئے تھے۔ اسی لیے ہمارے ان ابتدائی سفر نامہ نگاروں کے ہاں برطانوی زرعی اور صنعتی ترقی کے کچھ خاص حوالے نہیں ملتے اور نہ ہی اس حوالے سے انیسویں صدی کے سفر نامہ نگاروں کی طرح کوئی جوش و خروش نظر آتا ہے کیونکہ انیسویں صدی دراصل یورپ میں زرعی و صنعتی انقلاب کے عروج کا زمانہ ہے۔ تاہم اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کی ابتدائی دہائیوں میں بھی برطانیہ میں صنعتی و زرعی ترقی کے کچھ آثار ضرور رونما ہو چکے تھے۔ جیسے کے شگرف نامہ ولایت میں منشی اعتصام الدین نے برطانیہ کی زرعی و صنعتی ترقی کے حوالے سے اپنی مشاہدہ کردہ چند ایک چیزوں کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات پیش کرنے میں بھی خاص دلچسپی لی۔ اس حوالے سے انہوں نے خاص طور پر پانی اور ہوا سے چلنے والی چکیوں کا ذکر کیا جو آٹا پیسنے اور بیجوں سے تیل نکالنے کا کام کر رہی تھی۔ زرعی ترقی کے حوالے سے منشی اعتصام الدین نے لندن کے بادشاہ باغ میں مشاہدہ کیا کے مصنوعی طریقے (گرین ہاؤس ایفیکٹ) کے ذریعے ہندوستان جیسے گرم خطے کے پھلوں کو بھی انگلستان میں پیدا کیا جا رہا تھا۔ دیہاتی مناظر کے بیان میں منشی اعتصام الدین کی سرسبز کھیتوں کی احاطہ بندی، ان میں کھلے خوبصورت اور رنگ برنگے پھولوں کی مختلف قسمیں اور زرعی پیداوار میں جو، گیہوں، ساگ، مونگ اور سرسوں کے ذکر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کے منشی اعتصام الدین نے برطانیہ میں اگرچہ صنعتی و زرعی انقلاب کا ترقی یافتہ نہ سہی مگر کسی قدر خوشحال زمانہ ضرور دیکھا تھا۔ زراعت اور کھیتی باڑی کے علاوہ منشی اعتصام الدین نے مشاہدہ کیا کے برطانیہ میں 'لائیو سٹاک' کا محکمہ بھی کافی ترقی یافتہ تھا اس لیے کے برطانیہ میں مختلف جانور نہ صرف ہندوستان کے جانوروں سے زیادہ صحت مند تھے بلکہ تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ اعتصام نے اپنے سفر نامہ میں برطانیہ میں پائے جانے والے مختلف جانوروں اور پرندوں کی قسمیں بیان کرنے علاوہ ان کے مصرف بیان کرنے کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ مثلاً برطانیہ میں پائے جانے والے گھوڑوں کے متعلق اعتصام نے یہ رائے پیش کی کے یہ ہندوستان میں پائے جانے والے گھوڑوں سے زیادہ صحت مند تھے اور وہ لوگ ان گھوڑوں کو ہل جوتنے اور بار برداری کے لیے استعمال

کرتے تھے۔اعتصام کے مطابق برطانوی لوگ اس بات پر حیران ہوتے تھے بلکہ ہندوستانیوں کی ہنسی اڑاتے تھے کے وہ گھوڑوں کی بجائے بیلوں سے ہل جوتنے کا کام لیتے تھے۔

پالتو جانوروں کے علاوہ برطانوی شکاری کتے بھی اعتصام الدین کی توجہ کا مرکز بنے۔اعتصام کی رائے میں برطانیہ میں شکاری کتوں کو خاص تربیت فراہم کی جاتی تھی اور ان سے ایسے حیرت انگیز کام لیے جاتے تھے جو انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔'' ان سب چیزوں کے علاوہ برطانیہ میں ڈاک اور مسافروں کو منزل مقصود تک پہنچانے والی تیز رفتار گھوڑا گاڑیاں نیز مسافروں کے قیام وطعام کے لیے بنائے گئے مسافر خانے منشی اعتصام الدین کو مسافروں کے لیے فراہم کردہ جدید اور بہترین سہولیات معلوم ہوئیں۔

غرض کے منشی اعتصام الدین کو انگلستان کی مادی، صنعتی وزرعی ترقی اور عوامی سہولیات سے لے کر عوامی رویوں تک ہر چیز نے بے پناہ متاثر کیا۔ منشی اعتصام الدین نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دراصل ایک ایسے دور میں انگلستان کا سفر اختیار کیا تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان میں معاشی لوٹ کھسوٹ اپنے عروج پر تھی۔ جس کی بدولت ہندوستان دن بدن کنگال اور ہندوستانی عوام بے حال جب کے برطانیہ اور برطانوی عوام خوشحال ہو رہے تھے اور وہاں زرعی و صنعتی انقلاب کے ثمرات تیزی سے نمودار ہو رہے تھے۔اس لیے اعتصام کو برطانوی معاشرے میں ہر چیز بہتر سے بہترین کی طرف سفر کرتی ہوئی دکھائی دی۔ جب کے برطانویوں کے مقابلے میں انہیں ہندوستان اور ہندوستانی عوام بالترتیب غیر ترقی یافتہ، غیر سنجیدہ اور فرسودہ رسم وروایات کے حامل دکھائی دیئے کے جن کا ملک رفتہ رفتہ غیروں کے قبضہ میں جارہا تھا مگر انہیں اس بات کا احساس تک نہ تھا۔

۶۔ برطانوی، فرانسیسی، اسکاٹش اور ہائی لینڈی باشندوں کے درمیان افتراقات و اختلافات

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کو انگلستان کے بحری سفر کی بدولت کچھ دیگر یورپی ممالک اور ان میں بسنے والی اقوام کو دیکھنے اور ان کے متعلق جاننے کا موقع بھی میسر آیا تھا۔ جیسے کے منشی اسماعیل نے تاریخ جدید میں انگلستان کے علاوہ پرتگال میں مختصر قیام کا ذکر کیا۔اسی طرح میر محمد حسین نے اپنے سفر نامے میں انگلستان کے علاوہ جن ممالک کے سفر کا ذکر کیا ان میں فرانس، پرتگال اور مصر کا نام لیا۔ جب کے منشی اعتصام الدین نے انگلستان کے علاوہ فرانس اور اسکاٹ لینڈ کا سفر بھی اختیار کیا تھا۔ ہمارے ان تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین کے حوالے سے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کے انہوں

نے اپنے ان دونوں ہم عصر سفر نامہ نگاروں کے برعکس انگلستان کے علاوہ نہ صرف فرانس، اسکاٹ لینڈ اور ہائی لینڈ کے لوگوں کی زندگی کے متعلق عمومی معلومات جیسے کے ان ممالک کے باشندوں کی خوراک، لباس، زرعی پیداوار، موسمی و جغرافیائی حالات اور چند ایک سماجی ومعاشرتی اقدار کے متعلق معلومات فراہم کیں بلکہ انہوں نے برطانوی، فرانسیسی، اسکاٹش اور ہائی لینڈی باشندوں کے درمیان نسلیت اور قومیت پرستی کی بنا پر پائے جانے والے اختلافات اور ان اقوام کے باشندوں کی ایک دوسرے کے متعلق تمسخر آمیز آراءاور رویوں کو بیان کرنے میں بھی دلچسپی لی۔ شگرف نامہ ولایت میں مختلف یورپی اقوام کی علیحدہ قومی شناخت اور انفرادی حیثیت کے متعلق منشی اعتصام الدین نے اپنے ہندوستانی قارئین کو جن میں زیادہ تر یورپ کو محض انگریزوں یا ان اقوام کی سرزمین سمجھتے تھے جنہیں وہ بحیثیت مجموعی فرنگی کہہ کر پکارتے تھے معلومات فراہم کرتے ہوئے منشی اعتصام الدین لکھتے ہیں:

> انگلینڈ کے رہنے والوں کو انگریز کہتے ہیں اور اسکاٹ لینڈ کے باشندوں کو اسکاچ کہا جاتا ہے اور انگلینڈ کے معنی ہیں زمین۔ انگلش اور فرانس کی زبان میں انگل بھی کہتے ہیں۔ انگلینڈ کے معنی انگریزوں کا ملک اور ملک فرانس کو فرالیس کہتے ہیں انگریزی میں فرنچ مین کہا جاتا ہے اور ولندیزوں کو ہوکنڈ کہا جاتا ہے کیونکہ ولان ملک ولندیز کا نام ہے اور ہوانیدہ سے ولان کے رہنے والے مراد ہیں۔ [۴۸]

منشی اعتصام الدین جس بحری جہاز میں سوار تھے۔ وہ فرانس کے شہر پارب پور بالون کے ساحل کے قریب لنگر انداز ہوا اور بعد ازاں فرانسیسی تجارتی کوٹھی کے گھاٹ پر پہنچایا گیا۔ اس جہاز سے سامان وصول کر کے لندن جانے میں انہیں تقریباً ایک ماہ لگ گیا۔ اس مختصر عرصہ کے دوران انہیں فرانس کے شہر پارب پور بالون اور کیپ کرن میں قیام کا موقع ملا جبکہ فرانس کے دارالحکومت پیرس کے متعلق معلومات انہیں فرانسیسی باشندوں کی زبانی معلوم ہوئیں۔ منشی اعتصام الدین چونکہ خود بھی بنگال کے ایک قصبہ سے تعلق رکھتے تھے اس لیے فرانس میں پارب پور بالون اور کیپ کرن میں قیام کے دوران بھی ان کی توجہ کا مرکز زیادہ تر کسانوں کا طرز زندگی اور دیہاتی مناظر جیسے کے ان علاقوں کے لوگوں کی طرز تعمیرات، خوراک، لباس اور زرعی پیداوار ہی رہے مثلاً کیپ کرن کی زرعی پیداوار کے متعلق انہوں نے مشاہدہ کیا کے وہاں گیہوں، جو، دھان، مونگ، چنا اور مٹر کی کاشت کی جاتی تھی جب کے لیموں، انار، انگور اور بیدانہ وغیرہ بھی وہاں انگلستان کے مقابلے میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ منشی اعتصام الدین کے مشاہدہ کے مطابق وہاں کے لوگوں میں غربت بہت تھی اور ان غریب لوگوں کی خوراک جو کی روٹی اور آش جو تھی جب کے لباس پشمینہ یا موٹے کپڑے کا پہنتے تھے۔ اکثر لوگوں کو اپنی غربت کے باعث جوتے اور موزے میسر نہ تھے۔ فرانس کے حوالے سے یہ عجیب بات منشی اعتصام الدین کے مشاہدہ میں آئی خاص کر شہر پارب پور بالون کے باشندوں کے

حوالے سے انہوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ ان لوگوں کے پاؤں میں لکڑی کے جوتے تھے جسے پہن کر وہ مزاحیہ انداز میں چلتے تھے۔ اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق کپتان سوینٹن اور مسٹر بیکاک ان لوگوں کے جوتے دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے اور اس کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ یہ لوگ چونکہ انگریزوں کے مقابلہ میں محنت اور مشقت میں سست اور کاہل تھے اس لیے غریب تھے اور جوتے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ [۹۲]

شہر پیرس کی خوبصورتی اور علوم و فنون کے حوالے سے اس کی اہمیت کے متعلق جو معلومات منشی اعتصام الدین کو حاصل ہوئیں ان کے مطابق شہر پیرس فرانس کا دارالحکومت تھا۔ یہ شہر بہت وسیع اور خوب صورت تھا۔ منشی اعتصام الدین نے فرانسیسی نقطہ نظر کے پیش نظر فرانسیسی اور انگلش لوگوں کے درمیان علمی و ادبی اور سماجی اقدار کے حوالے سے موازنہ بھی پیش کیا۔ مثلاً اعتصام کی رائے میں فرانسیسیوں کے مطابق وہ لوگ صنعت و حرفت، ایجادات و اختراعات اور علم و حکمت میں مہارت رکھتے تھے اور اخلاق و عادات اور خوش گفتاری میں انگلستان اور دوسرے فرنگی ممالک کے لوگوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ علوم و فنون میں فرانسیسیوں کی انگریزوں پر برتری کے حوالے سے انہوں نے فرانسیسیوں کے اس دعویٰ کو بھی بیان کیا کہ انگلستان کے لوگ موسیقی اور گھڑ سواری کی تعلیم فرانس کے استادوں اور ماہرینِ فن سے حاصل کرتے تھے اور اس مقصد کے لیے امراء اپنے بچوں کو فرانس کی تعلیم گاہوں میں بھیجتے تھے۔ اسی لیے فرانسیسیوں کی رائے میں انگریزوں نے علم و ہنر اور تجارت وغیرہ میں اٹھارہویں صدی تک جو ترقی حاصل کی تھی وہ دراصل فرانس کی تربیت کی ہی مرہونِ منت تھی۔ مزید یہ کہ بغیر فرانسیسیوں کی تربیت اور علم و ہنر کے اکتساب کے انگریز بھی گزشتہ زمانے میں اکثر "حماقت" اور "سادہ لوحی" میں ہندوستانیوں کی طرح مشہور تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان علم و ہنر کی برتری کے حوالے سے اعتصام کے پیش کردہ دلائل جہاں گزشتہ زمانے میں فرانسیسیوں کی انگریزوں پر تہذیبی اور علمی و فنی برتری کا تاثر اجاگر کرتے ہیں وہیں گزشتہ زمانے کے انگریزوں کو موجودہ زمانے (اٹھارہویں صدی) کے سادہ لوح اور نادان ہندوستانیوں کی مانند قرار دینا دراصل اس اہم نقطہ کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کراتا ہے کہ یورپی نوآبادکاروں نے ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور سے ہی ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کو یورپیوں کے مقابلے میں کم علم اور کم عقل ثابت کرنے کے لیے دراصل ان کے متعلق بیوقوف، نادان اور سادہ لوح جیسی اصطلاحات مشہور کر رکھی تھیں تاکہ یورپیوں کے ساتھ ساتھ خود ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ بٹھا دیا جائے کہ وہ یورپیوں جیسے علوم و فنون اور ہنر نہ جانتے تھے۔ اس لیے تہذیبی اور علمی اعتبار سے ان سے کم حیثیت تھے۔

بہرحال منشی اعتصام الدین کو فرانس میں قیام کے دوران فرانسیسیوں کی انگریزوں پر علمی و عقلی برتری اور

ان کے درمیان پائی جانے والی نسلی مخاصمت کے متعلق بھی کافی کچھ جاننے کا موقع ملا تھا۔ چناچہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> فرانسیسی کہتے ہیں کے انگریز بہت ذلیل وخوار قوم ہے، کیونکہ وہ تلاش معاش اور کاروبار وغیرہ کا ڈھنگ سیکھنے کے لیے دوسرے ملکوں میں بھی جاتے ہیں،اس لیے کے جاہل و گنوار ہیں اور کمانے کے طریقوں اور ہنر مندی سے محروم ہیں۔ [۸۰]

فرانسیسی انگریزوں کو علوم وفنون اور ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کرنے میں اس قدر پسماندہ سمجھتے تھے کے اعتصام کی رائے میں فرانسیسیوں کے مطابق اگر انگریز علم وہنر اور کاروبار وغیرہ کے ڈھنگ سیکھنے کے لیے دوسرے ممالک میں نہ جاتے تو ان کی کوئی عزت اور قدر و منزلت نہ ہوتی اور نہ ہی کوئی انہیں اہمیت دیتا۔ اس طرح یہ لوگ بے سر وسامان رہ جاتے۔ فرانسیسیوں کا انگریزوں کی مختلف علوم وفنون میں ترقی کو اپنی تربیت کا مرہون منت قرار دینا نیز خود کو تہذیبی واخلاقی اقدار میں تمام یورپی اقوام سے برتر قرار دینا اس بات پر دلالت کرتا ہے کے فرانسیسی علمی وتہذیبی برتری کے تصور میں مبتلا تھے۔ منشی اعتصام الدین چونکہ انگریزوں کے گزشتہ ماضی اور سیاسی تاریخ سے کسی حد تک واقفیت رکھتے تھے اور موجودہ زمانے میں ان میں آنے والی انقلابی تبدیلیوں سے بھی آگہی رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ بھی فرانسیسیوں کی علم وہنر میں انگریزوں پر برتری کا اقرار کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> فرانس کے لوگ ہر ہنر اور فن میں ماہر ہیں جہاں جاتے ہیں ہر دل عزیز ہو جاتے ہیں۔ ان کی قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ [۸۱]

منشی اعتصام الدین نے اگرچہ گزشتہ زمانے میں علم وہنر اور مختلف فنون میں انگریزوں پر فرانسیسی برتری کا اقرار ضرور کیا مگر انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کے فن سپہ گری میں انگریز بہت مہارت رکھتے تھے۔ بہر حال فرانسیسیوں کی علم وادب میں دلچسپی اور ہنر وفنون میں مہارت نے انہیں بہت متاثر کیا۔ اس لیے انہوں نے شگرف نامہ میں فرانسیسیوں کے متعلق چند ایک ایسی حکایات بیان کرنے میں دلچسپی لی جو بحیثیت مجموعی فرانسیسی قوم کے عقلمند ہونے پر دلالت کرتی تھیں۔

اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے متعلق اگرچہ اعتصام الدین جانتے تھے کہ انگلستان کے ساتھ الحاق کر چکے تھے مگر انہوں نے الگ ممالک کی حیثیت سے اسکاٹ لینڈ اور ہائی لینڈ کے جغرافیہ، آب وہوا، لوگوں کے رہن سہن، اسکاٹش

اور ہائی لینڈ کے باشندوں کی صفات اوران یورپی اقوام کی ایک دوسرے کے متعلق تمسخر آمیز آراء نیز اسکاٹ لینڈ کے انگلستان کے ساتھ الحاق کے متعلق بھی معلومات فراہم کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔

منشی اعتصام الدین نے کپتان سوینٹن کے ہمراہ اسکاٹ لینڈ کا سفر کیا تھااور انہیں اسکاٹ لینڈ کے صدر مقام ادمیرہ (ایڈنبرگ) میں کپتان سوینٹن اوران کے ماں باپ کی رہائش گاہ میں کچھ عرصہ قیام کا موقع بھی ملا تھا۔ اس لیے یہ ممکن ہے کے اسکاٹ لینڈ کی سیاسی تاریخ اور چند ایک سماجی روایات کے متعلق جو مختصر معلومات منشی اعتصام الدین نے شگرف نامہ میں درج کیں ان کا ماخذ و منبع کپتان سوینٹن ہی رہے ہوں۔

انگلستان سے اسکاٹ لینڈ کی جغرافیائی حدود کا تعین کرتے ہوئے منشی اعتصام الدین نے جو معلومات فراہم کیں ان کے مطابق اسکاٹ لینڈ انگلستان کے شمال میں واقع تھااور دونوں ممالک کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ اسکاٹ لینڈ کے گزشتہ معاشی و اقتصادی حالات اور انگلستان سے الحاق کے متعلق جو تجزیہ انہوں نے پیش کیااس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کے وہ اسکاٹ لینڈ کی گزشتہ سیاسی تاریخ اور اقتصادی حالات کے متعلق بھی کسی قدر معلومات رکھتے تھے۔ لہذا اعتصام کی معلومات کے مطابق انگلستان کی اطاعت اختیار کرنے سے پہلے اسکاٹ لینڈ کا اپناالگ بادشاہ ہوا کرتا تھا مگر اسکاٹ لینڈ اور انگلینڈ کے درمیان تعلقات کچھ اچھے نہ تھےاور دونوں ممالک کے بادشاہوں کے درمیان لڑائی جھگڑا رہتا تھا مگر جب اسکاٹ لینڈ کا آخری بادشاہ وفات پا گیااور ان دونوں ممالک کا چونکہ مذہب اور قانون بھی ایک تھالہذا اسکاٹ لینڈ کے امراءوارا کین نے باہمی رضامندی سے اٹھارہویں صدی میں انگلینڈ کی اطاعت قبول کر لی مگر منشی اعتصام الدین کو اس بات کا بخوبی علم تھا کے انگلستان کی اطاعت قبول کرنے کے باوجود دونوں ممالک کے باشندوں کی اپنی الگ الگ قومی شناخت برقرار تھی۔ اس لیے اسکاٹ لینڈ کے باشندے اسکاچ اور انگلینڈ کے باشندے انگریز کہلاتے تھے۔ اسکاٹ لینڈ کی سیاسی و معاشی تاریخ کے متعلق اعتصام کو جو معلومات حاصل ہوئیں ان معلومات نے انہیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں مدد دی کے انگلستان کی اطاعت قبول کرنے سے دراصل اسکاٹ لینڈ کو بہت سے معاشی فوائد حاصل ہوئے جیسے کے ان کے تجزیہ کے مطابق انگلستان کی اطاعت قبول کرنے سے پہلے اسکاٹ لینڈ میں خوشحالی کم تھی اور یہ ملک زیادہ تر ویران میدانوں اور پہاڑی علاقوں پر مشتمل تھا مگر انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کے بعد ان کی مدد سے انہیں مختلف پیشے اور ہنر سیکھنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی ساتھ کمپنی میں ملازمت اور تجارت کرنے کے مواقع میسر آئے جس سے اسکاچ لوگوں کی حالت میں بہتری آئی۔ آبادی بڑھی اور مالدار بھی ہو گئے۔

اعتصام الدین کو جس نسلی اور قومی برتری کا مظاہرہ فرانسیسیوں اور برطانویوں کے درمیان دیکھنے کو ملا تھا ایسے

ہی نسلی تفاخر کا مظاہرہ انہیں اسکاٹش اور برطانوی باشندوں کے درمیان بھی دیکھنے کو ملا۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق اگرچہ اسکاٹش لوگ اپنی کم خوری اور بہادری جیسی صفات میں مشہور تھے مگر انگریز اسکاٹش لوگوں کو غریب اور کم عقل سمجھتے تھے۔ جب کے دوسری طرف اسکاٹش بھی خود کو انگریزوں سے برتر سمجھتے تھے۔ اعتصام کی معلومات کے مطابق دونوں ملکوں کی زبان اگرچہ انگریزی تھی مگر کچھ الفاظ میں اختلاف بھی تھا انہوں نے اس اختلاف کو ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کی کے اسکاٹ لینڈ کے لوگ اپنے گھوڑے کو بونی بونی کہتے تھے مگر انگریز اسے لٹل ہارس کہتے تھے۔

اسکاٹ لینڈ میں قیام کے دوران منشی اعتصام الدین کو اسکاٹش باشندوں کی چند ایک سماجی روایات جو یقیناً انہیں برطانوی معاشرے کی سماجی اور ثقافتی روایات سے قدرے مختلف اور منفرد معلوم ہوئیں ان کے متعلق بھی شگرف نامہ میں معلومات فراہم کرنا ضروری خیال کیا۔ مثلاً شادی بیاہ کے حوالے سے اعتصام کی رائے میں اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کا عمومی رجحان یہ تھا کے وہاں لڑکے اور لڑکی کی پسند سے شادی ہوتی تھی۔ شادی کے واسطے لڑکے کے لیے ضروری شرائط میں جو چیزیں شامل تھیں اُن میں ایک تو یہ تھی کہ لڑکا شکل وصورت میں اچھا ہو نیز یہ کہ دولت مند بھی ہو۔ لیکن لڑکی کے انتخاب کی شرائط میں اعتصام کے لیے یہ بات حیران کن تھی کے وہ لوگ حسن، سلیقہ اور دولت میں دولت کو تمام خوبیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا ایسی لڑکیاں جو غریب خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں اکثر کنواری ہی رہ جاتی تھیں۔ جیسا کہ منشی اعتصام الدین نے اس حوالے سے کپتان سوینٹن کی بہن کو بطور مثال پیش کیا جو خوبصورت ہونے کے باوجود کنواری تھی مگر اس کی عمر کافی ہو چکی تھی۔[۸۲] اعتصام کو اسکاٹش لوگوں کی یہ رسم اور وہاں کی خوبصورت عورتوں کی یہ ناقدری ناگوار گزری۔ مگر اس کے برعکس اعتصام کو اسکاٹش امراء اور اشرافیہ میں رائج ایک رسم کافی دلچسپ معلوم ہوئی جس کے مطابق اسکاٹش امراء اور اشرافیہ اپنے آباؤاجداد میں سے کسی مشہور شخص کے نام کو اپنے نام کے ساتھ منسوب کر لیتے تھے اور مہر پر اس کا نقش کندہ کرا کے کتابوں اور دوسری چیزوں پر اپنی الگ شناخت کے لیے لگاتے تھے۔ جیسے کہ کپتان ارجیالڈ سوینٹن کے نام میں سوینٹن نام کی جو وجہ تسمیہ اعتصام کو معلوم ہوئی اس کے مطابق سوینٹن انگریزی میں سفید خنزیر کو کہا جاتا تھا اور چونکہ کپتان کے اجداد میں سے کسی بہادر شخص نے سفید جنگلی خنزیر کو مارا تھا اسی لیے اس خاندان کو یہ لقب ملا اور انہوں نے نسل در نسل اس لقب کو اپنے نام کا حصہ بنالیا لہذا سوینٹن، کپتان ارجیالڈ سوینٹن کا دراصل خاندانی نام تھا۔

منشی اعتصام الدین نے مشاہدہ کیا کے اسکاٹش معاشرہ ذات پات، حسب نسب اور طبقاتی تقسیم میں بٹا ہوا تھا اس حوالے سے اعتصام نے اسکاٹش امراء واشرافیہ کے عمومی رویوں کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ رائے

پیش کی کے اسکاٹ لینڈ کے اشرافیہ ان لوگوں کو جواچھے خاندانوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے مگر اتفاقاً امیر ہو جاتے تھے اچھا نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی انہیں اپنے ہم رتبہ خیال کرتے تھے بلکہ انہیں اسی پیچ ذات یا پیشے کے حوالے سے پکارتے تھے جس سے ان کے باپ دادا وابستہ تھے جیسے کسی کو موچی اور کسی کو سنار کہہ کر پکارتے تھے اور اس طرح انہیں کم حیثیت اور پیچ ہونے کا احساس دلاتے رہتے تھے۔[۸۳]

برطانیہ، فرانس اور اسکاٹ لینڈ کے علاوہ منشی اعتصام الدین نے شگرف نامہ میں اسکاٹ لینڈ کے شمال میں واقع ہائی لینڈ کے جغرافیائی و موسمی حالات اور وہاں کے باشندوں کی معاشی و اقتصادی حالت کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہائی لینڈی باشندوں کی صفات نیز دیگر یورپی اقوام کی ان کے متعلق آراء بیان کرنے میں بھی خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ ہائی لینڈ کے جغرافیائی اور موسمی حالات کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے اعتصام الدین نے لکھا کے اس کی سرحد اسکاٹ لینڈ سے متصل تھی اور یہ اسکاٹ لینڈ کے مضافات میں شمال کی جانب واقع تھا۔ اس ملک میں آبادی کم اور جنگل اور میدان زیادہ تھے۔ اس ملک کے موسمی حالات کچھ اس طرح کے تھے کے بارہ ماہ برف باری اور بارشوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لیے وہاں سردی بہت ہوتی تھی مگر اعتصام کی رائے میں وہاں کے غریب باشندے سردی برداشت کرنے کے عادی تھے۔ اعتصام نے ہائی لینڈی باشندوں کے رہن سہن، لباس اور زرعی پیداوار کے متعلق جو معلومات فراہم کیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کے انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کے ہائی لینڈ میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کی نسبت غربت بہت زیادہ تھی۔ اسی لیے اعتصام کی رائے میں ہائی لینڈ کے باشندوں کی مالی و اقتصادی حالت چونکہ زیادہ اچھی نہ تھی اس لیے غریب تھے۔ ان غریب لوگوں کا لباس محض ایک ٹوپی اور ایک لبا کرتا تھا جسے وہ ستر چھپانے کے لیے کافی خیال کرتے تھے اور ان کی غربت کا یہ عالم تھا کے انہیں پہننے کے لیے جوتے اور موزے دستیاب نہ تھے۔ اس لیے پاؤں میں لکڑی کے ٹکڑے کو تسمے سے باندھ کر جوتے کا کام لیتے تھے۔[۸۴] ہائی لینڈی باشندوں کی غربت زدہ زندگی کے حقائق بیان کرنے کے علاوہ اعتصام نے ان کی کچھ ایسی صفات اور خامیاں بیان کرنے میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا جو دوسری یورپی اقوام میں ان کے متعلق مشہور تھیں۔ مثلاً اعتصام کی معلومات کے مطابق ہائی لینڈ کے لوگ اگرچہ اپنی بہادری میں مشہور تھے مگر انتہائی احمق اور کم عقل تصور کیے جاتے تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے چند مقامی حکایات کو جو گردش میں تھیں، بیان کیا جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ واقع ہی کم عقل اور بے وقوف تھے۔ ہائی لینڈ کے باشندوں کے حوالے سے منشی اعتصام الدین نے اپنی گفتگو کا اختتام ان الفاظ میں کیا:

> اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو برابر عقل و فہم کے ساتھ پیدا نہیں کیا ہے۔ کوئی ملک بے وقوفوں اور کم

عقلوں سے خالی نہیں ہے۔ خاص طور پر دیہات کے اکثر لوگ بہت سادہ لوح اور نادان ہوتے ہیں۔[۸۵]

برطانوی، فرانسیسی، اسکاٹش اور ہائی لینڈی باشندوں کی سماجی و معاشرتی زندگی کے مشاہدات نیز ان ممالک کی معاشی اور اقتصادی صورت حال پر پیش کردہ اعتصام الدین کے تاثرات یقیناً اس بات پر دلالت کرتے ہیں کے انہیں برطانیہ نہ صرف معاشی و اقتصادی اعتبار سے بیان کردہ یورپی ممالک سے زیادہ ترقی یافتہ معلوم ہوا بلکہ وہ سماجی اور معاشرتی اقدار اور علوم وفنون میں بھی برطانوی برتری کے قائل ہوئے۔اعتصام کو اگرچہ اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ تھا کے مختلف یورپی اقوام میں قومیت، نسلیت اور علمی و فکری ترقی کی بنا پر خود کو اعلی و برتر جب کے دوسری یورپی اقوام کو کمتر سمجھنے کا رجحان پایا جاتا تھا مگر اس کے باوجود انہیں اسپینیوں کی انگریزوں کے متعلق رائے جان کر بہت حیرت ہوئی اور وہ ہمیں اسپینیوں کی انگریزوں کے متعلق بیان کردہ رائے سے اختلاف کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کے اعتصام کی معلومات کے مطابق چونکہ امریکہ میں موجود سونے کی کانوں پر اسپینیوں کا قبضہ تھا اس لیے اسپین میں دولت کی فراوانی تھی اس کے علاوہ محنت اور مشقت کرنے میں بھی اسپینی بہت مشہور تھے مگر اعتصام کی رائے میں باقی یورپی اقوام کی طرح اسپینی بھی انگریزوں کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور انگریزوں کو چست و چالاک ہونے کے باوجود سست اور کاہل قرار دیتے تھے۔[۸۶]

اعتصام الدین کی ان یورپی ممالک اور اقوام کے متعلق پیش کردہ معلومات دراصل ہمیں اٹھارہویں صدی کے اُس دور میں لے جاتی ہیں جب مختلف یورپی اقوام دنیا کے مختلف خطوں میں تجارتی و دیگر مقاصد کے پیش نظر نوآبادیات قائم کرنے کی دوڑ میں شامل تھیں اور اس حوالے سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتی تھیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ۱۴۹۲ء سے وسط اٹھارہویں صدی تک اسپین، پرتگال، انگلینڈ، فرانس اور نیدرلینڈ، امریکہ اور ہندوستان سمیت دنیا کے مختلف ممالک پر اپنی نوآبادیات قائم کرنے میں مصروف رہے۔ اسی لیے اس زمانے میں اعتصام الدین کی ان اقوام کی آپس میں ایک دوسرے کے حوالے سے فراہم کردہ آراء سے ان کے درمیان پائی جانے والی مخاصمت اور نسلی تفاخر کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے مثلاً منشی اعتصام الدین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق

انگریز فرانسیسیوں کو سست اور کاہل قرار دیتے تھے جبکہ فرانسیسی انگریزوں کو جاہل و گنوار قرار دیتے تھے کیونکہ وہ علوم و فنون اور ہنر کی تحصیل کے لیے فرانس کی تربیت گاہوں میں جاتے تھے اس لیے فرانسیسی انگریزوں کی ترقی کو اپنی فراہم کردہ تربیت کا مرہونِ منت قرار دیتے تھے۔ اسکاٹ لینڈ کے لوگ جو انگلستان کی اطاعت اختیار کر چکے تھے مگر اس کے باوجود خود کو اعلیٰ نسل، بہادر اور انگریزوں سے برتر قرار دیتے تھے جب کے انگریز انہیں غریب اور کم عقل سمجھتے تھے۔ اسی طرح یورپی اقوام میں ہائی لینڈ کے لوگوں کے متعلق بھی یہ مشہور تھا کہ وہ انتہائی احمق اور کم عقل تھے جبکہ اسپینی انگریزوں کو سست اور کاہل قوم قرار دیتے تھے۔

یوں مختلف یورپی اقوام کی ایک دوسرے کے متعلق ہتک آمیز آراء کے متعلق جو معلومات اعتصام الدین نے فراہم کیں ان سے نہ صرف ان یورپی اقوام کے درمیان نسلی و قومی امتیازات کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے منظر نامہ میں مختلف یورپی اقوام (انگریز، فرانسیسی، اسپینی اور روسی وغیرہ) نہ صرف دنیا کے مختلف خطوں میں اپنی نوآبادیاتی کالونیاں بنانے اور ان کی تعداد بڑھانے میں مصروف تھیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے اور دوسری یورپی اقوام کے متعلق ایسے بیانیوں اور قصے کہانیوں کی تشہیر میں بھی مصروف تھیں جن سے معلوم ہو سکے کہ اُن سے بہتر، بہادر اور محنتی قوم خطہ یورپ میں کہیں نہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سید طفیل احمد منگلوری علیگ،مسلمانوں کا روشن مستقبل(دہلی:کتب خانہ عزیزیہ،۱۹۴۵ء)، ص ۳۷۔۳۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۴۲۔۴۳۔

۳۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی،تاریخ جنگِ آزادی ہند ۱۸۵۷ء(لاہور:یو پبلشرز،۲۰۰۷ء)، ص ۱۰۱۔

۴۔ سید طفیل احمد منگلوری علیگ، ایضاً، ص ۴۷۔

۵۔ ایضاً، ص ۵۴۔

۶۔ سید خورشید مصطفیٰ رضوی، ایضاً، ص،۱۰۹۔۱۱۰

۷۔ پی۔جے۔مارشل(P.J.Marshall)، Presidential Address: Britain and the World in the Eighteenth Century :I,Reshaping the Empire, Royal History society, vol.8(1998),p.1., http://www.jstore.org/stable/3679286 تاریخ ملاحظہ جنوری ۳،۲۰۲۰ ۔

۸۔ ناصر عباس نیر،لسانیات اور تنقید(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۹ء)، ص ۲۴۔۲۵۔

۹۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، مترجم جواد ہمدانی، بنیاد، شمارہ۵ (۲۰۱۴ء)، ۱۴۲۔

۱۰۔ میر محمد حسین لندنی،مشاہدات فرنگ، مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی(لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، سن ندارد)، ص،۲۲۸۔

۱۱۔ منشی اعتصام الدین،شنگرف نامۂ ولایت ۱۷۶۷ء۔۱۷۶۹ء مترجم امیر حسن نورانی(پٹنہ: خدابخش اورینٹل لائبریری،۱۹۹۵ء)، ص،۲۱

۱۲۔ ایضاً، ص،۲۰

۱۳۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص،۲۔

۱۴۔ ایضاً، ص،۱۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص،۱۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص،۳۰۔

۱۷۔ ایضاً، ص،۱۱۸۔

۱۸۔ ایضاً، ص،۳۱۔

۱۹۔ ایضاً، ص،۳۷۔۹۳۔

۲۰۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً،۱۵۔۱۶

۲۱۔ منشی اسماعیل،تاریخ جدید، ایضاً، ص،۱۴۷

۲۲۔ کیپ کدوب(Cape of Good Hope)ایک پتھریلا چٹانی جزیرہ ہے جو جنوبی افریقہ کی طرف بحر او قیانوس کے ساحل پر واقع ہے۔ بار تھولو موڈاز(Bartolomen Dias)وہ پہلا یورپی (پرتگالی) سیاح تھا جو اس جزیرے پر ۱۲ مارچ ۱۴۸۸ء میں پہنچا۔ اس نے اس جزیرے کو اس کے موسمی حالات کی بنا پر Cape of storms کا نام دیا۔ پرتگالیوں کو اس جزیرہ سے ہندوستان اور مشرق کی طرف پہنچنے کی ایک اچھی امید نظر آئی اس لیے بعد ازاں جان دوم (John II)نامی پرتگالی شخص نے خیر سگالی کے طور پر اس جزیرے کو Cape of Good Hope کا نام دیا۔ پرتگالیوں کے دریافت کردہ اسی راستے سے بعد ازاں واسکوڈے گاما ہندوستان پہنچ گیا۔ (تاریخ ملاحظہ ،۲۵ دسمبر ۲۰۱۹ء)

Http://en.m.wikipedia.org>wiki

۲۳۔ منشی اسماعیل، تاریخ جدید، ایضاً، ص،۱۴۷۔۱۴۸۔

۲۴۔ جزیرہ سنتلین(Saint Helena)جنوبی بحر او قیانوس میں واقع ایک آتش فشانی جزیرہ ہے جو دراصل دنیا کے دور دراز جزائر میں سے ایک ہے۔ ۱۵۰۲ء میں جب پرتگالیوں نے اسے دریافت کیا تو یہ ایک غیر آباد جزیرہ تھا۔ پرتگالیوں نے اس جزیرے کو آباد کیا، یہاں چند ایک مکانات اور ایک گرجا بھی تعمیر کیا۔ ۱۶۵۷ء میں اولیور کروم ویل (Oliver Cromwell)نے ایک چارٹر کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس جزیرے پر اپنی حکومت قائم کرنے کا اختیار دے دیا۔ اس طرح یہ جزیرہ بھی برطانیہ کی قائم کردہ ابتدائی نو آبادیوں میں شامل ہو گیا اور یہاں کمپنی نے ایک قلعہ اور کچھ مکانات تعمیر کیے۔ اس تعمیر کردہ قلعے کو جیمز فورٹ اور شہر کو جیمز ٹاؤن کا نام دیا گیا۔ ۱۶۷۳ء میں صرف چند ماہ کے لیے اس جزیرے پر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبضہ کر لیا مگر جلد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے زیر نگیں آ گیا۔ ایک طویل عرصہ تک یہ جزیرہ افریقہ اور ایشیا سے یورپ جانے والے بحری جہازوں کی گزر گاہ رہا۔ انیسویں صدی میں دخانی جہازوں کے استعمال اور بحیرہ احمر کے راستے کی دریافت کی وجہ سے اس جزیرے پر بحری جہازوں کا انحصار کم ہوتا گیا۔ (تاریخ ملاحظہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۹ء)

http://en.m.wikipedia.org>saint....

۲۵۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، ایضاً، ص،۱۴۹۔۱۵۰۔

۲۶۔ سائمن ڈگبی، An eighteenth century Narrative of a journey-from Bengal to England: Munshi Ismail's New history" ، *Urdu and Muslim South Asia* مرتب کرسٹوفر شیکل(Christopher Shackle)(لندن: سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، ۱۹۸۹ء)، ص،۵۶۔

۲۷۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، ایضاً، ص،۱۵۱۔۱۵۲۔

۲۸۔ سائمن ڈگبی، ایضاً، ص،۵۶

۲۹۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، ایضاً، ۱۵۲۔

۳۰۔ منشی اعتصام الدین، شنگرف نامۂ ولایت، ایضاً، ۳۵۔

۳۱۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، ایضاً، ص، ۱۵۳۔۱۵۴۔

۳۲۔ ایضاً، ص، ۱۶۳۔۱۶۴۔

۳۳۔ OlD Bailey،London History, 1715.1760، بتاریخ ملاحظہ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۵ء
http://www.oldbailyonline.or/

۳۴۔ فرانز فینن، افتادگان خاک، مترجم سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۶ء)، ص ۳۲۔۳۷۔

۳۵۔ منشی اعتصام الدین، شنگرف نامہ ولایت ۱۷۶۷ء۔۱۷۶۹ء مترجم امیر حسن نورانی (پٹنہ: خدابخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء)، ص ۴۶۔۴۷۔

۳۶۔ مرزا ابوطالب اصفہانی، سفر نامہ فرنگ مترجم ثروت علی (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۴ء)، ص، ۱۲۸۔

۳۷۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۱۳۳۔

۳۸۔ ایضاً، ص، ۴۸۔۴۹۔

۳۹۔ محمد زاہد سعید، "شاہانِ مغلیہ کا طلسماتی اور روحانی فنِ تعمیر"، *Watch Live*(بلاگ)، Geo.tv، ۱۱ فروری، ۲۰۱۷ء۔

۴۰۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۵۰۔

۴۱۔ ایضاً، ص، ۴۹۔

۴۲۔ منشی اسماعیل، ایضاً، ص، ۱۶۰۔

۴۳۔ سائمن ڈگبی، An Eighteenth Century Narrative of a journey from Bengal to England: Munshi Ismail's New History، مشمولہ *Urdu and Muslim* ایضاً، ص، ۵۸۔

۴۴۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۵۲۔

۴۵۔ ایضاً، ص، ۱۳۰۔

۴۶۔ منشی اسماعیل، ایضاً، ص، ۱۶۱۔

۴۷۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۵۳۔

۴۸۔ کروہ، اسم مذکر ہے جس کے معنی ہیں کوس یعنی چار ہزار گز زمین کی مسافت، بعض کے نزدیک تین ہزار گز کا فاصلہ۔ فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم (دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۷ء)، "کروہ"، ص ۱۵۸۷۔

۴۹۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، ایضاً، ص ۱۵۷۔

۵۰۔ منشی اعتصام الدین، شنگرف نامہ ولایت، ایضاً، ص، ۵۳۔

۵۱۔ ایضاً، ص، ۵۴۔۵۵۔

۵۲۔ منشی اسماعیل،ایضاً،ص،۱۶۰۔

۵۳۔ منشی اعتصام الدین،ایضاً،ص،۵۵۔۵۶۔

۵۴۔ ایضاً،ص،۶۵۔۶۶۔

۵۵۔ ایضاً،ص،۵۲۔

۵۶۔ منشی اسماعیل،ایضاً،ص،۱۵۸۔

۵۷۔ سائمن ڈگبی، An Eighteenth Century Narrative of a journey from Bengal To England: Munshi Ismail's New History مشمولہ *Urdu and Muslim*، ایضاً،ص،۵۷۔

۵۸۔ سر ولیم جونز:(Sir William Jones 1746_ 1794) کا شمار برطانیہ کے ابتدائی نامور مستشرقین میں ہوتا ہے۔وہ ۲۵ ستمبر ۱۷۸۳ء میں کلکتہ کی سپریم کورٹ میں بطور جج تعینات ہوئے۔برطانیہ میں شرق شناسی اور مستشرقیت کے فروغ میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔"گرامر آف دی پرشین لینگویج"اور"ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال"کا قیام مستشرقیت کے حوالے سے ان کی اہم خدمات ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ہندو اور مسلم وراثتی قوانین سے مغرب کو متعارف کروانے کے حوالے سے بھی اہم کردار ادا کیا۔

"Sir William Jones" ,BRITANICA، تاریخ ملاحظہ دسمبر ۳۱،۲۰۱۹ء،

http://www.britanica.com>willia...

۵۹۔ منشی اعتصام الدین،ایضاً،ص،۵۹۔۶۰۔

۶۰۔ ایضاً،ص،۶۲۔۶۳۔

۶۱۔ منشی اسماعیل،ایضاً،ص،۱۵۸۔۱۵۹۔

۶۲۔ ایضاً،ص،۱۵۹۔

۶۳۔ ناصر عباس نیر،مابعد نو آبادیات اردو کے تناظر میں(کراچی:اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۱۳ء)،۲۵۔

۶۴۔ منشی اعتصام الدین،ایضاً،ص ۱۱۶

۶۵۔ منشی اعتصام الدین،ایضاً،ص،۱۱۶۔

۶۶۔ ایضاً،ص،۱۰۹۔

۶۷۔ ایضاً،ص،۱۱۵

۶۸۔ ایضاً،ص،۱۱۴

۶۹۔ "The Industrial Revolution (1750.1850)"، *Cambridge Central* School، تاریخ ملاحظہ ۹ دسمبر ۲۰۱۹ء۔

http://www.cambridgecscl.org_.....

۷۰۔ منشی اعتصام الدین، شنگرف نامۂ ولایت، ایضاً، ص، ۱۱۳۔

۷۱۔ ایضاً، ص، ۱۱۲۔۱۱۳۔

۷۲۔ فرانز فینن، افتادگان خاک، مترجم سجاد باقر رضوی [illegible] ص، ۳۲۔

۷۳۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۱۱۷۔

۷۴۔ ایضاً، ص، ۱۱۵۔

۷۵۔ ایضاً، ص، ۱۳۵۔

۷۶۔ 18th Century Britain,1714-1815",BRITANNICA,
http://www.btitanica.com>place تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۸، ۲۰۱۹،

۷۷۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۱۲۶۔۱۲۸

۷۸۔ ایضاً، ص، ۶۸۔

۷۹۔ ایضاً، ص، ۴۰۔

۸۰۔ ایضاً، ص، ۴۲۔

۸۱۔ ایضاً

۸۲۔ ایضاً، ص، ۶۸۔۶۹۔

۸۳۔ ایضاً، ص، ۷۰۔

۸۴۔ ایضاً، ص، ۷۱۔۷۲۔

۸۵۔ ایضاً، ص، ۷۳۔

۸۶۔ ایضاً، ص، ۷۶۔

باب چہارم

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں یورپی زندگی کے اہم پہلو: تصورات وتاثرات (نوآبادیاتی تجزیاتی مطالعہ)

باب چہارم:

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں یورپی زندگی کے اہم پہلو: تصورات و تاثرات (نوآبادیاتی تجزیاتی مطالعہ)

ا۔ اٹھارہویں صدی اور یورپ

یورپ میں چودھویں سے سترھویں صدی عیسوی کا زمانہ یورپی نشاطِ ثانیہ کا دور کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں یورپ نے احیاء العلوم اور اصلاحِ مذہب کی تحریکوں کے توسط سے نہ صرف یورپی معاشرے کو چرچ اور پوپ کی بالادستی سے آزاد کرایا بلکہ سائنس وفلسفہ کے میدان میں جدید نظریات کو بھی متعارف کرایا گیا۔ یورپ کی اس بتدریج علمی وفکری ترقی کی بدولت یورپی عہد دریافت میں جو یورپی تاریخ میں پندرھویں سے سترھویں صدی عیسویں کے آغاز کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے نہ صرف یورپی اقوام کو دنیا کے ان جانے خطوں کو دریافت کرنے بلکہ وہاں اپنی نوآبادیات قائم کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔ اس طرح ۱۴۹۲ء سے وسط اٹھارہویں صدی تک مختلف یورپی اقوام جیسے کے پرتگال، اسپین، انگلینڈ اور فرانس وغیرہ نیدرلینڈز، امریکہ، ایسٹ انڈیز اور ہندوستان پر اپنی نوآبادیات قائم کرنے میں مصروف رہیں۔ ۱۷۶۰ء کے بعد برطانیہ نے دنیا کی استعماری اور نوآبادیاتی تقسیم میں فرانس سمیت اپنے دیگر تمام یورپی حریفوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور دنیا کی سب سے بڑی نوآبادیاتی طاقت بن گیا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک ہندوستان کا ایک بڑا حصہ اور بنگال جیسا اہم صوبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوآبادیات میں شامل ہو چکا تھا جس کے بعد بنگال میں صنعتی زوال جب کے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا زمانہ شروع ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہی یعنی ۱۷۸۹ء میں فرانس میں ایک ایسا انقلاب پھوٹا جس میں مساوات اور جمہوریت کے لگائے گئے نعروں نے پورے یورپ کو متاثر کیا۔ دراصل اٹھارہویں صدی کو یورپ کی فکری، علمی اور سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے اٹھارہویں صدی کو یورپی تاریخ میں روشن خیالی کے دور (The age of Enlightenment) کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں جان لاک (John Locke) اور تھامس ہابز (Thomas Hobbes) کے پیش کردہ سیاسی نظریات نے جمہوری طرزِ حکومت جبکہ آدم سمتھ (Adam Smith) کے پیش کردہ معاشی نظریات نے جدید سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں استوار کیں۔ اسی طرح علوم میں کیلکولس اور میکانیات وغیرہ میں پیش کردہ نظریات کی بدولت کائنات پر غور وفکر کرنے اور اس کی حقیقتوں کو جاننے کا سلسلہ شروع ہوا۔[۱]

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں یورپ کا سفر کرنے والے ہمارے ابتدائی جنوب ایشائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے ایک ایسے دور میں یورپ کا سفر اختیار کیا تھا جب یورپی معاشرہ ایسی تبدیلیوں کے دور سے گزر رہا تھا جو اس کے قدم تیزی سے مختلف (زرعی، صنعتی اور سیاسی) انقلابات کی جانب بڑھا رہی تھیں۔ جب کے ابتدائی نوآبادیاتی عہد کے ان سفر نامہ نگاروں کا اپنا ملک ہندوستان تیزی سے سیاسی زوال و انتشار کا شکار ہونے کے باعث برطانوی نوآبادیات کا حصّہ بن رہا تھا۔ لہذا یورپ کی علمی و فکری ترقی اور جدیدیت کے ابتدائی زمانہ میں یورپ کا سفر کرنے والے ہمارے تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے اپنی اپنی دلچسپی کے پیش نظر یورپی زندگی کے اہم پہلوؤں جیسے کے مذہب، نظام سیاست، سائنسی ترقی و ایجادات اور مستشرقیت کے متعلق اپنی معلومات، مشاہدات اور تاثرات بیان کرنے کی طرف خاص توجہ دی۔ یورپی نوآبادیاتی نظام اپنے اندر چونکہ یورپی مرکزیت کا تصور لیے ہوتا ہے اس لیے کسی نوآبادیاتی صورت حال میں یورپی نوآبادکاروں کی تہذیب و تمدن، زبان، نظام سیاست، علوم و فنون غرض کے ہر شے اپنے اندر اعلیٰ و ارفع کا تصور لیے ہوتی ہے۔ یورپی مرکزیت اور برطانوی نوآبادکاروں کی تہذیبی و علمی برتری کے تصور نے ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور کے سفر نامہ نگاروں کو کس حد تک متاثر کیا اور انہوں نے یورپی زندگی کے اہم پہلوؤں پر اپنی معلومات اور مشاہدات کے مطابق کس قسم کی آراء و تاثرات اور رویوں کا اظہار کیا؟ تو آیئے ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے ہم نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان اہم پہلوؤں پر اپنے سفر نامہ نگاروں کی آراء و تاثرات کے تحقیقی و تنقیدی تجزیے کی طرف بڑھتے ہیں۔

۲۔ مذہب

قدیم زمانہ سے ہی عیسائیت اور اسلام بالترتیب مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے باہمی دلچسپی کا موضوع رہے ہیں۔ عیسائیت اور اس کے بنیادی اعتقادات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی عملی کوششوں کا باقاعدہ آغاز برصغیر میں شہنشاہ اکبر (۱۵۴۲ء۔۱۶۰۵ء) کے زمانے میں عالمی مذاہب میں اس کی ذاتی دلچسپی کی بناپر ہوا۔ اکبر کے زمانے میں یورپی جہاز گوواا ور سورت کی بندرگاہوں پر آیا کرتے تھے لہٰذا اکبر کے حکم پر حاجی حبیب اللہ کاشی ۹۸۴ھ میں بندرگاہ گوا سے یورپی سوغاتیں، اہلِ علم و ہنر اور یورپی دینی پیشواؤں (پادریوں) کی ایک جماعت کو لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔[۲]

اکبر دراصل تورات اور انجیل میں بیان کردہ احکامات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے انہیں فارسی میں ترجمہ کرانا چاہتا تھا۔ گلفشاں خان کے مطابق اکبر کی اس خواہش سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ عہد نامہ قدیم اور

عہد نامہ جدید اس وقت تک ہندوستان میں دستیاب نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ہندوستان میں عیسائی اتنی زیادہ تعداد میں نہ تھے اور جو تھے وہ بھی زیادہ تر ساحلی علاقوں جیسے کے مالا بار وغیرہ میں آباد تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر ۱۵۹۵ء میں ایک یسوعی Jerome Xavier اکبر کے دربار میں حاضر ہوا۔ اکبر نے عبدالستار بن قاسم لاہوری کو اس کی شاگردی میں دے دیا۔ Jerome Xavier نے اکبر کے دربار میں فارسی سیکھی اور عبدالستار نے اس سے پرتگالی اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ ۱۶۰۲ء میں جیروم زاویار نے عبد الستار کی مدد سے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر ایک کتاب مراۃ القدس یا داستانِ مسیح تحریر کی اور ۱۶۰۳ء میں عبدالستار نے Jerome Xavier کی مدد سے ثمرات الفلاسفہ مرتب کی۔ اس کتاب کا موضوع رومن سلاطین کی تاریخ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی ہے۔ ان کے علاوہ عیسائیت کے اعتقادات پر مبنی اور بہت سی کتب فارسی میں تحریر و ترجمہ کی گئیں۔[۲۳]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ ہند کو سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے ابتدائی حصّہ میں عیسائیت کے بنیادی اعتقادات اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ان کے نظریات خالصتاً عیسائی نقطۂ نظر اور ذرائع سے جاننے کا موقع ملا۔ اس سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کی معلومات قرآن میں فراہم کردہ معلومات پر مبنی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی اشرافیہ کے یورپ سے براہِ راست رابطے کے نتیجے میں انہیں وہاں بسنے والی اقوام کے مذاہب اور مذہبی رسومات و سرگرمیوں کو براہِ راست دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا اور اس طرح انہوں نے اپنی معلومات و مشاہدات کو اپنے سفر ناموں میں تحریر کر کے اہلِ ہند کو یورپی مذاہب و عقائد اور ان میں پائے جانے والے اختلافات سے بھی کسی حد تک روشناس کرایا۔

ابتدائی جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین کے ہاں یورپی اقوام کے مذہب کے حوالے سے اہلِ نصاریٰ کے دینی عقائد اور اہلِ نصاریٰ اور برطانوی نوآبادکاروں کے دینی عقائد اور عبادات کے طریقہ کار میں اختلافات نیز حضرت محمد صلی علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور دینِ اسلام کے متعلق برطانویوں کے نظریات واعتراضات کو موضوع بنایا گیا اور ان کے متعلق اپنے ہندوستانی قارئین کو تفصیلی معلومات فراہم کی گئیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کے عام ہندوستانی طبقہ اس وقت تک یورپی اقوام کے مذہب یا ان کے مختلف فرقوں میں عقائد کے حوالے سے پائے جانے والے اختلافات کے متعلق زیادہ معلومات نہ رکھتا تھا۔ جبکہ میر محمد حسین نے عہد نشاط ثانیہ میں یورپیوں کے تجدید مذہب کی کوششوں اور اس کی وجہ سے ان میں مذہبی اور علمی و فکری بیداری پیدا ہونے نیز اس کی بدولت پاپ

کے اختیارات و مقام پر پڑنے والے اثر کو موضوع بنا کر دراصل ہندوستانی اشرافیہ اور اہل علم طبقہ کو یورپیوں کی علمی و سائنسی ترقی میں ان کی تجدید مذہب کی کوششوں سے روشناس کرایا۔

منشی اعتصام الدین نے قومِ نصاریٰ (اہل یورپ) کے حوالے سے سب سے پہلے امت مسلمہ پر ان کی موروثیت، حسب و نسب اور نسلی برتری کے حوالے سے ان کے نظریات و عقائد بیان کرنے میں دلچسپی لی۔ اعتصام کی معلومات کے مطابق بنی اسرائیل جس کے پیغمبر حضرت عیسیٰؑ تھے، خود کو حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ میں سے حضرت اسحاق کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ حضرت اسحاقؑ چونکہ حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے جو بادشاہ زادی تھیں۔ اس لیے اہلِ نصاریٰ اپنے نجیب الطرفین ہونے پر فخر کرتے ہیں جبکہ اہلِ مکہ اور قریش کو حضرت اسمعیلؑ کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ حضرت اسمعیلؑ چونکہ حضرت ہاجرہ کے بیٹے تھے اس لیے اس حوالے سے اہلِ مکہ (مسلمانوں) کو کنیز زادے قرار دے کر خود سے کم تر سمجھتے ہیں۔[۳]

یورپیوں کے مذہب کے متعلق اٹھارہویں صدی کے عام ہندوستانیوں کی طرح ہمارے سفر نامہ نگاروں کا بھی یہی ماننا تھا کہ تمام یورپ کا مذہب عیسائیت ہے مگر عام ہندوستانیوں کے برعکس ہمارے سفر نامہ نگار اہل نصاریٰ میں مختلف فرقوں کی موجودگی اور اس حوالے سے ان کے عقائد میں پائے جانے والے اختلافات سے بھی کسی حد تک واقف تھے۔ چنانچہ محمد حسین اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ان سب کا مذہب نصرانیت ہے، ہاں ان نصرانیوں کے بعض فرقے اس تین سو سالوں کے عرصے میں سائنس دانوں کے نظریات سے متاثر ہو گئے ہیں۔[۵]

محمد حسین کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سولھویں صدی میں یورپ میں اٹھنے والی احیاء العلوم اور اصلاحِ مذہب کی تحریکوں اور یورپیوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے متعلق معلومات رکھتے تھے مگر انہوں نے اہل نصاریٰ کے مختلف فرقوں یا ان کے عقائد کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کے متعلق کسی قسم کی کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ میر محمد حسین کی طرح منشی اعتصام الدین نے بھی تمام اہلِ یورپ کو قوم نصاریٰ قرار دیا۔ البتہ محمد حسین کے برعکس منشی اعتصام الدین نے قومِ نصاریٰ میں مختلف فرقوں کے وجود میں آنے کے ارتقائی عوامل بیان کرنے میں بھی خاص دلچسپی لی۔ ان کی معلومات کے مطابق انجیل جو نصرانیوں کی مذہبی کتاب ہے وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں کی مرتب کردہ تھی جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے دین کی تبلیغ کا سلسلہ اس طرح جاری رکھا کہ یہ مختلف ممالک میں پھیل گئے اور ہر حواری کسی خاص قوم یا قبیلے کی امامت پر فائز ہو گیا مگر حضرت عیسیٰؑ کے ان تمام حواریوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد دین نصاریٰ کے علماء (پادریوں) میں مذہبی روایات و

اقوال میں اختلافات نے جنم لیا اور اس طرح ان پادریوں نے جن کی تعداد منشی اعتصام الدین کی معلومات کے مطابق بارہ یا سولہ تھی، اپنے اپنے نقطۂ نظر سے دین نصاریٰ کے عقائد پر کتب تصنیف کیں اور اسی زمانے میں ان کے یہاں مذہبی اختلافات نے جنم لیا۔

منشی اعتصام الدین نے اگرچہ اہلِ نصاریٰ کے درمیان ان کے دینی عقائد میں سے **بعض** عقائد کے حوالے سے ان میں پائے جانے والے اختلافات کو بیان کرنے میں بھی دلچسپی لی مگر وہ ان اختلافات کو اہلِ نصاریٰ کے فرقوں کے لیے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کی اصطلاحات استعمال کر کے بیان نہیں کرتے بلکہ وہ تمام اہلِ نصاریٰ اور ان میں انگریزوں کے درمیان حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور ان کے مقام و مرتبے کے حوالے سے پائے جانے والے اختلافات کو بیان کرتے ہیں۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق انگریزوں کے سوا تمام اہلِ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں اس لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ نے بغیر شوہر سے ملے حضرت عیسیٰؑ کو جنم دیا تھا مگر انگریزوں کا عقیدہ اس حوالے سے باقی اہل نصاریٰ سے مختلف ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھتے ہیں اور اس بات پر بھی کہ نہ تو اللہ کو کسی نے پیدا کیا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔ اس لیے اسے انسانوں کی طرح زناشوئی سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزوں کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا بیٹا اس لیے کہہ کر پکارا تاکہ تمام نبیوں میں ان کا مقام و مرتبہ ممتاز ہو جائے۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق اس عقیدہ کے علاوہ تمام اہلِ نصاریٰ انجیل اور اس کے عقائد پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان عقائد کے مطابق اہلِ نصاریٰ کا ماننا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے جو ایسا کہے گا کہ وہ جھوٹا ہو گا اور یہ کہ حضرت عیسیٰؑ قیامت کے قریب دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ اس وقت سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو گا اور اس وقت دنیا کی تمام مخلوقات حضرت عیسیٰؑ کے دین کی پیروہوں گی اور کوئی بھی مذہبی اختلاف باقی نہیں رہے گا۔[۱]

یہاں یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ منشی اعتصام الدین نے انگریزوں اور باقی اہلِ نصاریٰ کے عقائد پر نہ تو کوئی ذاتی رائے پیش کی اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے حوالے سے اہلِ نصاریٰ کے عقائد کا اسلام کے عقائد سے کوئی موازنہ پیش کیا۔

منشی اعتصام الدین اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ دکھائی دیتے ہیں کے جس طرح اہل نصاریٰ کے مختلف فرقوں (پروٹسٹنٹ اور کیتھولک) میں بعض مذہبی عقائد کے حوالے سے اختلاف پایا جاتا تھا اسی طرح تمام برطانوی بھی صرف ایک فرقہ (پروٹسٹنٹ) کے ہی پیروکار نہ تھے بلکہ ان میں بھی مذہب کے حوالے سے کیتھولک، دہریہ اور ملحدیت وغیرہ جیسے مختلف فرقے پائے جاتے تھے۔ اس حوالے سے منشی اعتصام الدین نے یہ نقطہ نظر پیش کیا کے

انگریزوں کی اکثریت اگرچہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان رکھتی تھی مگر ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو پوشیدہ طور پر حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے تھے جبکہ ان میں سے کچھ لوگ پیغمبروں اور بزرگوں کے اقوال واعمال پر عقل کو ترجیح دیتے تھے (یعنی عقلیت پرست تھے)۔ اسی طرح بعض لوگ دہریہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے وہ یوم آخرت، عذاب وثواب اور جنت ودوزخ پر ایمان رکھتے تھے نہ ہی انجیل کو خدا کی کتاب سمجھتے تھے اور نہ ہی حضرت عیسیٰ کو اللہ کا پیغمبر مانتے تھے۔ جب کہ کچھ لوگ خدا کے وجود کے ہی منکر تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ دنیا اور اس کی تمام اشیاء خود سے ہی وجود میں آ گئیں ہیں۔ منشی اعتصام الدین نے ان لوگوں کے اس قسم کے عقائد و نظریات کو گمراہ کن عقائد قرار دیا۔[7]

اٹھارہویں صدی میں دنیا کے مختلف خطوں میں برطانوی نو آبادکارانہ قبضے اور ان خطوں کے مادی ومالی وسائل پر برطانوی نو آبادکاروں کی لوٹ کھسوٹ نے انگلستان میں صنعتی ترقی کی راہیں ہموار کیں اور برطانوی لوگوں میں مادیت پرستی کے ساتھ ساتھ عقلیت پرستی کا رجحان بھی بڑھا اور مذہب ان کے لیے محض فرصت کے اوقات کی ایک چیز بن کر رہ گیا۔ اسی لیے عبادات اور ان کی ادائیگی کے حوالے سے انگریزوں کا رویہ منشی اعتصام الدین کے لیے باعث حیرت بنا اور ان کے مطابق ہندوستانی لوگوں کے برعکس جو عبادات کا خاص اہتمام کرتے تھے انگریز نماز اور روزہ جیسی فرض عبادات کی ادائیگی سے بے زار نظر آتے تھے۔ ان کے ہاں عبادت کے حوالے سے یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ صرف اتوار کے دن دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کے کچھ لوگ گرجاگھروں میں نماز پڑھنے کے لیے جاتے تھے مگر بقیہ دنوں میں اپنے دنیاوی کاموں کو نماز اور روزہ پر ترجیح دیتے تھے۔ اعتصام الدین نے انگریزوں کی عبادت وریاضت سے بے زاری کی جو وجوہات پیش کیں ان کے مطابق انگریزوں کا ماننا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف عبادت وریاضت کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ اس نے انسان کو دنیا کی آرائش وزیبائش کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لیے انسانوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آرام وآسائش کے لیے علم وہنر سیکھیں۔ زراعت، تعمیر عمارات اور صنعت وحرفت کو ترقی دیں اور اپنے ملک کی حفاظت کریں۔ لذیذ کھانے کھا کر اور عمدہ لباس پہن کر خدا کا شکر ادا کریں۔ منشی اعتصام الدین کی رائے میں انگریزوں کا یہ بھی ماننا تھا کہ جو لوگ اس دنیا میں سستی اور کاہلی سے کام لیں گے وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اس لیے اگر وہ لوگ صرف نماز اور عبادت میں مصروف رہیں گے اور روزہ رکھ کر فاقہ کشی کرتے رہیں گے تو کمزور ہو جائیں گے اور پھر محنت ومشقت نہ کر سکیں گے۔ اس طرح وہ بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی سے قاصر رہیں گے جبکہ ان میں سے بعض لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا ہے۔ اس لیے چھ دن دنیا کے کام کرنے چاہئیں اور ایک دن اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ اس لیے اعتصام نے مشاہدہ کیا وہ لوگ اتوار کو جو تعطیل کا دن تھا نماز کے لیے مخصوص سمجھتے تھے۔[8] اس طرح ہم برطانویوں کے مذہبی نظریات اور عبادات کے حوالے سے پائے جانے والے

رجحانات سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان میں صنعتی ترقی اور سائنسی ایجادات کے دور میں لادینیت اور مادیت پرستی کو اس قدر فروغ ملا کہ مذہب ان کے نزدیک صرف فراغت کے اوقات کی ایک چیز بن کر رہ گیا۔

عبادات اور ان کی ادائیگی کے علاوہ اعتصام الدین کے ہاں برطانوی لوگوں کے مذہبی نقطہ نظر سے نظر حلال و حرام اشیاء کے کھانے پینے کے حوالے سے ان کے رجحانات اور اس حوالے سے ان کے نظریات کا بھی بغور جائزہ ملتا ہے جیسے کے کھانے پینے کی اشیاء کے حوالے سے منشی اعتصام الدین نے برطانوی لوگوں کے متعلق اپنا یہ مشاہدہ پیش کیا کہ وہ لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے حلال و حرام اشیاء میں فرق روا نہیں رکھتے تھے بلکہ اس حوالے سے علم طب کی کتب کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان میں جن چیزوں کو مفید قرار دیا گیا تھا انہیں کھاتے پیتے تھے اور جن چیزوں کو مضر قرار دیا گیا تھا ان سے پرہیز کرتے تھے۔ اسی طرح اعتصام کی رائے میں وہ لوگ مذہبی نقطۂ نظر سے پاکی اور ناپاکی کے تصور کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اعتصام الدین کے مطابق ان لوگوں کے حلال و حرام اشیاء میں فرق نہ کرنے کی وجہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے چند ایک واقعات سے اخذ کردہ وہ نتائج تھے جن کی بناپر ان لوگوں نے اپنی طرف سے حرام اشیاء (خنزیر اور سور) کو بھی خود پر حلال قرار دے دیا تھا۔ مگر اعتصام کی رائے میں ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے کبھی حرام اشیاء کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور وہ توریت کے احکام پر عمل پیرا تھے کیونکہ ان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے توریت کے احکام کو بحال رکھا تھا لہٰذا حلال و حرام اشیاء کے حوالے سے وہ توریت کے احکام پر عمل پیرا تھے۔[9]

یورپ قیام کے دوران خود اعتصام الدین کے کھانے پینے کے رجحانات کے متعلق جو معلومات شگرف نامہ میں ملتی ہیں وہ اس حوالے سے توجہ اور دلچسپی کی حامل ہیں کہ ان کے ہاں ہمیں ابو طالب اور انیسویں صدی کے بعض دوسرے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی طرح برطانویوں کی نجی محفلوں میں شامل ہو کر جام و شراب نوش کرنے کے قصے پڑھنے کو نہیں ملتے بلکہ حلال و حرام اشیاء کے کھانے پینے کے حوالے سے ان کا رویہ ایک راسخ العقیدہ اور مذہبی احکامات پر کاربند مسلمان جیسا دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے کہ یورپ کے سفر اور یورپ میں قیام کے دوران بعض اوقات ایسے مواقع بھی آئے جب ان کے مطابق انہیں کھانے کے لیے حلال اشیاء میسر نہ آسکیں مگر انہوں نے وہ زمانہ صبر و تحمل اور بغیر حرم اشیاء کھائے بخیر و عافیت بسر کیا۔ مثلاً ایسی ہی ایک صورت حال کا سامنا اعتصام کو لندن میں اس وقت کرنا پڑا جب کپتان سوینٹن اپنے کسی مقدمہ کی پیشی میں منشی اعتصام الدین کو زبردستی لندن لے گئے تاکہ وہ سوینٹن کی عدالت میں پیش کردہ صفائی کے کاغذات جو فارسی میں تھے ان کا ترجمہ کر دیں۔ اس لیے لندن میں دو ہفتہ

تک اعتصام کو بغیر ملازم کے رہنا پڑا اور خود کھانا پکانے کی زحمت اٹھانی پڑی نیز حرام اشیاء کی دستیابی اور حلال اشیاء کی قلت کے باعث خوراک کی کمی کی وجہ سے انہیں بیماری کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر اعتصام کے دعویٰ کے مطابق انہوں نے کسی حرام شے کو منہ نہ لگایا۔ اسی طرح کپتان سوسنٹن نے اعتصام کو اپنے ساتھ کئی بار شراب پینے کی پیش کش کی مگر اعتصام کے بار بار انکار پر کپتان سوسنٹن نے انہیں 'بیوقوف بنگالی' کہہ کر مطعون کیا اور انہیں یہ باور کرایا کے مسلمانوں میں بھی کچھ امراء و معززین ایسے تھے جو اگرچہ کھلم کھلا تو شراب نہ پیتے تھے مگر چھپ کر پی لینے کو معیوب نہ سمجھتے تھے مگر اعتصام چونکہ بنگالی تھے اور سوسنٹن کی رائے میں بنگالی دوسرے ہندوستانیوں کی نسبت زیادہ بیوقوف تھے اس لیے سوسنٹن کے نزدیک شراب جیسی عمدہ چیز سے انکار دراصل اعتصام کی بے وقوفی ہی تھی۔ جیسے کے اعتصام نے اس حوالے سے کپتان سوسنٹن کا مؤقف پیش کرتے ہوئے لکھا کہ :

> ہمارے ساتھ شراب پینے سے پرہیز کرنا فضول بات ہے۔اور حقیقت یہ ہے کے تم بنگالی ہو اور بنگال دوسرے ہندوستانیوں کی بہ نسبت نادانی اور بے وقوفی میں زیادہ مشہور ہیں۔اس کے سوا انکار کی کوئی اور وجہ نہیں ہے۔[۱۱]

کپتان سوسنٹن کی صورت ایک یورپی نوآبادکار کی طرف سے اعتصام اور بحیثیت مجموعی ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کو نادان اور بے وقوف قرار دیا جانا دراصل اچنبے کی بات نہیں کیونکہ نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکار اپنی علمی، عقلی اور تہذیبی برتری ثابت کرنے کے لیے نوآبادیاتی باشندوں کے لیے اسی قسم کی بلکہ اس بھی بڑھ کر حیوانیات کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ جیسا کے ہم دیکھتے ہیں کے ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی صورت حال میں نادان، بیوقوف اور جاہل و جنگلی ہندوستانی، ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں ترقی پا کر بندروں اور کتوں کے برابر مقام حاصل کر چکے تھے: "dogs and Indians are not allowed" سے بلاشبہ اسی صورت حال کی ترجمانی ہوتی ہے۔

بہر حال منشی اعتصام الدین کے حوالے سے ہمارے لیے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کے انہوں نے کپتان سوسنٹن کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے شراب سے گریز کو اپنی بے وقوفی نہیں بلکہ اپنے مذہب اور شریعت کے اصولوں کے عین مطابق قرار دیا اور اس حوالے سے یہ دلیل پیش کی کے مسلمانوں میں شرافت اور عزت کا معیار دولت اور امارت پر نہیں بلکہ دین و شریعت کے احکامات جو اللہ اور اس کے رسول نے صادر فرمائے ہیں پر عمل کرنے پر منحصر ہے۔اس لیے اگر دولت مند مسلمان اپنی دولت کے غرور میں خلاف شریعت کام کریں تو غریب

مسلمانوں کو ان کی پیروی ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ اعتصام الدین کے مطابق ان کے پیش کردہ دلائل نے کپتان سوئنٹن کو لاجواب کر دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کے انگریزوں کے بعض مذہبی عقائد میں باقی اہل نصاریٰ سے اختلاف نیز مذہبی عبادات و معاملات میں ان کے منفرد رجحانات نے منشی اعتصام الدین کو اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے متعلق بھی انگریزوں کے خیالات جاننے کے حوالے سے متجسس کیا تھا اسی لیے انہوں نے شگرف نامہ میں آسمانی کتابوں نیز حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے حوالے سے انگریزوں کے عقائد و نظریات بیان کرنے میں خاص دلچسپی لی۔ منشی اعتصام الدین کی رائے میں انگریز مجموعی طور پر کسی بھی آسمانی کتاب اور صحیفے کو خدا کا کلام تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب آسمان سے لکھ کر نہیں بھیجی اور نہ ہی حضرت جبرائیل کو جو وحی لاتے تھے کسی نے دیکھا اور نہ ہی ان کی آواز سنی۔ اس لیے تمام کتابیں اور صحیفے پیغمبروں کی اپنی تحریر کردہ تصانیف ہیں۔ مذہبی کتب کے حوالے سے انگریزوں کی اس قسم کی آراء یقیناً ان کے عقلیت پرست ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

اعتصام کی رائے میں انگریز حضرت محمد ﷺ کی رسالت اور قرآن مجید پر بھی ایمان نہیں رکھتے تھے اس لیے کے ان کا ماننا تھا کے انہیں انجیل میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی کوئی خبر نہیں ملی اور اگر ایسی کوئی خبر انہیں انجیل میں ملتی تو وہ اسلام قبول کر لیتے۔ اعتصام نے اہل نصاریٰ کے اس روایتی اعتراض کا جواب اس حوالے سے روایتی اسلامی نقطہ نظر سے یہ پیش کیا کے چونکہ اصل انجیل کتاب دنیا میں ناپید ہو چکی ہے اس لیے نصاریٰ میں جو انجیل رائج ہے وہ حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے چار حواریوں شمعون، جان، متی اور لوقا نے اپنی یادداشت کے مطابق مرتب کر کے ایک جلد میں جمع کر دیں اور اس میں حضرت محمد ﷺ کے ظہور کی روایت صراحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا اظہار صاف طور پر کیا تھا مگر حواریوں نے صرف اشارہ کر کے قوم کو اس حوالے سے شک وشبہ میں مبتلا کر دیا۔[۳۱]

شگرف نامہ میں منشی اعتصام الدین نے اپنے یورپ قیام کے دوران وہاں اپنے چند برطانوی اور اسکاٹش احباب (اہل نصاریٰ) کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور دین اسلام کے حوالے سے چند ایک روایتی اعتراضات و اختلافات پر بحث و مناظروں کا تذکرہ بھی کیا۔ منشی اعتصام الدین نے اپنے اہل نصاریٰ احباب کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کے احکامات و عقائد پر اٹھائے گئے اعتراضات و سوالات کے جواب میں جو دلائل پیش کیے وہ دراصل اعتصام کے اسلام کے متعلق وسیع مطالعہ اور ان کے کامل ایمان کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کپتان سوئنٹن کے گھر جنرل تیڑو اور کپتان اودریان نے چند اسلامی احکامات پر اعتراض کرتے ہوئے

اعتصام کے سامنے اس حوالے سے چند سوالات اٹھائے ان میں سے ایک اعتراض تو یہ تھا کہ حضرت آدمؑ نے ایک ہی شادی کی مگر مسلمانوں کے نبی حضرت محمد ﷺ نے ان کے برعکس نو شادیاں کیں جبکہ اپنی قوم کو اپنے عمل کے برخلاف چار شادیوں کا حکم دیا۔ منشی اعتصام الدین نے ان اعتراضات کی توجیہات پیش کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو حضرت آدمؑ کی آسائش کے لیے پیدا کیا اور ان کی بیوی بنایا چنانچہ جب حضرت آدمؑ کی اولاد کی کثرت ہوگئی تو اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ اگر مرد کو ایک عورت سے آرام نہ ملے تو وہ دوسری سے عقد کرلے۔ اسلام میں ایک سے زائد شادیوں کے حوالے سے اعتصام نے شرعی نقطہ نظر سے یہ منطق بھی پیش کی کہ چونکہ ہر ماہ میں ہفتہ یا دس دن کے لیے عورتیں حیض میں مبتلا ہو جاتی ہیں اسی لیے اسلام نے مردوں کو چار شادیوں کی اجازت دی کہ اگر وہ عورت کے حیض و نفاس کے زمانے میں اپنے شہوانی جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں تو دوسری شادی کرلیں اور اسی طرح چار تک شادیوں کی اجازت دی گئی تاکہ زناکاری سے بچ سکیں۔ حضرت محمد ﷺ کی تعداد ازواج کے حوالے سے اٹھائے گئے اعتراض پر منشی اعتصام الدین نے یہ توجیح پیش کی کہ نبیوں میں صرف حضرت محمد ﷺ نے ہی ایک سے زائد شادیاں نہیں کی تھیں بلکہ حضرت ابراہیم کہ جن کی دو بیویاں حضرت ہاجرہ اور حضرت سارہ تھیں اور اسی طرح حضرت سلیمانؑ کی ایک سو ساٹھ بیویاں تھیں۔ اس طرح اعتصام الدین نے اپنی دینی معلومات اور واضح دلائل کے ساتھ ان لوگوں کو مطمئن کیا کہ ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج صرف مسلمانوں کے نبی حضرت محمد ﷺ کے زمانہ سے نہیں بلکہ گذشتہ پیغمبروں کے زمانہ سے رائج ہے۔

اسی طرح منشی اعتصام الدین نے انگریزوں کے دین اسلام کے چند دیگر احکامات و عقائد پر اٹھائے گئے اعتراضات جیسے کہ اسلام میں خون ریزی (یعنی جہاد) نبی پاک ﷺ کے معجزے نہ ہونے، مسلمانوں کے تقدیر کو تدبیر پر مقدم رکھنے نیز صرف مسلمانوں کے جنت اور باقی اقوام کے دوزخ میں جانے جیسے روایتی اعتراضات کے حوالے سے اپنے دینی علم اور تدبر کی بنا پر نہایت عمدہ توجیہات پیش کیں اور خود اعتصام کے مطابق انگریزوں کے دین اسلام پر اٹھائے گئے اعتراضات کے جواب میں ان کے دیے گئے دلائل اکثر انگریزوں کو متاثر اور لاجواب کر دیتے۔ [۳۱]

انگریزوں کے ساتھ دین اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے حوالے سے بحث و مباحثہ اور مناظروں کے باوجود منشی اعتصام الدین نے انگریزوں کو باقی اہلِ نصاریٰ میں مذہبی رواداری کے حوالے سے سب سے بہتر پایا۔ اس سلسلے میں انہوں نے انگریزوں اور باقی اہلِ نصاریٰ کے حوالے سے دلچسپ حقائق بھی بیان کیے۔ اعتصام الدین کے نقطہ نظر کے مطابق قومِ نصاریٰ میں سوائے انگریزوں کے مذہبی تعصب بہت پایا جاتا تھا یعنی اعتصام کے کہنے کے مطابق برطانویوں کے علاوہ بقیہ اہلِ نصاریٰ کے ہاں دیگر مذاہب کے لوگ اپنے دینی فرائض و احکامات کو آزادی سے

انجام نہیں دے سکتے تھے مثلاً اگر کوئی مسلمان برطانویوں کے سوا باقی اہلِ نصاریٰ میں سے کسی کے ملک میں جا کر اذان دینا چاہتا تو نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اہلِ نصاریٰ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے اور ایسا کرنے والے مسلمان کو زندہ جلا دیتے تھے۔ اسی طرح منشی اعصام الدین کے مطابق اہلِ نصاریٰ یہودیوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کے مطابق یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا تھا۔ اس لیے اگر یہ لوگ یہودیوں کو اپنے ملک میں کہیں دیکھ لیتے تو انہیں جلا ڈالتے تھے۔ [۴۴] باقی اہلِ نصاریٰ کے برعکس انگریزوں کی مذہبی رواداری اور غیر متعصبانہ رویے نے اعتصام الدین کو بہت متاثر کیا۔ اعتصام کی رائے میں:

> انگریزوں کا طریقہ صلح کل ہے۔ اگر کوئی مسلمان ان کے ملک میں مسجد بنائے اور صوم و صلوۃ کی پابندی کرے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتے نہ اس کو روکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کے دین پر اعتراض سے کیا کام، عیسیٰ کا دین عیسائیوں کو موسیٰ کا دین، موسویوں کو مبارک۔ [۴۵]

اسی لیے اعتصام کی رائے میں انگریز اپنی مذہبی رواداری کے باعث یہودیوں کو بھی اپنے ہاں رہنے سے منع نہیں کرتے تھے بلکہ انگلستان قیام کے دوران خود اعتصام کے مشاہدہ میں چند ایسے یہودی آئے جو دشت فروشی کا کام کرتے تھے۔ [۴۶]

شگرف نامہ میں اہلِ نصاریٰ کے عبادت کے طریقہ کار اور چند مذہبی رسومات کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا جو اعتصام کی معلومات کے مطابق فرانس، ولندیزا اور پرتگال میں رائج تھیں مگر انگریز ان کو بدعت سمجھتے تھے۔ انگریزوں اور باقی اہلِ نصاریٰ میں عبادت کے طریقہ کار میں فرق اجاگر کرنے کے لیے اعتصام نے بیان کیا کہ انگریزوں (پروٹسٹنٹس) کے سوا باقی اہلِ نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصاویر نصب کرتے تھے اور ان کو خدا کے ساتھ شریک کرتے ہوئے ان تصاویر کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ منشی اعتصام الدین نے اہلِ نصاریٰ کے اس طریقۂ عبادت کو بت پرستی سے مشابہ ایک فعل قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے اہلِ نصاریٰ میں فرانسیسیوں میں رائج ایک مذہبی رسم Confession کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس لیے کہ ان کے مطابق اس رسم کے ذریعے فرانس کے لوگ اپنے سال بھر کے گناہوں کا اعتراف زناکار، حریص اور بدنیت پادریوں کے سامنے کرتے تھے اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق ایک خاص رقم بطور نذرانہ پادری کو ادا کرتا تھا کیونکہ وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ پادری اپنی عبادت و ریاضت سے خدا سے ان کے گناہوں کو معاف کرا دے گا۔ اعتصام الدین نے فرانس کے لوگوں کی اس رسم کو نہ صرف عقل و سمجھ سے عاری قرار دیا بلکہ ان کی اس رسم کو ہندوؤں کی رسم سے مشابہ قرار دیا کہ جہاں زناکار برہمن، پادریوں کا کردار ادا کرتے تھے اور ہندوؤں کو گمراہ کرتے تھے۔ پادریوں کی طرح

برہمن بھی ہندوؤں سے خیرات وصول کرکے آرام وسکون کی زندگی بسر کرتے تھے۔اس لیے انہوں نے فرانسیسیوں کی طرح ہندوؤں کی اس رسم کو بھی سراسر جہالت پر مبنی عقائد کی بنیاد قرار دیا۔اس کے علاوہ انہوں نے ہندوؤں کے اس عقیدے کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جس کے مطابق ان کی مذہبی کتاب وید کو سوائے برہمنوں کے کوئی اور نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اگر کوئی ہندو سوائے برہمنوں کے وید کو پڑھے گا تو وہ دوزخی ہو جائے گا۔[17]

اس طرح منشی اعتصام الدین نے برطانویوں اور باقی اہلِ نصاریٰ کے مذہبی عقائد اور بعض مذہبی رسومات میں تقابل پیش کرکے دراصل تمام یورپی اقوام میں برطانوی نوآبادکاروں کے مذہبی عقائد کو ہی سراہا۔حالانکہ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ برطانویوں میں بھی بعض لوگ ملحدانہ عقائد رکھتے تھے اور بعض دہریہ فرقہ سے وابستہ تھے مگر اعتصام کی نظر میں برطانویوں کی اکثریت چونکہ دوسرے نصاریٰ کی طرح نہ تو بت پرستی کرتی تھی اور نہ ہی Confession جیسے غیر عقلی اور غیر فطری عمل کو پسند کرتی تھی اس لیے مجموعی طور پر انہوں نے اہلِ نصاریٰ میں برطانویوں کے مذہبی عقائد ورجحانات اور عبادت کے طریقہ کار کو ہی سب سے بہتر قرار دیا۔

جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین یورپی معاشرے میں پاپ کو مذہبی حوالے سے حاصل اہمیت اور اس کے مقام و مرتبے کے متعلق نہ صرف معلومات رکھتے تھے بلکہ اس حوالے سے ان کی فراہم کردہ معلومات سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ یورپ میں اٹھنے والی اصلاحِ مذہب کی ان تحریکوں کے متعلق بھی معلومات رکھتے تھے جنہوں نے یورپی معاشرے میں کیتھولک چرچ کے اختیارات اور پاپ کی سرگرمیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور یوں یہ تحریکیں اور ان کے علمبردار مارٹن لوتھر[18] اور جان کالوین[19] پاپ کے مذہبی کردار اور اختیارات کو محدود کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔یورپی معاشرے میں اصلاحِ مذہب کی تحریکوں سے پہلے پاپ کے مقام و مرتبے اور اس کے کردار کے متعلق اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے محمد حسین نے یہ رائے پیش کی کہ 'پاپ' یا 'پوپ' جس کے معنی باپ کے ہیں وہ اپنے علم اور مذہبی مقام و مرتبے میں اہلِ نصاریٰ کے تمام علماء اور پادریوں پر فضیلت کا درجہ رکھتا تھا اور اہلِ نصاریٰ پاپ کو اس دنیا میں حضرت عیسیٰ کا واحد نائب (خلیفہ) سمجھتے تھے۔پاپ کی اسی روحانی و مذہبی فضیلت کی بنا پر (اصلاحِ مذہب سے پہلے) نوشت وخواند اور مذہب کی شرح وتفسیر کا ذمہ بھی صرف پاپ اور اس کے پیروکار پادریوں تک محدود تھا اور اسی لیے پاپ اپنی مصلحت سے کسی بھی چیز کو حلال یا حرام قرار دے سکتا تھا۔پاپ کی اسی اہمیت اور اعلیٰ مقام کے پیشِ نظر تمام عیسائی بادشاہ بھی اس کی اطاعت کرتے تھے۔[20] میر محمد حسین نے اگرچہ 'اصلاحِ مذہب' کی اصطلاح کا براہِ راست استعمال نہیں کیا مگر انہوں نے مارٹن لوتھر اور جان کالوین کا نام

پیش کر کے اس بات کا ثبوت ضرور پیش کیا کے وہ یورپی معاشرے میں سولھویں صدی میں اصلاح مذہب کی تحریکوں اور اس کی بدولت یورپیوں کے اندر ایک نئے فرقے 'پروٹسٹنٹ' (اگرچہ انہوں نے پروٹسٹنٹ کی اصطلاح بھی براہ راست استعمال نہیں کی) کے وجود میں آنے کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے۔ جیسے کے اس حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ:

۔۔۔۔پوپ کے متبعین میں سے دو آدمی جن کے نام لوتھر اور کالوین تھے فن کلام اور مناظرہ میں ماہر ہو گئے اور بہت سے ایسے ظاہری مسائل میں برملا اختلاف کرنے لگے جن پر اجماع تھا۔۔۔اس طرح ان کے نظریات مقبول عام ہو کر ایک نئے مذہب کی شکل اختیار کر گئے اور اس نئے مذہب کے حامیوں نے پوپ اور اس کے متبعین کو برا بھلا کہنا شروع کیا، لڑنے لگے اور اس پر پر جوش انداز میں اختلاف کرنے لگے جیسے یہ بنیادی عقائد کا اختلاف ہو۔یوں پاپ کا بڑھاہوا اقتدار کم ہوا اور وہ ایک تھوڑے سے خطہ زمین پر حکمران ہے۔اس کا دار الحکومت رومتہ الکبری ہے۔[۱۲]

یوں میر محمد حسین نے یورپ میں سولھویں صدی یعنی اصلاح مذہب کے زمانہ کو ان کی مذہبی بیداری کے ساتھ ساتھ ان کی علمی اور فکری بیداری کے حوالے سے بھی خاص اہمیت کا حامل قرار دیا۔اس لیے کے ان کی رائے میں اصلاح مذہب کی بدولت یورپی معاشرے میں پادریوں جنہوں نے نوشت و خواند کار دائرہ کار اپنے تک محدود رکھا ہوا تھا کے اختیارات و مقام کے محدود ہو جانے کی بدولت مذہبی تعلیمات اور سائنسی علوم تک عام یورپیوں کی براہ راست رسائی نے ان کے لیے علمی و سائنسی ترقی کی راہیں بھی ہموار کر دیں۔

منشی اعتصام الدین بھی اگرچہ میر محمد حسین کی طرح اہلِ نصاریٰ میں پاپ کے مقام و مرتبے اور اس کی اہمیت سے واقف تھے اور انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ انگریز پاپ سے کچھ خاطر خواہ عقیدت نہیں رکھتے تھے مگر انہوں نے انگریزوں کے پاپ کے ساتھ اس رویے کی وجہ یا یورپ میں اصلاحِ مذہب کی تحریک کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔

۳۔ برطانوی نظام تعلیم

کسی نو آبادیاتی صورت حال میں نو آباد کار کی تہذیب و ثقافت اور دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کا نظام تعلیم اور علوم و فنون بھی اعلیٰ' و برتر کا درجہ رکھتے ہیں۔اس لیے نو آبادیاتی باشندوں کے لیے قابل تقلید ہوتے ہیں۔ جیسا کے اس حوالے سے 'البرٹ میمی' نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کے نو آباد کار اپنے کلامیوں میں نو آبادیاتی باشندوں کا ایسا نقشہ کھینچتا ہے جس میں انہیں انتہائی سست اور ایسی ماورائی مخلوق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جنہیں علوم و فنون کی تحصیل سے

کوئی سروکار نہیں ہوتا۔[۲۲] جب کے اس حوالے سے 'فرانز فینن' نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کے نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کی تہذیب و ثقافت، ادب اور علوم وفنون کو اپنے کلامیوں میں فرسودہ قرار دے کر انہیں نوآبادیاتی اقوام کے زوال کا باعث قرار دیتا ہے۔اس طرح نوآبادکار اپنی ثقافت اپنے علمی ورثے اور فنون کو نوآبادیاتی باشندوں کے سامنے مثالیہ اور آفاقی قرار دے کر نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے۔[۲۳]

ہم دیکھتے ہیں کے ہندوستان میں جیسے جیسے برطانوی نوآبادیاتی نظام اپنے استحکام اور عروج کی جانب بڑھا ویسے ویسے برطانوی مستشرقین اور یورپی نوآبادکاروں کی طرف سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور خاص طور پر ہندوستانی نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور دوسرے لفظوں میں مشرقی علمی وادبی سرمائے کو بحیثیت مجموعی شدید تنقید کا کا نشانہ نشانہ کا نشانہ بناتے ہوئے یورپ کے علمی وادبی سرمائے سے کم تر قرار دیا گیا۔اس حوالے سے لارڈ تھامس بینگبٹن میکالے کی پیش کردہ تعلیمی رپورٹ بلاشبہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اس رپورٹ میں میکالے نے ہندوستانی ودیگر مشرقی زبانوں اور علوم وادب کے خلاف یورپی مستشرقین کی تحقیق وتنقید کی بناپر وہ زہر اگلا جس کی بناپر آئندہ ہندوستان میں انگریزی زبان اور انگریزی نظام تعلیم کا چرچا کیا گیا اور سائنسی علوم وفنون کو یورپی قرار دے کر ہندوستان میں اس کے نفاذ کی راہیں ہموار کی گئیں۔اس طرح ہندوستان کو تہذیبی وثقافتی اور علمی کم مائیگی کے احساس کمتری میں مبتلا کر کے دراصل مغربیت اور مغربی نظام تعلیم کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کے انیسویں صدی میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں بہت سے ہندوستانی باشندوں نے انگلستان اور دوسرے یورپی ممالک کا سفر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کیا۔جب کے انیسویں صدی میں یورپ کا سفر کرنے والے زیادہ تر سفر نامہ نگاروں نے جن میں سرسید احمد خان کا نام قابل ذکر ہے ہندوستانیوں کے لیے انگریزی زبان اور یورپی علوم وفنون کی تعلیم کو پسندیدہ قرار دیا۔لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کے کیا اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں سفر کرنے والے مجوزہ تحقیق کے لیے منتخب کردہ تین ابتدائی سفر نامہ نگاروں منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین نے بھی انگریزی زبان اور انگریزی نصاب و نظام تعلیم یا بحیثیت مجموعی یورپی علوم وفنون اور نظام تعلیم کو پسندیدہ اور ہندوستانیوں کے لیے باعث تقلید قرار دیا؟

یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کے اٹھارہویں صدی کا نصف آخر دراصل ہندوستان میں صرف برطانوی نوآبادیات کا ہی ابتدائی دور نہ تھا بلکہ برطانیہ اور بحیثیت مجموعی یورپ میں مستشرقیت کا بھی ابتدائی دور تھا۔اس لیے اس دور میں ہندوستانیوں کے لیے برطانوی نوآبادکاروں کی طرف سے نہ تو میکالے کی پیش کردہ تعلیمی رپورٹ کے جیسی کوئی رپورٹ یا پالیسی پیش کی گئی تھی اور نہ ہی مستشرقین کے قلموں نے ہندوستانی ودیگر مشرقی علوم وفنون کے

متعلق اس درجہ کا زہر اگلنا شروع کیا تھا جس کا اظہار انیسویں صدی میں کیا گیا تھا۔ تاہم اٹھارہویں صدی کے ہمارے ہندوستانی ابتدائی سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کے بغور مطالعہ سے ان میں بیان کردہ چند ایک ایسے حقائق ہماری توجہ اس جانب مبذول کراتے ہیں کہ ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں بھی اگرچہ زیادہ تر تحریری طور پر نہ سہی مگر زبانی کلامی ہندوستانی باشندوں اور ان کی علمی و تعلیمی صلاحیتوں اور مشرقی علم و ادب کے متعلق یورپی نوآبادکاروں نے چند ایسے بیانیے اور کلامیے ضرور مشہور کر رکھے تھے جو یورپیوں کے علم وہنر اور فنون کے مقابلے میں ہندوستانی علوم و فنون اور خود ہندوستانیوں کی علمی و تعلیمی پسماندگی اور کم مائیگی کا تصور اجاگر کرتے تھے۔ جیسے کے شگرف نامہ میں ہمیں منشی اعتصام الدین کی زبانی یورپیوں کے ہندوستانیوں اور ہندوستانی علم وادب کے متعلق چند ایک ایسے بیانیے پڑھنے کو ملتے ہیں جو اس صورت حال کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ مثلاً جب شگرف نامہ میں اعتصام فرانسیسیوں کی تہذیبی اور علمی وادبی ترقی کی تعریف کرتے ہیں اور فرانسیسیوں کے اس دعوی 'کو بیان کرتے ہیں کے وہ موجودہ زمانے یعنی اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کی علمی و فنی ترقی کو اپنی فراہم کردہ تربیت کا مرہون منت قرار دیتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کے بغیر فرانسیسیوں کی فراہم تردہ تربیت کے گزشتہ زمانے میں انگریز بھی ہندوستانیوں کی طرح سادہ لوح اور نادان مشہور تھے۔[۲۴] تو دراصل وہ یورپی اقوام کے اس نقطہ نظر کو سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتے ہیں کے یورپی عقل و علم میں 'ہندوستانیوں' کو خود سے کم تر سمجھتے تھے اور انہوں نے نوآبادیات کے ابتدائی دور سے ہی ہندوستانیوں کو کم عقل، بیوقوف اور کم علم مشہور کر رکھا تھا۔ جیسے کے خود اعتصام نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کے کپتان سوئنٹن نے شراب پینے سے انکار پر اعتصام کو بیوقوف اور نادان بنگالی جیسے القابات سے نوازا اور انہیں یہ بھی باور کرایا کے بنگالی دوسرے ہندوستانیوں کی نسبت زیادہ بیوقوف ہیں۔ اس کے علاوہ سفر نامہ میں اعتصام کا ہندوستانی اور برطانوی اشرافیہ کے فارغ اوقات میں دلچسپی کے رجحانات کا تقابل کرنا اور ہندوستانی اشرافیہ کے ہندی و فارسی کی ایسی شاعری جس میں ان کی رائے میں شراب وساقی کے ذکر کے سوا اور کچھ نہ ہوتا میں دلچسپی کے شغل کو فضول قرار دینا کیونکہ برطانوی بھی اس قسم کی شاعری کو بے فائدہ اور بے کار تصور کرتے تھے۔ جب کے اس کے مقابلے میں برطانوی اشرافیہ کے علم ہیئت اور تاریخی کتب کے مطالعہ کے رجحان کو پسندیدہ قرار دینا[۲۵] دراصل برطانوی خیالات کے زیر اثر ان کی مقتدر حیثیت اور ان کی علمی ترقی اور برتری کے تصور کو قبول کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ مگر اٹھارہویں صدی کے ابتدائی ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کے برطانوی نظام تعلیم کے متعلق بیان کردہ مشاہدات وتاثرات کے حوالے سے چند باتیں ابتدائی نوآبادیاتی باشندے ہونے کے ناطے اہم اور قابل غور ہیں۔ جیسے کے ان سفر نامہ نگاروں کے ہاں بھی اگرچہ ہمیں سائنسی علوم و فنون کی برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک میں تعلیم

دینے کے عمل کو سراہنے کا رجحان ملتا ہے۔ مگر ان سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے ایک تو یہ اہم بات تجزیہ کرنے کو ملتی ہے کے ان کے ہاں سائنسی علوم و فنون کو خالصتاً یورپی سمجھنے یا انہیں یورپی قرار دینے کا رجحان نہیں ملتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کے ان کے ہاں انگریزی زبان اور انگریزی نصاب تعلیم کو موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ ان کے ہاں برطانوی طریقہ تعلیم اور تربیت کے نظام کو نہ صرف موضوع بنایا گیا بلکہ اس حوالے سے ہمیں اعتصام الدین کے ہاں برطانوی طریقہ تعلیم اور تربیت کے نظام کا ہندوستانی طریقہ تعلیم اور تربیت سے موازنہ بھی ملتا ہے۔

محمد حسین کے حوالے سے یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کے انہوں نے یورپ کی تعلیمی اور علمی و سائنسی ترقی کو خالصتاً یورپی قابلیت و کاوشوں کا نتیجہ قرار نہ دیا بلکہ اس حوالے سے انہوں نے اسپین کے اس مسلم علمی سرمائے کو اہم سنگ میل قرار دیا جو فتح اسپین کے بعد یورپیوں کے ہاتھ لگا اور پھر یورپیوں نے ذوق و شوق سے نہ صرف ان سائنسی علوم کو حاصل کیا بلکہ اپنی محنت و کاوش سے ان میں مفید اضافے کیے اور انہیں جدید بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ محمد حسین نے اپنے سفر نامے میں یورپیوں کے مجموعی علمی رجحانات و رویوں کے حوالے سے اپنی جو معلومات و مشاہدات پیش کیے ان کے مطابق یورپی اقوام طبیعیات اور ریاضیات جیسے سائنسی علوم کی تحصیل میں خاص دلچسپی رکھتے تھیں اسی لیے انہوں نے ان علوم کی تعلیم کے جدید طریقے بھی متعارف کروار کھے تھے۔ ان سائنسی علوم کے مقابلے میں محمد حسین کی رائے میں یورپی فن منطق میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے تھے اسی لیے انہوں نے اس کا پڑھنا پڑھانا بہت حد تک متروک کر دیا تھا۔ محمد حسین کی معلومات کے مطابق فن منطق کی تعلیم کے متروک کر دینے کے پیچھے دراصل وہ یورپی سوچ کام کر رہی تھی جس کے مطابق وہ یہ خیال کرتے تھے کے 'صاحب ذوق و سلیقہ کبھی نحوی و عروضی غلطی نہیں کرتا اور بے ذوق کو ان فنون کی تعلیم سے بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

محمد حسین کے تجزیہ کے مطابق اگرچہ یورپ میں سائنسی علوم کی تعلیم عام تھی مگر قدیم زبانوں اور ان میں موجود علمی و ادبی سرمائے کی حفاظت اور اگلی نسلوں تک ان کی منتقلی کے پیش نظر یورپ میں لسانی علوم اور قدیم زبانوں جیسے کے عبرانی، یونانی اور رومی کی تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ محمد حسین نے خاص طور پر یورپیوں میں مستشرقیت کے بڑھتے ہوئے رجحان اور اس طرح مشرقی زبانوں اور ان میں تصنیف کردہ مختلف علوم و فنون، ادب اور مذہبی کتب کے تراجم کرنے کے رجحان کو موضوع بناتے ہوئے اس حوالے سے انگریزی النسل 'سیل' کے ترجمہ قرآن کو بطور مثال پیش کیا۔ [۲۱]

یورپ میں تعلیمی ترقی اور نصابی و دیگر کتب کی ایک عام آدمی تک رسائی کے حوالے سے ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین اور منشی اعتصام الدین نے چھاپہ خانے کو ایک اہم ایجاد قرار دیا۔ محمد حسین

نے اسے کتابوں کی طباعت اور علم کی ترسیل کے ساتھ ساتھ حصول زر کا بھی ایک بہترین ذریعہ قرار دیا۔ ان کی رائے میں چھاپہ خانے کی بدولت ایک کتاب کے ایک ہی جیسے نسخے بہت کم وقت میں اتنی تعداد اور قیمت میں دستیاب ہو جاتے تھے کے ایک عام آدمی بھی انہیں خرید سکتا تھا۔[۲۷]

منشی اعتصام الدین نے بھی ہندوستان میں نسخوں کی کتابت کی نسبت یورپ میں چھاپہ خانے کی بدولت نصابی و دیگر کتابوں کی **طباعت** کو ایک کم مدتی اور آسان طریقہ قرار دیا۔ جس کی بدولت کتابیں کم قیمت پر دستیاب ہوتی **تھیں**۔ اسی لیے **اعتصام** نے برطانیہ میں **تعلیمی** ترقی کی ایک وجہ کتب کی کثیر تعداد میں طباعت واشاعت کے انتظام اور نہایت کم قیمت پر اُن کی دستیابی کو قرار دیا جبکہ اس کے مقابلے میں انہوں نے ہندوستان میں کتابوں کی ارزاں قیمت اور اس کی وجہ سے کتب کی عدم دستیابی کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ انگلستان اور ہندوستان میں کتابوں کی قیمتوں کا موازنہ شاہنامہ فردوسی کی مثال کے حوالے سے اعتصام نے کچھ یوں پیش کیا:

> چنانچہ ہندوستان میں شاہنامہ فردوسی سینکڑوں روپیہ میں ملتا ہے اور ولایت میں بارہ روپیہ میں مل جاتا ہے۔[۲۸]

اعتصام کے ہاں برطانوی نظام تعلیم اور بچوں کی تربیت و تعلیم کے برطانوی رویوں کو بیان کرنے کی طرف خاص توجہ دی گئی بلکہ اس حوالے سے انہوں نے برطانوی اور ہندوستانی اشرافیہ اور مڈل کلاس طبقے کے ہاں بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے جو معاشرتی و سماجی رویے اپنائے گئے تھے ان کا تقابل بھی پیش کیا۔ جیسے کے اعتصام کے مشاہدہ کے مطابق انگلینڈ کی اشرافیہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لیے اسکولوں میں بھیجتی تھی۔ ان کے ہاں بچوں کو زیادہ تر اقامتی درسگاہوں میں تعلیم دلوانے کا رواج تھا اس لیے بچے ہفتہ یا مہینہ میں ایک بار اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے جاتے تھے۔ انگلینڈ کے اشرافیہ کے مقابلے میں اعتصام نے ہندوستانی اشرافیہ کے اس رجحان کو تنقید کا نشانہ بنایا کے وہ اپنے بچوں کو گھروں میں تعلیم دلواتے اور اس مقصد کے لیے اساتذہ کو گھروں میں بلواتے۔ اعتصام کے مطابق وہ اپنے بچوں کو محض اس لیے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہ بھیجتے کے کہیں وہ نظر بد کا شکار نہ ہو جائیں یا گھر سے دور سفر میں کسی بیماری کا شکار نہ ہو جائیں۔ اعتصام نے اس حوالے سے مزید یہ بھی لکھا کے بنگال کے لوگ انگریزوں کو اس بات پر مطعون کرتے تھے کے وہ اپنے بچوں کو خود سے الگ کر کے دور **تعلیمی** درسگاہوں میں بھیج دیتے تھے۔ اعتصام کی بنگال کے لوگوں کی انگریزوں کے متعلق پیش کردہ یہ رائے دراصل اس نقطہ کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کراتی ہے کے نوآبادیات کے ابتدائی دور میں انگریزوں کی ثقافت، معاشرتی رجحانات و رویے جیسے کے بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ ابتدائی نوآبادیاتی باشندوں (بنگالیوں) میں یکساں طور پر مقبول و پسندیدہ نہیں تھے۔ مگر ہم دیکھتے

ہیں کے اعتصام کی رائے بنگال کے عام لوگوں کے برعکس قدرے مختلف تھی انہوں نے انگریزوں کے اپنے بچوں کو اقامتی درسگاہوں میں پڑھانے کے رجحان کی نہ صرف حمایت کی بلکہ انہوں نے انگریزوں کی اس سخت دلی کو ہندوستانی ماں باپ کی اس محبت سے بہتر قرار دیا جو انہیں علم و ہنر حاصل کرنے کے لیے دور جانے سے روکتی تھی اور پھر انہیں آئندہ زندگی میں روزگار کے حصول کے لیے ذلیل وخوار ہونا پڑتا تھا۔[۲۹]

شگرف نامہ میں اعتصام نے انگلستان کے پرائمری اور ثانوی تعلیمی اداروں میں تعلیم دینے کے طریقہ کار، مختلف مضامین اور ان کو پڑھانے کے لیے استعمال کی جانے والی تکنیکوں کے متعلق اپنی معلومات و مشاہدات کے حوالے سے تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا کے وہاں بچے آٹھ سال علم و ہنر کی تحصیل میں صرف کرتے تھے اور تعلیم دینے کا طریقہ کار یہ تھا کہ سب سے پہلے بچوں کو حروفِ تہجی کی شناخت، مصادر اور ماضی و مستقبل کے صیغوں سے واقفیت کرائی جاتی تھی۔ پھر ایسے دلچسپ قصے اور کہانیاں سنائے اور پڑھائے جاتے تھے جن سے بچوں کا ذوق اور شوق بڑھتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد علم حساب اور بعد ازاں مذہبی تعلیم، قانون عدالت، ہیئت اور طب کی تعلیم دی جاتی تھی پھر جس شعبے میں بچے کا رجحان زیادہ ہوتا تھا اس میں اسے مزید مہارت حاصل کروائی جاتی تھی۔[۳۰]

برطانیہ کے نظام تعلیم کے متعلق اعتصام کی معلومات و تجزیہ نے انہیں اس حقیقت سے بھی روشناس کرایا کے وہاں اچھی تعلیم اور ہنر و فنون کے حصول کا انحصار دولت پر منحصر تھا یعنی اس حوالے سے برطانوی معاشرہ طبقاتی تقسیم کا شکار تھا اس لیے غریبوں اور امیروں کے سکول علیحدہ تھے۔ برطانوی معاشرے میں چونکہ عزت و وقار کا معیار بھی اچھی تعلیم و تربیت پر منحصر تھا اس لیے اعتصام کی رائے میں برطانوی اشرافیہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر اس قدر توجہ دیتے تھے کے انہیں چار سال کی عمر سے ہی تعلیم کے حصول میں لگا دیتے تھے اور انہیں مختلف ہنر اور فنون جیسے کہ گھڑ سواری، موسیقی اور رقص و سرود سکھانے کی طرف بھی خاص توجہ دیتے تھے۔ غریب لوگوں میں سے جو ان فنون کو اپنی غربت کے باعث سیکھنے سے محروم رہ جاتے تھے انہیں امراء خود سے کم تر سمجھتے اور ان کی غربت پر انہیں طعنے دیتے جس کی وجہ سے وہ علوم و فنون سیکھنے سے محروم رہ گئے۔ اسی لیے امراء ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے ۔ حتیٰ کے وہ لوگ ایسی لڑکیوں سے بھی شادی کرنا پسند نہ کرتے جو رقص و سرود کا فن نہ جانتی تھیں۔ یورپ قیام کے دوران اگرچہ اعتصام کو فرانسیسیوں کی تہذیبی و ثقافتی برتری اور مختلف ہنر و فنون میں ان کی مہارت کے متعلق بہت کچھ سننے کو ملا تھا مگر جب اعتصام نے برطانیہ میں خود مشاہدہ کیا کے برطانوی اشرافیہ اپنے بچوں کو گھڑ سواری سکھانے کے لیے خاص طور پر لندن میں قائم فرانسیسیوں کے قائم کردہ مراکز میں بھیجتی تھی تو وہ مختلف ہنر و فنون میں ان کی برتری کے قائل نظر آئے اور ان کے مطابق کچھ برطانوی امراء تو اپنے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے لیے انہیں براہ

راست فرانس بھیج دیتے تھے جہاں وہ علم موسیقی اور شہ سواری جیسے ہنر وفنون سیکھتے تھے۔ مگر اعتصام اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ برطانوی معاشرے کی طبقاتی تقسیم غریب لوگوں کے بچوں کو نہ تو ان مدارس میں جہاں برطانوی اشرافیہ اور مڈل کلاس طبقہ اپنے بچوں کو تعلیم دلواتا تھا پڑھنے کی اجازت دیتی تھی اور نہ ہی وہ امراء کی طرح اپنے بچوں کو فرانسیسی تربیتی اداروں میں شہ سواری و دیگر فنون کی تعلیم دلوا سکتے تھے۔ چنانچہ اعتصام کے مشاہدہ کے مطابق ایسا برطانوی غربت زدہ طبقہ جو اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے نہیں کر سکتا تھا اُن کے بچے یا تو جاہل رہ جاتے تھے یا پھر وہ اپنے بچوں کو بس ضروری تعلیم دلوا کر مختلف کارخانوں میں ہنر سیکھنے کے لیے بھجوا دیتے تھے۔ اس طرح ان کے بچے سناروں، لوہاروں، درزیوں، بڑھیوں اور موچیوں کے کارخانوں میں یہ ہنر سیکھ کر ان کو بطور پیشہ اختیار کر لیتے اور کوئی کسی دوسرے کے پیشے کو برا نہ سمجھتا۔ پیشوں کے حوالے سے انگلش لوگوں کے اس رویے کا تقابل ہندوستانی لوگوں کے رویوں سے کرتے ہوئے منشی اعتصام الدین نے ہندوستانی معاشرے کو تنقید کا نشانہ بنایا کیونکہ ان کی رائے میں ہندوستان میں لوگ صرف اپنے پیشے کو اچھا اور دوسرے کے پیشے کو برا سمجھتے تھے اور کسی دوسرے کے پیشے کو اپنانے والے کو اپنی قوم سے خارج قرار دیتے تھے۔ [۴۱]

منشی اعتصام الدین کے ہاں ہندوستان کے ایسے مدارس کو تو تنقید کا نشانہ بنایا گیا جو خیر و خیرات سے ملی رقم پر بچوں کو تعلیم دیتے تھے مگر یورپ قیام کے دوران انہیں فرانس اور برطانیہ میں قائم کردہ باشاہی خرچ پر چلنے والی خیراتی حویلیوں (poor houses) میں یتیم، لاوارث اور غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کے طریقہ کار نے بے حد متاثر کیا۔ اس حوالے سے انہوں نے خاص طور پر برطانیہ میں بادشاہی خرچ پر چلنے والی حویلی میں یتیم اور لاوارث اور ایسے غریب بچوں کے جن کے ماں باپ اپنی غربت کے باعث انہیں یہاں چھوڑ جاتے تھے کی تعلیم و تربیت کے طریقہ کار کے متعلق اپنی معلومات و مشاہدات خاص طور پر پیش کیے۔ اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق باشاہی خرچ پر چلنے والی یہ حویلی (poor house) بہت بڑی اور وسیع تھی۔ اس حویلی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام وانصرام کچھ اس طرح کیا گیا تھا کہ حویلی میں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملازمین جبکہ علوم وفنون کی تحصیل کے لیے استاد مقرر کیے گئے تھے اور یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ جگہ پر رکھا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو ضروری تعلیم دینے کے بعد سینے اور پرونے کا ہنر سکھایا جاتا تھا جبکہ لڑکوں کو زیادہ تر فوجی تربیت، جنگی قوانین، جہاز سازی اور جہاز رانی کے حوالے سے مختلف فنون سکھائے جاتے تھے۔ جو بچے فوج میں جانے کے قابل نہ ہوتے انہیں دیگر کام سونپ دیے جاتے تھے۔ بڑھاپے میں یہ لوگ چوکیداری اور سڑکوں پر چراغ جلانے کا کام کرتے تھے۔ [۴۲] یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارہویں

صدی کے نصف آخر کے انگلستان میں اعتصام نے ہر شخص کو چاہے امیر تھا یا غریب، اپنی لیاقت، قابلیت اور حیثیت کے مطابق علم و ہنر کی تحصیل کے بعد اپنی اور ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیتے دیکھا۔

یہ اہم بات ہے کے اعتصام کو جہاں برطانوی اشرافیہ اور درمیانے طبقے میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور مختلف فنون سکھانے کے حوالے سے پائے جانے والے معاشرتی رجحانات ورویوں نے بے پناہ متاثر کیا وہیں ہندوستانی اشرافیہ کی تعلیم میں عدم دلچسپی اور مختلف ہنر و فنون سکھانے کے حوالے سے برتی جانے والی لاپرواہی پر انہیں بہت افسوس اور مایوسی ہوئی کیونکہ ان کی رائے میں ہندوستانی اشرافیہ کے پاس دولت کی کمی نہ تھی مگر ان کی تعیش پرستی نے انہیں انگریزوں جیسی محنت و مشقت اور تعلیم و تربیت کے حصول اور عام عوام تک اس کی فراہمی سے روک رکھا تھا۔ اعتصام کی رائے میں:

> اس بات سے اندازہ کرنا چاہیئے کے جب امیروں کے بیٹے چار سال کی عمر سے گھوڑے کی سواری اور چوگان کھیلنے کی مشق کرتے ہیں اور بڑھاپے تک یہ مشق جاری رکھتے ہیں اور ہر قسم کی محنت اور سختی برداشت کر کے ہنر حاصل کرتے ہیں، آرام وراحت کی طرف زیادہ رغبت نہیں کرتے تو ایسے لوگ دوسرے ملکوں پر کیوں نہ مسلط ہوں۔ بخلاف اس کے ہمارے ملک ہندوستان کے امراء پلاؤ کھاتے ہیں اور ہر برف کا جھل پانی پی کر نرم و نازک بستروں پر آرام کرتے ہیں، عیش و عیشرت کو شعار بنایا ہے۔ غرور و تمکنت کے نشے میں مست رہتے ہیں۔ ان کو اپنے ملک اور رعایا کی حفاظت اور بھلائی کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں اگر ان کا ملک غیروں کے قبضہ میں چلا جائے تو تعجب کی بات نہیں ہوگی۔ [۳۳]

غرض کے برطانوی نظام تعلیم اور ہندوستانی نظام تعلیم کے حوالے سے اعتصام کا پیش کردہ تقابل اور اس حوالے سے دیئے گئے دلائل دراصل اس نقطہ کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں کے اعتصام کی بحث کا موضوع برطانیہ یا ہندوستان میں پڑھائے جانے والے علوم یا نصابات کا تقابل نہ تھا اور نہ ہی نوآبادیات کے اس ابتدائی دور میں انگریزی زبان کی فضیلت ان کا موضوع بنی۔ بلکہ ان کے ہاں ہمیں برطانوی اشرافیہ اور مڈل کلاس طبقے کے افراد میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اپنائے گئے رویوں کو سراہنے کا رجحان ملتا ہے۔ جب کے ہندوستانی اشرافیہ و امراء میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اپنائے گئے رویے اعتصام کو غیر مناسب اور نامعقول محسوس ہوئے۔ اسی لیے اعتصام کے حساس دماغ، دوربین نگاہ اور سیاسی سوجھ بوجھ نے ان پر ہندوستان کے زوال کے اندرونی اسباب کو ظاہر کرتے ہوئے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہی انہیں یہ پیشن گوئی کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا کے اگر ہندوستانی

اشرافیہ وامراء نے اپنی تعیش پرستی نہ چھوڑی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اسی قسم کی غفلت برتتے رہے تو یقیناً غیر (برطانوی) ان کے ملک ہندوستان پر قابض ہو جائیں گے۔

۴۔ برطانوی نظامِ حکومت اور حکومتی ادارے

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اور مغلیہ نظامِ حکومت چونکہ زوال اور شکست وریخت کا شکار ہو چکا تھا اسی لیے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں برطانیہ کا سفر کرنے والے ابتدائی جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے برطانوی نوآبادکاروں کے نظامِ حکومت اور حکومتی اداروں کا نہ صرف عمیق مشاہدہ کیا بلکہ ان تمام اداروں کے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک، تعاون، توازن اور ان کے درمیان پائے جانے والے نظم وضبط کو بے حد سراہا۔ انگلستان کے نظامِ حکومت اور سیاسی اداروں کے حوالے سے منشی اعتصام الدین کے ہاں ہمیں انگلستان کی گزشتہ سیاسی تاریخ، اٹھارہویں صدی میں انگلستان کے پارلیمانی نظام میں بادشاہ اور دیگر سیاسی اداروں کے اختیارات و ذمہ داریوں پر تفصیلی معلومات و تجزیہ ملتا ہے۔ منشی اسماعیل کے ہاں اگرچہ قدرے اختصار کے ساتھ انگلستان کے نظامِ حکومت اور مختلف اداروں کے آپس کے تعاون و توازن کے متعلق مختصر معلومات فراہم کی گئیں ہیں مگر منشی اسماعیل کے اختصار کے باوجود ان کی فراہم کردہ معلومات سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بھی انگلستان کے پارلیمانی نظام حکومت کے فوائد کو سمجھنے اور سراہنے سے قاصر نہیں تھے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے ان دونوں ہندوستانی سفر نامہ نگاروں نے انگلستان میں جو نظام حکومت و سیاست دیکھا تھا وہ دراصل صدیوں کے ارتقا اور محنت وجدوجہد کا نتیجہ تھا۔ ورنہ تاریخ کے ابتدائی ادوار میں یہ لوگ بھی پتھروں اور دھاتوں کے زمانے سے گزرے۔ ان پر بھی غیر ملکی بادشاہوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کیے رکھا جیسے کہ روم کے جولیس سیزر نے پہلی صدی قبل مسیح میں برطانیہ کے جنوبی حصہ پر قبضہ کیا اور تین سو سال تک رومی جنوبی برطانیہ پر قابض رہے۔ چھٹی صدی میں جوٹس، اینگلز اور سیکسنز قبیلوں نے برطانیہ پر قبضہ کر لیا اور بعد ازاں ڈنمارکیوں نے ایک طویل عرصہ تک انگلستان پر اپنی حکومت قائم رکھی مگر برطانویوں نے غیر ملکی تسلط سے چھٹکارا پانے اور میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) منظور کروانے سے لے کر انگلستان میں پارلیمانی اور جمہوری نظام سیاست قائم کرنے تک طویل جدوجہد جاری رکھی۔ [۳۴]

جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین نے انگلستان پر غیر ملکی اقوام کے تسلط، تسلط کی وجوہات نیز برطانوی قوم کی سیاسی جدوجہد کے حوالے سے جو معلومات فراہم کیں ان سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے برطانیہ کی گزشتہ سیاسی تاریخ کا بھی کافی مطالعہ کر رکھا تھا شاید اسی وجہ سے وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ دکھائی دیئے

کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انہوں نے برطانیہ میں جو آئین کی بالادستی اور پارلیمانی نظام رائج دیکھا وہ دراصل صدیوں کے ارتقاء اور سیاسی انقلابات کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ برطانیہ کے گزشتہ سیاسی حالات اور برطانوی قوم کے زوال کی وجوہات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اعتصام نے لکھا کے گزشتہ زمانے میں انگلینڈ کے امراء و اراکین اور بادشاہوں میں باہمی اتحاد و اتفاق نہ تھا بلکہ اس چھوٹے سے ملک پر سات آٹھ بادشاہوں نے اس طرح حکومت کی ہمیشہ طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا اور جاگیردارانہ نظام قائم رہا۔ اعتصام کی رائے میں انگلینڈ کے گزشتہ بادشاہوں اور امراءو اراکین حکومت کی یہی نااتفاقی ان پر غیر ملکی جیسے کے رومیوں اور بعد ازاں ڈنمارکیوں کے تسلط کی وجہ بنی۔ اعتصام نے برطانوی قوم کے مذہبی عقائد کو بھی جو یورپ (فرنگستان) کی دوسری اقوام کے مذہبی عقائد سے قدرے مختلف تھے ان پر دوسری یورپی اقوام جیسے کے ڈنمارکیوں کے غاصبانہ تسلط کی ایک اور وجہ قرار دیا کیونکہ ان کی معلومات کے مطابق انگریزوں کے دوسرے اہل نصاریٰ کے ساتھ مذہبی عقائد میں اختلاف کی وجہ سے دوسری یورپی اقوام انہیں ناپسند کرتی تھیں اور انہیں اپنا مخالف سمجھتی تھیں۔[۲۵]

برطانوی عوام کے غیر ملکی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اعتصام الدین نے بیان کیا کے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برطانوی عوام اور حکمرانوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا اور انہوں اپنے اندر اتحاد و اتفاق پیدا کیا۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال کی طویل جدوجہد کے بعد انہوں نے ڈنمارکیوں سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اعتصام کے مشاہدہ کے مطابق برطانیہ میں ڈنمارکیوں کی تعمیر کردہ عظیم الشّان عمارتیں اور عبادت گاہیں غیر ملکی دور تسلط کی یادگار کے طور پر اٹھارہویں صدی میں بھی موجود تھیں۔ اعتصام نے اپنی معلومات کے مطابق انگلستان کی سیاسی تاریخ میں ولیم فاتح (William the Conqueror c.1028-1089) کو انگلستان کا پہلا خود مختار بادشاہ قرار دیا جس کا تعلق اگرچہ فرانس سے تھا اور اس نے انگلستان پر حملہ کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی مگر اس نے بہت جلد اپنے حسنِ اخلاق سے انگلینڈ کے امراءو اراکین کو اپنا گرویدہ بنالیا اور انہوں نے خوشی خوشی اس بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی اور پھر نو پشتوں تک انگلینڈ میں ولیم خاندان کی حکومت قائم رہی۔ اس کے بعد جارج خاندان بر سرِ اقتدار آیا۔ منشی اعتصام الدین جب انگلستان گئے تو اس وقت وہاں جارج سوم کی حکومت قائم تھی۔

انگلستان میں سیاسی اداروں کے قیام و استحکام نے منشی اعتصام الدین کو بہت متاثر کیا۔ چناچہ اعتصام الدین کی معلومات و تجزیہ کے مطابق برطانوی قوم نے طویل سیاسی جدوجہد کے بعد اپنے ملک میں ایک مضبوط نظامِ حکومت قائم کرنے کی خاطر چار ادارے قائم کیے۔ ان میں پہلا محکمہ عدالت، دوسرا محکمہ انتظام عام، تیسرا محکمہ سلطنت کے امور کی نگرانی کے لیے وزراء، امراء اور مشیروں پر مشتمل تھا جبکہ چوتھا محکمہ فوجی افسران پر مشتمل تھا جو ملک کی سرحدوں کی

حفاظت کی خاطر بحری اور بری فوج کے ساتھ ساتھ جنگی جہازوں کا انتظام بھی کرتا تھا۔ اس طرح منشی اعتصام الدین کے مطابق ملک کا اصل اقتدار بادشاہ کے بجائے ان چار اداروں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ یہی تمام ادارے ملکی و مالی معاملات کے ذمہ دار تھے جبکہ بادشاہ کے پاس قوانین کے اجراء کا کوئی اختیار نہیں تھا۔[23]

منشی اعتصام الدین نے شگرف نامہ میں انگلستان کے نظامِ حکومت کے حوالے سے نہ صرف بادشاہ کے کردار اور بقیہ چار اداروں کی ذمہ داریوں اور محاسن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے بلکہ وہ نوآبادکاروں کے نظامِ سیاست کے محاسن کا تقابل ہندوستانی نظامِ سیاست کے عیوب سے بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ا۔ بادشاہت

شگرف نامہ میں ہمیں انگلستان میں بادشاہت، اس کی نوعیت، بادشاہ کے کردار و اختیارات نیز بادشاہ اور برطانوی عوام کے درمیان تعلقات کی نوعیت کے متعلق تفصیلی معلومات اور سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کے اعتصام کو انگلستان میں ہندوستان سے یکسر مختلف نظام بادشاہت دیکھنے کو ملا تھا جس سے وہ بہت متاثر بھی ہوئے۔ انگلستان میں بادشاہت کے ادارے اور تخت کی موروثیت پر اپنی معلومات کے مطابق تجزیہ پیش کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کے انگلستان میں 'بادشاہت' اگرچہ ایک موروثی ادارہ تھا مگر اس کی موروثیت کے بھی باقاعدہ قوانین مرتب کیے گئے تھے۔ جیسے کے انگلستان میں اگر کوئی بادشاہ فوت ہو جاتا تو ان کے موروثی قانون کے مطابق بادشاہ کے بڑے بیٹے کو تخت نشین کیا جاتا۔ لیکن اگر بڑا بیٹا تخت اور نظام حکومت چلانے کے لائق نہ ہوتا تو بادشاہ کے باقی بیٹوں میں سے جو سب سے بہتر ہوتا اس کو بادشاہ بنایا جاتا۔ اگر کوئی بادشاہ بے اولاد ہوتا تو وہ لوگ گذشتہ بادشاہوں کی اولاد میں سے کسی قابل شخص کو بادشاہ بناتے اور کلیسا میں لے جا کر اس سے حلف دلواتے۔ منشی اعتصام الدین کے تجزیہ کے مطابق انگلستان میں بادشاہت اگرچہ ایک موروثی ادارہ تھا مگر نئے بادشاہ کا تقرر عوام کے اتفاق رائے سے کیا جاتا۔ برطانوی نظام سیاست میں بادشاہ کے کردار و اختیارات کو زیر بحث لاتے ہوئے اعتصام نے اس کے متعلق جو معلومات فراہم کیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کے انہیں اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کے برطانوی نظام سیاست میں بادشاہ کو مطلق العنانیت کا درجہ حاصل نہیں تھا بلکہ برطانیہ کے پارلیمانی نظام کی بدولت بادشاہ آئین و قوانین کا پابند تھا۔ اس لیے وہ جنگ و صلح وغیرہ کے معاملات میں خود سے کوئی فیصلہ صادر نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ ارا کین حکومت (پارلیمنٹ) سے صلح لینے کا پابند تھا۔ اعتصام کی رائے میں برطانوی نظام سیاست میں بادشاہ کو چونکہ رعایا کے محافظ اور نگہبان کا درجہ حاصل تھا۔ اس لیے اگر وہ نگہبانی کے فرائض صحیح طریقے سے انجام دیتا تو رعایا اس کے فرمانبردار رہتے اور اگر بادشاہ ظالم و مغرور ہو جاتا تو برطانوی عوام اسے بادشاہت کے عہدے سے ہٹا دیتی۔ منشی

اعتصام الدین کی رائے میں یہی وہ عوامی رویہ تھا جو بادشاہ کو اپنے کردار اور اعمال کے حوالے سے محتاط رکھتا تھا اور بادشاہ اپنے خلاف منصب کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اعتصام کو انگریزوں کے بادشاہ کے چناؤ اور تخت کی موروثیت کے حوالے سے بنائے گئے قوانین نیز بادشاہ کے محدود اختیارات اور عوام کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی اور مواخذے کے طریقہ کار نے اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے ان اصولوں کو دوسری اقوام کے لیے نمونہ عمل قرار دیا نیز انگریزی آئین کو دوسرے ممالک کے آئین حکومت سے بہتر قرار دیا۔ انگلستان کے بادشاہ کے اختیارات کا دوسرے ممالک کے بادشاہوں کے اختیارات سے تقابل کرتے ہوئے اعتصام نے اپنی یہ ناقدانہ رائے پیش کی کے انگلستان کا بادشاہ آئین و قوانین کا پابند تھا مگر دوسرے ممالک کے بادشاہ اپنی حیثیت میں مطلق العنانیت کا درجہ رکھتے تھے اور اپنے فیصلوں میں خود مختار تھے۔ اس طرح ان کے نقطہ نظر کے تحت فرد واحد کی ایسی حاکمیت اکثر اوقات ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتی تھی۔ ان کی رائے میں انگلستان کے مقابلے میں چونکہ دوسرے ممالک میں تخت کی موروثیت اور آئینی قوانین زیادہ بہتر نہیں تھے۔ اس لیے ان کے ہاں تخت نشینی کے حوالے سے کبھی جانشینوں اور کبھی غدار شاہی افسران کے درمیان تخت کے حصول کے لیے لڑائی جھگڑا رہتا تھا جیسا کہ منشی اعتصام الدین نے خاص طور پر ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو اس حوالے سے مثال کے طور پر پیش کیا جہاں آئین و قوانین کی بالادستی نہ ہونے کے سبب بادشاہ کے جانشین تخت کے حصول کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے اور جنگ وجدل کرتے تھے۔ اس صورت حال میں یا تو شہزادے قید کر دیے جاتے یا قتل یا پھر اندھے کر کے تخت سے اتار دیے جاتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کی سیاسی صورت حال اور شاہ عالم بادشاہ کے حالات کو منشی اعتصام الدین نے اپنے دعوی' کے ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ [۳۷] ہندوستان کے برعکس انگلستان کے قوانین (موروثی و آئینی) جو اعتصام کے تجزیہ کے مطابق عوام کے اتفاق رائے سے بنائے گئے تھے۔ ان کی بدولت کسی جھگڑے یا خون ریزی کا امکان نہیں رہتا تھا اور اس طرح انگلستان کے لوگوں کا اتحاد و اتفاق اور بہترین ملکی قوانین انہیں دنیا کی بہترین قوم بناتی تھی۔ اس بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے اعتصام الدین لکھتے ہیں کہ :

> جس طرح انگریزوں میں اتحاد و اتفاق اور ضبط و نظم ہے وہ کسی دوسری قوم میں نہیں ہے۔ ان کے ملکی قوانین بھی سب سے بہتر ہیں۔ ہفت اقلیم میں ان سے بہتر کوئی قوم نہیں ملے گی۔ [۳۸]

ایک نو آبادیاتی باشندے کی حیثیت سے برطانوی نو آبادکاروں کے ملکی قوانین اور بحیثیت مجموعی انگریز قوم کے متعلق منشی اعتصام الدین کی یہ رائے خاص اہمیت کی حامل ہے۔

برطانوی عوام کے فکر و عمل، اظہار رائے کی آزادی اور سیاسی سوجھ بوجھ سے اعتصام بہت متاثر ہوئے۔ اس حوالے سے انہوں نے ہندوستان اور انگلستان کے لوگوں کے رویوں میں تقابل پیش کرتے ہوئے اپنی یہ رائے پیش کی کے ہندوستان میں بادشاہوں اور حکمرانوں کے حوالے سے ہندوستانی لوگوں کا رویہ یہ تھا کے وہ بادشاہوں اور امراء کی غلامی پر فخر محسوس کرتے تھے مگر ان کے برعکس برطانوی عوام خود کو کسی کا غلام نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی کسی کے سامنے جھکتے تھے کیونکہ وہ لوگ بادشاہ کو محض ایک ایسے سردار کی حیثیت دیتے تھے جس کا کام ملکی معاملات اور انتظامات چلانا تھا۔ اس لیے باشاہ انگلستان بھی اگر اپنے افسران یا عوام سے کوئی خاص مہم سر کرانا چاہتا تھا تو اس کے لیے وہ حکم صادر نہیں کرتا تھا بلکہ نہایت مہذب انداز میں درخواست پیش کرتا تھا۔ اس طرح اس کی جائز درخواست پر تمام حکومتی اراکین اور عوام اسے اپنی جان نثاری کا یقین دلاتے۔ لیکن اگر بادشاہ اپنے قول و فعل میں مغرور ہو جاتا اور تحکمانہ انداز اپناتے ہوئے فرمان جاری کرنے لگتا تو وہ لوگ اپنی عزت کو مقدم خیال کرتے ہوئے بادشاہ کی اطاعت کو خود پر لازم نہ سمجھتے بلکہ وہ ایسے مغرور بادشاہ کو بادشاہت سے ہی محروم کر دیتے تھے۔[۹۳] برطانوی عوام کے فکر و عمل، اظہار رائے اور سیاسی سوجھ بوجھ کے حوالے سے اعتصام کے بیان کردہ تاثرات یقیناً اس بات کی دلیل پیش کرتے ہیں کے انہیں ہندوستان کے مقابلے میں انگلستان کے لوگ باشعور معلوم ہوئے جو اپنے حقوق و فرائض کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی رکھتے تھے۔

انگلستان و ہندوستان میں بادشاہت نیز بادشاہ کے کردار و اختیارات پر منشی اعتصام الدین کی آراء و تبصرے یقیناً اس بات پر دلالت پیش کرتے ہیں کے وہ گہرا سیاسی شعور اور سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان میں چونکہ مغلیہ سلطنت کے سیاسی زوال کے اسباب و محرکات سے بخوبی واقف تھے اس لیے انہوں نے انگلستان کے نظام حکومت خاص کر بادشاہ کے اعمال و کردار کے حوالے سے ایسے محاسن اجاگر کرنے کی طرف توجہ دی جو ان کی رائے میں برطانوی سیاسی نظام کے استحکام اور ترقی میں معاون و مددگار ثابت ہوئے۔

ب۔ پارلیمنٹ

انگلستان کے حکومتی اداروں (پارلیمنٹ، عدلیہ اور فوج) کے حوالے سے منشی اعتصام الدین نے سب سے پہلے 'پارلیمنٹ' کے کردار و ذمہ داریوں کو زیر بحث لایا۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں پارلیمنٹ کے لیے مناسب ترین فارسی اصطلاح 'عدالت خانہ' استعمال کی مگر وہ اس کی انگریزی اصطلاح 'پارلیمنٹ' سے بھی واقف تھے۔

منشی اعتصام الدین نے شگرف نامہ میں اٹھارہویں صدی کے انگلستان کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت اور اس میں پارلیمنٹ ہاؤس کے اراکین کی نشست و برخاست کے حوالے سے جو معلومات فراہم کیں ان سے یہ محسوس

ہوتا ہے کے انگلستان قیام کے دوران اعتصام کو برطانوی پارلیمنٹ ہاؤس کو براہ راست دیکھنے کا موقع بھی میسر آیا تھا۔اسی لیے ان کے ہاں برطانوی پارلیمنٹ (عدالت خانہ) کی عمارت کے ساتھ ساتھ اس میں اراکین پارلیمنٹ اور بادشاہ کی نشست و برخاست کے متعلق بھی معلومات فراہم کرنے کی طرف خاص دلچسپی لی گئی۔ جیسے کے اعتصام کے مطابق برطانوی عدالت خانہ (پارلیمنٹ ہاؤس) میں اراکین کے عہدوں کے مطابق سب کی نشستیں درجہ بدرجہ بنائی گئی تھیں۔ان کے لیے یہ بات باعث حیرانی تھی کہ ہندوستانی بادشاہوں کے برعکس (جو دربار میں تخت پر متمکن ہوتے تھے) انگلستان کا بادشاہ عدالت خانہ میں سب سے اوپر والی نشست پر محض ایک سرخ رنگ کی کارچوبی کرسی پر متمکن ہوتا تھا اور اس کا لباس عام انگریزوں کی طرح کرتا اور ٹوپی ہوتا تھا البتہ وہ سر پہ ہیرے اور جوہرات سے مرصع ایک ٹوپی رکھتا تھا جو صرف بادشاہ سے مخصوص ہوتی تھی۔اعتصام کی رائے میں بادشاہ کا یہ لباس بھی صرف دربار عام اور جنگ کے وقت کے لیے ہوتا تھا ورنہ عام حالات بھی بادشاہ بھی عام لوگوں جیسی ٹوپی زیب تن کرتا تھا۔

برطانوی پارلیمنٹ اعتصام کے لیے چونکہ اپنی طرز کا ایک منفرد سیاسی ادارہ تھا چنانچہ انہوں نے اپنے ہندوستانی قارئین کو اس برطانوی ادارے کی تنظیم یعنی اس کے اراکین کی تعداد اور ان کی ذمہ داریوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین کا انتخاب اس طرح کیا جاتا تھا کہ اعلیٰ و ادنیٰ دونوں طبقوں سے چوبیس آدمی اتفاق رائے سے عدالت خانہ کے اراکین منتخب کیے جاتے تھے جبکہ ایک شخص کو بطور بادشاہ کا نائب منتخب کیا جاتا تھا ۔اعتصام اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ دکھائی دیتے ہیں کے ملک کے مالی اور انتظامی معاملات اور قوانین کے اجراء کا اختیار بادشاہ کے پاس نہیں تھا بلکہ یہ برطانوی پارلیمنٹ کی ذمہ داریاں تھیں۔اعتصام کے مطابق انتظامی معاملات اور قوانین کے اجراء کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ عدالت خانہ کا ہر رکن کسی بھی معاملے پر اپنی اپنی تجویز ایک کاغذ پہ لکھ کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتا تھا۔ بادشاہ سب کی تحریروں پر غور و فکر کر کے بغیر کسی روک ٹوک کے اپنا فیصلہ لکھ دیتا تھا۔

بادشاہ پر پارلیمنٹ کے احکام کی بالادستی کا ذکر کرتے ہوئے منشی اعتصام الدین نے مزید یہ بھی لکھا کے بادشاہ ملکی و مالی معاملات میں دخل نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی کسی کے قتل کا حکم صادر کر سکتا تھا۔البتہ بادشاہ کو جان بخشی کا اختیار حاصل تھا۔ اس لیے اگر بادشاہ ایسا کرنا چاہتا تو اراکین عدالت بھی اس فیصلے کا احترام کرتے ۔اراکین عدالت خانہ کی مدت ملازمت اعتصام کی معلومات کے مطابق محض تین سال کا مختصر عرصہ تھی اس کے بعد نئے اراکین کا انتخاب کیا جاتا تھا۔اعتصام کی رائے میں اراکین کی یہ مختصر مدت اس لیے رکھی جاتی تھی تاکہ زیادہ عرصہ ایک ہی

عہدہ پر رہنے کے باعث عدالت کے اراکین کسی کی طرف داری یا رشوت خوری جیسے قبیح افعال میں ملوث نہ ہو جائیں۔[۴۰]

انگلستان قیام کے دوران منشی اعتصام الدین نے یہ محسوس کیا کے برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی عوام کے درمیان بھی گہرا ربط وضبط قائم تھااور برطانوی عوام اس قدر طاقتوراور باشعور تھی کے ان کی مرضی کے بغیر برطانوی پارلیمنٹ بادشاہ کے چناؤاور ملکی ومالی سطح کے بڑے معاملات تودرکنار کسی کی تنخواہ یامزدوری میں معمولی سااضافہ بھی صرف اپنی صوابدید پر نہیں کرسکتی تھی۔اس لیے برطانوی پارلیمنٹ کسی بھی نئے کام کے آغاز کے لیے قرعہ اندازی کے ذریعے برطانوی عوام کی رائے اور مرضی جاننے کی پابند تھی۔

برطانوی عوام کے عدالت خانہ کے ساتھ مالی وانتظامی امور میں تعاون کرنے کے رحجان کو بھی منشی اعتصام الدین بے حد سراہا۔اس حوالے سے اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اعتصام نے لکھاکے اگران لوگوں کو جنگ کا سامناہوتا اور دشمن مقابلے پر ہوتا مگر جنگ کی طوالت کے باعث خزانہ خالی ہورہاہوتاتوملک کے امراءعدالت خانہ (پارلیمنٹ) کی درخواست پر اسے مالی مدد بطور قرض دیتے اور جنگ کے بعد امن کے دنوں میں یہ رقم ملکی آمدنی سے اداکردی جاتی جبکہ اس قرض شدہ رقم پر ہرماہ سود قرض دینے والے کوملتارہتا۔اس طرح منشی اعتصام الدین کی رائے میں پوری قوم کے اتحادواتفاق سے کسی کانقصان بھی نہ ہوتااور ملک کا بھی فائدہ ہوتا۔[۴۱]

مال گزاری کی وصولی اور ادائیگی کا برطانوی نظام بھی اعتصام کی توجہ کامرکزبنااورانہوں نے نہ صرف مالگزاری کی وصولی وادائیگی کے برطانوی طریقہ کار کو سراہابلکہ اس کاہندوستانی مال گزاری کی وصولی وادائیگی کے طریقہ کار سے موازنہ بھی پیش کیااوراس طرح انہوں نے نہایت عمدہ طور پر برطانوی اور ہندوستانی ٹیکس کے نظام اوراس کی ادائیگی کے طریقہ کار کے حوالے سے دومتضاد صورتوں کو پیش کیا۔اس حوالے سے اپنامشاہدہ پیش کرتے ہوئے اعتصام نے لکھاکے انگلینڈ میں امراءاور زمیندار بغیر کسی کے کہے اور بلائے مالگزارمی کی رقم دوقسطوں میں خود خزانے میں جمع کرا دیتے تھے۔جب کے بنگال کے راجہ اور زمیندار مالگزاری کی وصولی کے لیے لوگوں کو مارتے پیٹتے تھے اورانہیں قید وبند کی صعوبتیں دے کر مقررہ رقم وصول کرتے تھے۔

منشی اعتصام الدین نے دراصل اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان میں ٹیکس کاایک منظم نظام دیکھاتھااوران کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس زمانے میں انگلستان کی مال گزاری اگرچہ ہندوستان کی مال گزاری سے بہت کم تھی مگر دوسرے ملکوں کے مقابلے میں انگلستان میں خشکی اور تری کے محصولات کافی زیادہ تھےاور مختلف چیزوں جیسے کے گاڑیوں، چھکڑوں اور سڑکوں کی مرمت وغیرہ کے لیے ٹیکس مقرر تھے۔اعتصام کو یہ بات بہت پسند

آئی کے انگلستان میں مقرر کردہ چیزوں پر مخصوص ٹیکس کے علاوہ ایک اضافی روپیہ بھی عوام سے وصول نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اعتصام اس حقیقت سے بھی واقف تھے کے قحط یا جنگ کے دنوں میں برطانوی عوام سے دوگنا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔[۳۴]

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ملک کے مالی وانتظامی امور اور قوانین کے اجراء میں پارلیمنٹ کے کردار نے منشی اعتصام الدین کو بہت متاثر کیا اور وہ اس برطانوی سیاسی ادارے کے متعلق کافی معلومات بھی رکھتے تھے مگر ان کے ہاں ہمیں برطانوی پارلیمنٹ کے اداروں House of Lords اور House of Commons میں نہ تو تخصیص ملتی ہے اور نہ ہی انہوں نے ان کے اراکین اور ان کی ذمہ داریوں کو الگ سے بیان کیا۔ بلکہ انہوں نے بحیثیت مجموعی برطانوی پارلیمنٹ ہاؤس کی سرگرمیوں اور ملکی قوانین کے اجراء میں اس کے کردار کو زیر بحث لایا۔

ج۔ عدلیہ

عدالت برطانوی نظام حکومت کا ایک اور اہم ادارہ تھا جس کی بابت منشی اعتصام الدین نے دلچسپ معلومات فراہم کیں اور کچھ جرائم جیسے کے قتل اور چوری کے حوالے سے برطانوی قانونی چارہ جوئی اور سزا کا موازنہ اسلامی قوانین سے بھی پیش کیا۔

منشی اعتصام الدین کے مطابق برطانوی عدالتی نظام میں مقدمات دائر کرنے کا طریقہ کار یہ تھا کے مال اور فوجداری کے مقدموں میں مدعی اور مدعی الیہ اپنا اپنا وکیل منتخب کر کے عدالت سے رجوع کرتے تھے۔ مگر ان کے لیے یہ بات باعث حیرت تھی کہ برطانوی عدالتوں میں مختلف مقدمات مہینوں نہیں بلکہ برسوں چلتے تھے اور اس طرح فریقین کو عدالت اور وکیل پر بھاری رقم صرف کرنا پڑتی تھی جبکہ مقدمہ ہارنے والے فریق کو جیتنے والے فریق کو مقدمہ کے اخراجات بھی ادا کرنے پڑتے تھے۔ اعتصام الدین کے مطابق اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں بنگال کی عدالتوں بھی یہی برطانوی طریقہ عدالت رائج ہو چکا تھا۔

برطانوی عدالتی نظام کے حوالے سے جو باتیں منشی اعتصام الدین کو پسند آئیں۔ ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ عدالت میں رشوت اور نذرانہ لینے کو کوئی رواج نہ تھا اور دوسری یہ کہ عدالت میں سزا کے حوالے سے امیر اور غریب میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ یعنی وہ یہ مؤقف پیش کرنا چاہتے تھے کے ہندوستان کے برعکس برطانیہ میں قانون سب کے لیے برابر تھا۔

قتل اور چوری جیسے جرائم کی برطانوی آئین اور اسلامی آئین میں سزا کا موازنہ کرتے ہوئے منشی اعتصام الدین نے یہ فرق واضح کیا کے برطانوی عدالتوں میں قتل کے مقدمہ میں سزا کے حوالے سے امام محمد کے قول کو امام

ابو حنیفہ کے قول پر ترجیح دیتے ہوئے وہ لوگ دیت قبول نہیں کرتے تھے بلکہ قصاص یعنی سزائے موت ہی دیتے تھے۔ ہاں البتہ شرعی عذر ملنے پر مجرم کو رہا کر دیتے تھے اور قتل کے مجرم کو سزا دینے میں دراصل خود ہی حیلہ و حجت سے کام لیتے تھے۔ اسی طرح منشی اعتصام الدین نے اسلامی آئین عدالت میں چوری کی سزا کا موازنہ برطانوی آئین عدالت سے کرتے ہوئے یہ وضاحت پیش کی کہ اسلام میں ایسے شخص جس نے آٹھ آنہ (پچاس پیسے) سے زیادہ کی چوری نہ کی ہو اس کے ہاتھ کاٹنا ضروری نہیں قرار دیا گیا مگر انگلستان میں اس کے برعکس چوری کی سزا، سزائے موت تھی کیونکہ وہ لوگ چوری کی سزا کو مال کی کمی بیشی پر نہیں بلکہ ارادے پر موقوف سمجھتے تھے اور اس حوالے سے یہ توجیح پیش کرتے تھے کے اگر چور کے ہاتھ زیادہ مال لگتا تو یقیناً وہ زیادہ چوری کرتا۔[۴۳]

منشی اعتصام الدین کے مشاہدہ کے مطابق چوری کی سخت سزا کے باوجود انگلستان میں چور اچکے بہت تھے۔ جو بازاروں اور ناچ گھروں کے باہر لوگوں کی جیبوں سے نقدی اور قیمتی مال نکال لیتے تھے اعتصام کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کے انگلستان میں چور کو پکڑوانا یا اس پر مقدمہ کرنا وہاں کی قانونی شرائط کے مطابق ایک مشکل کام تھا اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> اگر جیب میں ہاتھ ڈالتے وقت اس کو پکڑ لیں تو وہ چیز مالک کو مل جاتی ہے اور چور کو موت کی سزا ملتی ہے اور اگر چور کا ہاتھ مال سمیت نہ پکڑ سکا اور یہ دیکھ لیا کہ چور مال اپنی جیب میں ڈال رہا ہے یا ہاتھ میں لیے ہوئے ہے تو پھر وہ چور کو پکڑ نہیں سکتا ہے اگر کہے گا تو چور عدالت میں نالش کر دے گا اور صاحب مال کو سزائے قید ہو جائے گی اور جرمانہ ادا کرنے پر رہائی ملے گی۔[۴۴]

منشی اعتصام الدین کے مطابق انگلستان میں اکثر چور اچکے دولت مند گھرانوں کے وہ چشم و چراغ ہوتے تھے جو اپنی دولت کو عیش و عشرت میں اڑا کر مفلس ہو جاتے تھے اور کوئی ہنر یا پیشہ اختیار کرنے کو ذلت سمجھتے تھے۔[۴۵]

اس طرح منشی اعتصام الدین نے جہاں نہایت عمدگی سے برطانوی عدالتی نظام کی خصوصیات کو اجاگر کیا وہیں انہوں نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی اشرافیہ میں اخلاقی اقدار کی پامالی اور جرائم کی طرف رغبت کے رجحان پر سے بھی پردہ اٹھایا۔

د۔ فوج

کسی خطے کی نوآبادیاتی صورت حال میں 'طاقت' نوآبادکار کا استعارہ ہوتی ہے جو اس مقبوضہ خطے پر نوآبادیات قائم کرنے میں نوآبادکار کی معاون ہوتی ہے۔ اس طاقت کا مظاہرہ ظاہر ہے کے نوآبادکار اپنی فوج اور فوجی ساز و سامان

کے ذریعے کرتا ہے۔ جیسا کے فینن نے کہا تھا کے نوآبادکار نوآبادیاتی باشندوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے ہتھیاروں کا استعمال کرتا ہے اور پولیس چوکیاں اور فوجی چھاؤنیاں قائم کرتا ہے۔[۷۶] ہم دیکھتے ہیں کے ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی کوٹھیاں اور تعمیر کردہ قلعے دراصل ان برطانوی فوجی اڈوں اور فوجی چھاؤنیوں کا کردار ہی نبھارہے تھے جو فوج اور فوجی ساز و سامان سے لیس تھے۔ اسی لیے اس فوج، فوجی ساز و سامان اور جنگی حکمت عملیوں کی بدولت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی جنگ پلاسی (۱۷۵۷) اور جنگ بکسر میں مغلیہ سلطنت کے نوابوں اور شاہ عالم کی افواج پر اپنی فوجی و جنگی برتری ثابت کر چکی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے ہمارے تینوں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگار چونکہ جنگ پلاسی اور جنگ بکسر میں برطانوی فوجی حکمت عملیوں اور توپوں کی گھن گرج کے کمالات کے نتائج دیکھ چکے تھے لہذا تینوں نہ صرف برطانوی فوجی و جنگی برتری کے معترف تھے بلکہ برطانوی فوجی محکمے کی شان و شوکت نظم و نسق اور خاص کر بحری جنگی جہازوں کے حوالے سے وہ برطانوی مقتدرہ کے کلامیوں اور دعوؤں سے بھی مرعوب و متاثر دکھائی دیئے جو انہوں نے اپنی بحری طاقت اور جنگی ساز و سامان کے حوالے سے اپنے حریفوں اور نوآبادیاتی باشندوں میں مشہور کر رکھے تھے۔ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں انگریزوں کی بحری طاقت اور بحری جہازوں کی تعریف میں ہمیں منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں۔ منشی اعتصام الدین کو برطانوی نوآبادکاروں کی زبانی ان کی بحری طاقت اور جنگی ساز و سامان کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اپنے قارئین یعنی دیگر ہندوستانی (نوآبادیاتی) باشندوں کو ان سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اس وقت جب میں ولایت میں تھا ایک سو پچاس چھوٹے بڑے جنگی جہاز تیار تھے۔ دو جہاز بہت بڑے تھے۔ ایک بادشاہ کے نام سے موسوم تھا اس پر ایک سو ساٹھ توپیں نصب تھیں۔ دوسرا بادشاہ کی بیگم کے نام سے موسوم تھا جس میں ایک سو پچاس توپیں لگی تھیں۔ جنگی جہازوں کی مضبوطی اور بڑائی کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ان جیسے جہاز کسی اور ملک کو نصیب نہیں ہیں۔ انگریزوں کو بحری لڑائی میں بڑی شہرت حاصل ہے۔ سنا ہے کہ پانچ سو جنگی جہاز تیار ہیں۔ ان جہازوں کی کثرت کے باعث اور ان کے ساز و سامان جنگ کی وجہ سے ولایت کے کسی ملک میں یہ ہمت نہیں ہے کہ انگلینڈ کے آس پاس بھی آسکیں۔[۷۷]

میر محمد حسین کے ہاں انگریزوں کی بحری برتری کے حوالے سے جو انکشافات کیے گئے ان کے مطابق:

> انگریز اعتقاد اور عمل دونوں کے لحاظ سے سائنس سے زیادہ قریب ہیں اور سمندر پر اقتدار اور تسلط بھی سب سے زیادہ انہی کا ہے کیونکہ ان کے پاس جہاز بھی زیادہ ہیں اور جہاز سازی کی صنعت بھی مستحکم

ہے، وہ جہاز رانی اور بحری جنگ میں بھی ماہر ہیں۔ان کا سب سے بڑا جہاز ایک سو بیس توپوں پر مشتمل ہے ورنہ کم سے کم بیس توپیں تو ہر جہاز پر نصب ہوتی ہیں۔[۴۸]

انگریزوں کی بحری طاقت کے حوالے سے ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کی آراء سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے وہ ان کی بحری طاقت اور بحری جنگی جہازوں کی بڑائی سے کس قدر مرعوب و متاثر تھے اور انہوں نے اپنی ان معلومات کے حوالے سے یہ دعویٰ بھی پیش کیا کے انگریز بحری جنگ میں دوسری تمام یورپی اقوام سے ماہر تھے۔ مگر برطانوی بحری جہازوں کے حوالے سے ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات کے حوالے سے جو دلچسپ نقطہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کے منشی اعتصام الدین کے جنہوں نے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء کے درمیان انگلستان کا سفر کیا تھا انہوں نے برطانویوں کے سب سے بڑے جنگی بحری جہاز پر ایک سو ساٹھ توپوں کے نصب ہونے ہونے کا دعویٰ کیا۔ جب کے میر محمد حسین جنہوں نے اعتصام سے تقریباً چھ سال بعد سفر یورپ اختیار کیا تھا انہوں نے سب سے بڑے برطانوی جنگی بحری جہاز پر ایک سو بیس توپوں کے نصب ہونے کا دعویٰ کیا۔ ظاہر ہے کے ہمارے ان دونوں سفر نامہ نگاروں کو یہ معلومات خود برطانوی نوآبادکاروں کی زبانی ہی معلوم ہوئی ہوں گی مگر سب سے بڑے برطانوی بحری جنگی جہاز پر نصب توپوں کی تعداد میں ہمارے ان سفر نامہ نگاروں کی آراء میں پایا جانے والا اختلاف دراصل اس اہم نقطہ کی جانب بھی ہماری توجہ مبذول کراتا ہے کے یورپی نوآبادکاروں کے اپنی طاقت کے متعلق پیش کردہ دعوے اور کلامیے ضروری نہیں تھا کے حقیقت کے بھی عین مطابق تھے مگر درحقیقت ان کے دعوے اور کلامیے نوآبادیاتی باشندوں اور خود ان کے حریفوں پر ان کی طاقت کی دھاک بٹھانے کا باعث ضرور بنتے رہے۔اس کی مثال یوں بھی پیش کی جاسکتی ہے کے یورپی نوآبادیاتی طاقتوں نے ۱۸۰۰ء میں زمین کے ۵۵ فیصد حصّے پر قبضے کا دعویٰ کیا جو درحقیقت ۳۰ فیصد تھا۔[۴۹]

ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام نے برطانویوں کی محض بحری قوت کی بڑائی بیان کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ برطانوی فوجی محکمے کے نظم و نسق اور فوجی و جنگی قوانین سے بھی اس قدر متاثر ہوئے کے انہوں نے شگرف نامہ میں ان کے متعلق تفصیلی معلومات و تجزیہ پیش کیا۔

اس حوالے سے سب سے پہلے انہوں نے برطانوی فوجی عہدوں اور مناصب کے حوالے سے معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا کہ سارجنٹ، لفٹیننٹ، کپتان میجر، کرنل،، لارڈ اور ڈیوک فوجی عہدہ داران کے خاص نام تھے اور ہر عہدے کے تین درجے اول، اوسط اور ادنیٰ تھے اس طرح افسران اوسط سے ترقی کر کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتے تھے۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی کی حامل ہے کہ اعلیٰ عہدوں پر تعیناتی اور تنخواہوں کے معاملے میں منشی اعتصام الدین کو برطانوی مہذب معاشرے میں واضح تفرق دیکھنے کو ملی جسے انہوں نے 'شرفاء' او'ر رذیل' جیسی اصطلاحات سے وضع کیا۔ان کی معلومات کے مطابق انگلستان میں رذیل قوم کے لوگوں کو کوئی بڑا عہدہ یا اہم ذمہ داری نہیں سونپی جاتی تھی اور نہ ہی انہیں اہم معاملات میں شامل کیا جاتا تھا۔رذیل قوم کے لوگ چاہے کتنی بھی اطاعت گزاری کرتے اور اچھی خدمات سرانجام دیتے ان کو سرجن اور میجر کے لقب اور ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ کے علاوہ اور کچھ نہیں دیا جاتا تھا۔اعتصام کو اگرچہ یہ بات عجیب محسوس ہوئی مگر وہ اس پر زیادہ تنقید کرتے دکھائی نہیں دیتے بلکہ انہوں نے انگریزی معاشرے کی اس طبقاتی تقسیم اور نامساوی رویے کے حوالے سے یہ توجیح پیش کی کے قدیم زمانے میں جب انگلستان کی حکومت رذیل لوگوں کے ہاتھ آئی تھی تو انہوں نے حکومت کے انتظامات اور کاموں میں فتور پیدا کر دیا تھا۔یہی وجہ تھی کہ برطانوی معاشرے میں رذیل قوم کے لوگوں کو نہ تو شرفاء کے برابر مقام و عہدہ دیا جاتا تھا اور نہ ہی برابر کی تنخواہ دی جاتی تھی۔[۵۰]

فوجی نظم و نسق اور جنگی تیاریوں کے حوالے سے اعتصام الدین نے مشاہدہ کیا کہ انگلستان میں جگہ جگہ فوجی چھاؤنیاں قائم تھیں جہاں سوار اور پیادہ فوج جنگی ساز و سامان کے ساتھ ہر وقت تیار رہتی تھی اور وہاں توپ، بندوق اور دیگر اسلحہ چلانے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔[۵۱]

شگرف نامہ میں اعتصام نے برطانوی فوجی محکمے کے کچھ ایسے اصول و قوانین کا ذکر کیا جو ان کے تجزیہ کے مطابق دنیا کے کسی فوجی نظام میں رائج نہیں تھے۔اسی لیے ان کی رائے میں برطانوی قوم اپنے ان منفرد فوجی اصول و قوانین کی بدولت فنون جنگ میں ماہر اور ہمت اور شجاعت میں مشہور تھی۔اعتصام نے شگرف نامہ میں جن سنہری اور منفرد برطانوی اصول و قوانین کا تذکرہ کیا انہیں ذیل میں نکات کی صورت بیان کیا جا رہا ہے:

۱۔ برطانوی فوجی افسران کو انگلینڈ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس لیے کے اگر اچانک جنگ شروع ہو جائے تو وہ فوراً اپنے مناصب سنبھال سکیں۔

۲۔ کوئی فوجی اپنے فوجی افسر کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا لیکن اگر کوئی فوجی ایسا کرنے کی جرات کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔جیسے کے اعتصام کی معلومات کے مطابق اپنے افسر کی حکم عدولی کرنے والے فوجی کو یا تو سزائے موت دی جاتی تھی یا پھر اسے کوئی اور سخت سزا دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا تھا اور اسے کہیں اور بھی ملازمت نہ دی جاتی تھی۔اس اصول کے حوالے سے اعتصام کے لیے جو بات سب سے پسندیدہ تھی کے وہ یہ تھی اس میں تجویز

کردہ سزا کا اطلاق عام فوجیوں اور فوجی افسران پر بلا تفریق کیا جاتا تھا اور اس حوالے سے کسی فوجی افسر کی سفارش بھی قبول نہیں کی جاتی تھی۔ اس سخت قانون کی بدولت اعتصام کی رائے میں **انگلستان میں فتنے** فساد کم ہوتے تھے۔

۳۔ کوئی فوجی میدان جنگ میں لڑنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا اگر کوئی ایسا کرتا تو اس کی خطا معاف نہ کی جاتی تھی۔ کیونکہ فوجی سردار کو حکم تھا کے اگر دشمن کی فوج دگنی ہو تو تب بھی جنگ کرے البتہ اگر تعداد چوگنی ہو تو سردار کو حکم تھا کے وہ حکمت عملی سے لڑتا ہوا پیچھے ہٹے اور فوج کو ضائع نہ کرے۔

منشی اعتصام الدین نے اپنے سفر نامے میں جہاں برطانوی نو آباد کاروں کی بحری و جنگی قوت اور فوجی قوانین کو بہترین قرار دیا وہیں مال غنیمت کی تقسیم کے حوالے سے بنائے گئے برطانوی قوانین بھی انہیں دوسری یورپی اقوام کے قوانین سے بہتر معلوم ہوئے اور اس حوالے سے انہوں نے اپنی جو آراء پیش کیں ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کے برطانوی مال غنیمت کا قانون دراصل اعتصام کو برطانوی فوجیوں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی ایک بہترین برطانوی حکمت عملی محسوس ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مال غنیمت کی تقسیم کے برطانوی قانون کا فرانس اور پرتگال کے مال غنیمت کے قانون سے تقابل کر کے دراصل برطانوی قانون کی افادیت کو اجاگر کیا۔ مثلاً فرانس اور پرتگال میں مال غنیمت کی تقسیم کا جو قانون تھا اس میں اعتصام کی معلومات کے مطابق چوتھائی حصہ فوج میں تقسیم کیا جاتا تھا جب کے باقی تین حصے سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتے تھے لیکن انگریزوں کا قانون اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ مال غنیمت کو سپاہیوں اور افسروں کا حق قرار دے کر ان میں درجہ بدرجہ تقسیم کر دیتے تھے۔ اعتصام کی رائے میں انگریزوں نے مال غنیمت کی تقسیم کا یہ اصول اس لیے بنا رکھا تھا کے سپاہیوں کی ہمت بڑھے اور وہ دولت کے لالچ میں زیادہ تندہی سے لڑیں۔ [۵۴]

غرض کے اعتصام نے برطانوی فوجی محکمے کے متعلق ہر وہ چیز بیان کرنے میں دلچسپی لی جیسے کے برطانوی فوجی نظم و نسق، جنگی ساز و سامان کی شان و شوکت اور برطانوی فوجی و جنگی قوانین وغیرہ جس کی بدولت ان کی رائے میں برطانوی فوج دنیا کی بہترین فوج بن چکی تھی۔

ہ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے روابط

ملکہ الزبتھ کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کرنے کا عندیہ دے دیا گیا جب کے جیمز نے اپنے دور حکومت میں ایک فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کو مشرقی تجارت کا دائمی دعوی' دار بنا دیا۔ اس کے جاری کردہ فرمان کی رو سے کوئی انگریز تاجر ذاتی طور ہندوستان سے تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ جیمز کے دور حکومت میں ہی اس کا سفیر سر طامس رو جہانگیر سے کمپنی کے لیے مراعات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور شاہی فرمان کی

روسے انگریزوں کو 'سورت' میں فیکٹری اور اس کے ارد گرد فصیل بنانے کی اجازت مل گئی۔[۵۳] ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام الدین ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں ایک تجارتی کمپنی کی حیثیت سے شروع کیے جانے والے سفر اور برطانویوں کے ہندوستان آنے کے تجارتی اغراض و مقاصد کے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے تھے مگر یورپ کے سفر اور انگلستان قیام کے دوران اعتصام کے متجسس دماغ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی ڈھانچے اور برطانوی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان تجارتی اور سیاسی معاملات کے حوالے سے قائم روابط و ضوابط جاننے کا موقع بھی میسر آیا۔ چنانچہ شگرف نامہ میں اعتصام نے کمپنی کی نوعیت، اس کے انتظامی ڈھانچے نیز ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت کے درمیان روابط و ضوابط اور تعلقات پر اپنی معلومات و تجزیہ پیش کیا۔

سب سے پہلے اپنے ہندوستانی قارئین کے لیے لفظ 'کمپنی' کے لغوی و اصطلاحی معنوں کی وضاحت پیش کرتے ہوئے اعتصام نے لکھا کہ :

> انگریزی زبان کے لغت میں کمپنی کے معنی ہیں کسی کام کے لیے قوم کا جمع ہونا۔ اور اصطلاح میں مہاجنوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو اپنا مال و زر یکجا کر کے شرکت میں تجارت کرتے ہیں۔[۵۴]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظامی ڈھانچے کو زیر بحث لاتے ہوئے اعتصام نے اس کے متعلق جو معلومات فراہم کیں ان کے مطابق کمپنی انگریز تاجروں کی ذاتی ملکیت تھی اور اس کے اصل حصہ داروں کی تعداد کی تقریباً دو ہزار تھی مگر کمپنی کا انتظام ان حصہ داروں کے ملازم جن کی تعداد تقریباً چوبیس (۲۴) تھی، چلا رہے تھے اور کمپنی کے تمام نفع و نقصان کے ذمہ دار تھے۔ ان کی تنخواہیں بہت زیادہ تھیں اور ہر دو تین سال بعد ان کا تبادلہ کر دیا جاتا تھا۔ کمپنی جن لوگوں کو ملازم رکھ کر ہندوستان بھیجنا چاہتی تھی۔ ان کی فہرست تیار کر کے بادشاہ کو بھجوا دی جاتی تھی۔ اس فہرست پر شاہی اراکین اپنے دستخط کر کے بادشاہ سے منظور کروا لیتے اور بعد ازاں بادشاہ کے ملازمین جہازوں پر جا کر فہرست کے مطابق کمپنی کے ملازمین کو شمار کر لیتے اور اگر کوئی زائد آدمی ہوتا تو اس کو گرفتار کر لیتے کیونکہ کمپنی کو اس حوالے سے سخت تاکید تھی کہ وہ اپنی طرف سے کوئی زائد شخص نہ بھیجے تاکہ کوئی ایسا شخص جو مجرم ہو اور جس کا مقدمہ عدالت میں ہو وہ بھاگ نہ سکے۔[۵۵]

کمپنی کی ہندوستانی مصنوعات کی انگلستان میں درآمد کے حوالے سے اعتصام نے اگرچہ Calico Act کی اصطلاح کا براہ راست استعمال نہیں کیا مگر اس قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تفصیلات بیان کیں کہ برطانوی قانون کے مطابق کمپنی کے سوا کوئی شخص بھی ہندوستانی مصنوعات جیسے کہ ریشم، ریشمی کپڑا اور افیون وغیرہ بیچنے یا استعمال کے لیے نہ لے جا سکتا تھا اگر کسی شخص کے سامان سے یہ ہندوستانی مصنوعات برآمد ہو جاتیں تو اسے گرفتار کر

لیا جاتا۔ اعتصام کے مطابق ان کو بھی اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ ان کے سامان میں بھی ریشمی رومال موجود تھے مگر چونکہ اعتصام غیر ملکی تھے اور انگلستان کے قوانین سے واقف نہیں تھے نیز وہ تجارت کی غرض سے رومال ساتھ لے کر نہیں گئے تھے اس لیے ان پر کیے گئے مقدمے کو بے بنیاد قرار دے کر ان کا سامان چھوڑ دیا گیا۔[۵۶]

دراصل ہندوستانی مصنوعات اور خاص کر بنگال کی کاٹن کی یورپی منڈیوں میں بڑھتی ہوئی مانگ اور اس سے انگریزی صنعت کاروں کو ہونے والے نقصان کے خطرے کے پیش نظر برطانوی پارلیمنٹ نے Calio Act (۱۷۰۰ء۔۱۷۲۱ء) کے ذریعے انڈین مصنوعات اور انڈین کاٹن جو انگلستان میں کالیکو Calico کے نام سے مشہور تھی کی خاص طور پر بنگال سے درآمدات پر پابندی لگا دی تھی۔ اس لیے شاہی کسٹم افسران مسافروں سے انڈیا سے لائے گئے کپڑے اور شالیں وغیرہ ضبط کر لیتے تھے۔ جیسا کہ منشی اعتصام الدین نے بھی اس حوالے سے ذکر کیا۔[۵۷]

یوں محسوس ہوتا ہے کہ کمپنی اور انگلستان کی حکومت کے درمیان قائم انتظامی و قانونی روابط جاننے میں اعتصام نے خاص دلچسپی لی تھی شاید اس لیے کہ اعتصام یہ جاننا چاہتے تھے کہ کمپنی جو بنگال کے دیوانی حقوق اپنے نام کروا چکی تھی کیا وہ بادشاہ ہندوستان کو محض اپنی ایماء پر انگریزی فوج کی مدد دینے کی مجاز نہ تھی؟ اعتصام الدین کے تجزیہ کے مطابق کمپنی جو انگریز تاجروں کی ذاتی ملکیت تھی اس کے اور بادشاہ کے درمیان باقاعدہ انتظامی و قانونی اصول و ضوابط طے تھے اور ان کے مطابق کمپنی بادشاہ کو مالگزاری اور ٹیکس ادا کرنے کی پابند تھی جبکہ اس کے بدلے بادشاہ اراکین پارلیمنٹ کی منظوری کے تحت کمپنی کو فوجی امداد دیتا تھا اور اگر کمپنی کو کبھی دشمن سے مقابلہ درپیش ہوتا تو اس کے لیے باقاعدہ شاہی فوج کی مدد کمپنی کو دی جاتی۔ مگر حکومت کی طرف سے کمپنی کو اس بات کا بھی پابند کیا گیا تھا کہ وہ کمپنی کے لیے کام کرنے والے انگلستان کے ایسے سپاہیوں کی خوراک، لباس، اور علاج معالجے کا بندوبست کرے گی جو اچانک بیمار یا زخمی ہو جاتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں کمپنی کے تجارتی جہازوں کو حبشی اور رومی ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے اور ان کی حفاظت کے پیش نظر بادشاہ کی طرف سے سات آٹھ جنگی جہاز ہر وقت سمندر میں گشت کرتے رہتے تھے۔

اعتصام کے بادشاہ اور کمپنی کے درمیان استوار تعلقات کے متعلق پیش کردہ تجزیہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ باشاہ اور کمپنی کے تعلقات کی نوعیت زیادہ تر لین اور دین کے اصول پر قائم تھی اور کمپنی کے ہندوستان میں ملک گیری کی سرگرمیوں کا اس وقت تک باشاہ سے کوئی براہ راست تعلق نہ تھا۔ مگر اعتصام کے تجزیہ کے مطابق جب کمپنی نے ہندوستان میں اپنا سیاسی اثر رسوخ بھی بڑھانا شروع کر دیا خاص طور پر جب بنگال کی

دیوانی کے حقوق حاصل کر لیے تو کمپنی کی سیاسی حیثیت کے متعلق پارلیمنٹ میں سوال اٹھائے گئے اوراعتصام کے انگلستان قیام کے دوران ہی اس حوالے سے کمپنی اور پارلیمنٹ کے درمیان تنازع کھڑا ہو گیا تھا۔اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق بادشاہی امراء کا بنگال کی فتح کو لے کر یہ مؤقف تھا کے کمپنی کا پیشہ محض تجارت تھااس لیے سیاسی معاملات میں اس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے اور بنگال چونکہ شاہی افواج کی کوششوں سے حاصل ہوا تھالہذا بنگال کی حکومت پر باشاہ کا حق تھا۔ لیکن کمپنی نے شاہی اراکین کے اس اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے بنگال پر اپنے سیاسی قبضے کا یہ جواز پیش کیا کے بنگال کو فتح کرنے کے لیے نواب سراج الدولہ اور قاسم علی خان کے ساتھ ہونے والی جنگ میں کمپنی کو کثیر سرمایہ صرف کرنا پڑا علاوہ ازیں اس جنگ میں کمپنی کی بہت سی کوٹھیاں بھی تباہ ہو گئیں جس سے اسے کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح کمپنی نے اپنے ان دلائل کے ذریعے بنگال کی فتح کو بھی دراصل نفع و نقصان کی تجارت کا حصّہ قرار دیتے ہوئے اُسے اپنا حق جانا۔اعتصام کی معلومات کے مطابق کمپنی اور شاہی اراکین کے درمیان اس حوالے سے تین سال تک جھگڑا چلتا رہااور کلائیو جو کمپنی کا طرف دار تھااس نے اسی جھگڑے کے پیش نظر شاہ عالم کا خط بادشاہ انگلینڈ تک نہ پہنچنے دیا تھا کیونکہ وہ خط شاہی اراکین کی موافقت میں تھا۔ بہر حال اعتصام کے مطابق شاہی امراء اور کمپنی کے درمیان تنازع آخر کار بادشاہ انگلینڈ کے اس فیصلے پر ختم ہوا:

> بادشاہ نے اپنی عالی ہمت اور بلند فطرت کے پیش نظر فرمایا کے شاہ عالم بادشاہ نے بنگال کا ملک بطریق التمغا جو خیرات کی ایک قسم ہے انگریزی کمپنی کو دیا ہے اور ایک پیش کش بھی کی ہے۔ چونکہ میں انگلستان کا بادشاہ ہوں اس لیے اگر اس ملک کو اپنے ملازمین کے تصرف میں لے آؤں گا تو میں خیرات خوار بادشاہ کہلاؤں گا جو میرے لیے باعث بدنامی ہوگا۔البتہ جب کبھی سارا ہندوستان انگریزی اقتدار میں آجائے گا،اس وقت کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔[۵۸]

غرض کے منشی اعتصام الدین کو برطانوی حکومتی اداروں کے انتظام، نظم و نسق اور اتحاد و اتفاق نے بہت متاثر کیا۔ برطانوی نظام سیاست کے حوالے سے ان کے پیش کردہ تجزیہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ان کے نزدیک برطانوی سیاسی اداروں اور امراء اور سیاسی اراکین کا باہمی اتحاد و اتفاق ہی دراصل ان کی کامیابی اور ترقی کا اہم سبب تھا۔ جب کے مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں اور امراء و اراکین سلطنت کی نااتفاقی کو ان کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنایا جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کے وہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے اندرونی اسباب پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔

منشی اسماعیل اگرچہ منشی اعتصام الدین کی طرح برطانوی حکومت یا اس کے سیاسی اداروں کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرتے تو دکھائی نہیں دیتے مگر سفر نامے میں ان کے برطانوی نظام حکومت پر کیے گئے تبصرے سے

معلوم ہوتا ہے کہ وہ برطانوی نظام حکومت کی پارلیمانی وجمہوری طرز سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس سے متاثر بھی تھے۔انہیں بادشاہ کے محدود اختیارات،انتظامی معاملات میں بادشاہ کی اراکین حکومت سے مشاورت اور ان کی ایماء پر فیصلوں کے اجراء نیز عدلیہ اور قانون کی بالادستی کا نظام بہت پسند آیا جس پر منشی اسماعیل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> یہ ایک سلسلہ ہے کہ بادشاہ وزیر سے، زمیندار عایا سے اور رعایا عدالت سے ڈرتی ہے۔اس تعلق کی وجہ سے سب ایک حساب کتاب میں رہتے ہیں اور کوئی کسی کو نقصان یا تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔[۵۹]

۵۔یورپی سائنسی ترقی،ایجادات اور جدید نظریات

اٹھارہویں صدی کو جیسا کے پہلے بھی ذکر کیا گیا یورپی تاریخ میں The age of Enlightenment کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس صدی میں جدید ادبی، معاشی اور سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ سائنس (میکانیات، کیلکولس، طب، ہیئت، علم فلکیات، اور ریاضیات وغیرہ) کے میدان میں جدید یورپی نظریات نے تہلکہ مچا دیا۔اس دور میں سائنس مخصوص طبقے کی سوچ اور فکر سے نکل کر عام لوگوں کی گفتگو کا حصہ بننے لگی۔سترھویں صدی کے آخر میں یورپ میں سائنسی علم کی ترویج و ترقی میں 'پیرس اکیڈی' اور 'رائل سوسائٹی آف لندن' نے اہم کردار ادا کیا۔انہی اداروں کی تقلید میں بعد ازاں یورپ میں اٹھارہویں صدی میں بے شمار ایسے ادارے قائم ہوئے جنہوں نے جدید سائنسی نظریات کی تشکیل واشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ان میں برلن اکیڈی (Berlin Academy) دی سینٹ پیٹرز برگ اکیڈی (The Saint Petersburg Academy) اور دی ٹیورن سوسائٹی (The Turin Society) وغیرہ ایسے ہی چند اداروں کی مثالیں ہیں۔[۶۰]

اٹھارہویں صدی میں یورپ میں بحیثیت مجموعی اور انگلستان میں بالخصوص جدید سائنسی نظریات کی تشکیل کے ساتھ ساتھ بہت سی سائنسی ایجادات بھی ہوئیں مثلاً ۱۷۶۸ء میں ہارگریوز نے کاٹنے کی مشین ایجاد کی،۱۷۶۵ء میں واٹ نے بھاپ انجن بنایا، ۱۷۵۵ء میں آرک رائٹ نے سوتی کپڑے کی دیگر مشینیں ایجاد کیں۔ ۱۷۸۵ء میں کارٹ رائٹ نے بھاپ سے کرگھے چلانا شروع کیے اور ۱۷۸۸ء میں چند ایک انجن اور بھٹیاں بھاپ سے چلنے لگیں۔انگلستان میں یہ تمام ایجادات اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں وقوع پزید ہوئیں۔ان ایجادات نے انگلستان کی صنعتی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ مگر یہاں یہ بات بھی سوچنے اور غور وفکر کرنے کی ہے کہ انگلستان جو

۱۷۶۰ء سے پہلے زیادہ تر ایک زرعی ملک ہی تھا اور طویل عرصہ سے معاشی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ وہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ایک مخصوص زمانے میں ہی یکایک اتنی ایجادات کرنے میں کیونکر کامیاب ہو سکا۔

'یام دت' کے مطابق اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پلاسی کی جنگ میں فتح کے بعد جو دولت کی لوٹ کھسوٹ مچائی اس کی بنیادوں پر جدید انگلستان کی تعمیر ہوئی۔ دراصل دولت کی اس فراوانی نے انگلستان میں ایجادات کے لیے فضا سازگار بنا دی تھی۔ اس طرح پلاسی کی جنگ کے فوراً بعد انگلستان میں کئی بڑی بڑی ایجادات ہوئیں جن سے صنعتی انقلاب کی ابتداء ہوئی۔ برطانوی صنعتی تاریخ کے ماہر ڈاکٹر کننگھم کا اس حوالے سے یہ کہنا ہے کہ برطانیہ میں اس زمانے میں اتنے بڑے پیمانے پر ایجادات صرف اس لیے نہیں ہونے لگی تھیں کے جیسے لوگوں کی ذہانت اچانک پھوٹ پڑی تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک میں اتنا سرمایہ اکٹھا ہو گیا تھا کہ ان ایجادات کا مصرف نکلنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔[۶۱]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ نے اپنے زیر تسلط نو آبادیوں سے دولت کی لوٹ کھسوٹ اور قدیم مسلم و یونانی سائنسی نظریات پر اپنی جدید سائنس کی بنیاد رکھی اور ان علوم و فنون کو خالصتاً یورپی ذہانت و کاوش کا نتیجہ قرار دے کر نو آبادیوں میں اپنی علمی و عقلی برتری کی دھاک بٹھائی۔ اس طرح اٹھارہویں صدی میں یورپ کی باقی نو آبادیوں کی طرح ہندوستان میں بھی یورپی سائنسی ایجادات و جدید نظریات کو جاننے سے متعلق تحریک پیدا ہوئی۔ ہمارے سفر نامہ نگار میر محمد حسین کی مثال اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انہوں نے انگلستان کا سفر ہی جدید یورپی سائنسی علوم و نظریات سے فیض واکتساب حاصل کرنے کے لیے کیا اور ان کے مطابق انہوں نے اپنا سفر نامہ 'رسالہ احوال ملکِ فرنگ و ہندوستان' اپنے ایک معزز دوست مولوی عبدالقادر کی فرمائش پر اہل علم ہندوستانیوں کو یورپ کے جدید سائنسی نظریات سے آگاہ و متعارف کروانے کی غرض سے لکھا۔[۶۲] اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپی سائنسی ایجادات و ترقی اور مختلف سائنسی علوم کے حوالے سے پیش کردہ جدید نظریات نے ہندوستانی اشرافیہ کی توجہ نہ صرف اپنی جانب مبذول کرائی بلکہ وہ اس سے بے پناہ متاثر بھی ہوئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپی سائنسی حوالے بھی ہندوستانی ادبی روایت کا حصہ بننے لگے۔

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین اور منشی اعتصام الدین نے یورپی سائنسی ترقی کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر اعتصام کے حوالے سے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کے ان کے سفر نامے 'شگرف نامہ' میں انگلستان کی معاشرتی زندگی، نظام سیاست اور مذہب کے حوالے سے تو تفصیلی معلومات اور تجزیے پیش کیے گئے ہیں مگر انگلستان کی سائنسی ترقی کے حوالے سے ان کی دلچسپی کا موضوع اور معلومات کا دائرہ کار صرف چند ایک

سائنسی ایجادات اور ان کے استعمال تک محدود رہا۔ منشی اعتصام الدین کے برعکس میر محمد حسین کے ہاں یورپ کی علمی و سائنسی ترقی کے اسباب و محرکات کو اہمیت دیتے ہوئے ان کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں ہیں اور ایسی ایجادات و آلات کے استعمال کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کے استعمال کی بدولت یورپ علم ہیئت و فلکیات کے حوالے سے جدید نظریات جو قدما کے پیش کردہ نظریات سے قدرے مختلف تھے پیش کرنے کے قابل ہوا۔

منشی اعتصام الدین کے حوالے سے بات کریں تو انہوں نے اپنے سفر نامے میں ایسی ایجادات کو بیان کرنے میں دلچسپی لی جنہوں نے انسانی مشقت کو کم کر کے انسانی زندگی میں سہولت پیدا کر دی۔ ان ایجادات میں منشی اعتصام الدین نے پانی اور ہوا سے چلنے والی چکی جس سے آٹا پیسنے اور تیل نکالنے کے علاوہ آرہ کشی اور بارود سازی بھی کی جاسکتی تھی کا ذکر خاص طور پر کیا۔ منشی صاحب کے مطابق یہ چکی اس زمانے میں کلکتہ میں بھی دستیاب ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے پانی سے چلنے والی اس چکی کی ایجاد کو بھی سراہا جس کے ذریعے گیہوں پس کر آٹا بن جاتا نیز یہ تیل نکالنے اور ریشم کا دھاگا بنانے کے لیے بھی استعمال کی جاسکتی تھیں۔ یہ چکیاں کس سن میں ایجاد ہوئیں یا انہیں ایجاد کرنے والے کون تھے؟ غالباً اعتصام خود بھی ان کے متعلق مکمل معلومات سے نہ رکھتے تھے تھے اسی لیے انہوں نے اپنے سفر نامے میں اس قسم کی معلومات فراہم کرنے سے گریز کیا۔

ان چکیوں کے علاوہ انگلستان میں جس ایجاد نے اعتصام کو متاثر کیا وہ گھڑیاں تھیں اور ان کے مشاہدہ کے مطابق انگلستان میں لوگ دو طرح کی گھڑیاں استعمال کرتے تھے ایک کو انہوں نے چھوٹی گھڑی قرار دیا جیسے ان کے مطابق امیر لوگ اپنی جیبوں میں رکھتے تھے جبکہ غریبوں کو ایسی گھڑی میسر نہ تھی اور دوسری گھڑی جسے لوگ اپنے گھروں یا باورچی خانوں کی دیواروں پر لٹکاتے تھے۔ ان کے علاوہ منشی صاحب کو راستوں اور بازاروں میں لگی دھوپ گھڑیاں بھی بہت پسند آئیں جن کا ذکر انہوں نے خاص طور پر کیا۔

> ان گھڑیوں کے علاوہ راستوں اور بازاروں میں دھوپ گھڑیاں بنی ہوئی ہیں وہ اس طرح کہ پتھر کی بڑی سل یا لوہے کے چوڑے ٹکڑے پر گھڑی کی تصویر کندہ کی ہے، اس پر ہندسے بڑے ہوتے ہیں اور خانے بنے ہیں اور کنارے لکھا ہوا ہے " آفتاب کے عکس سے وقت معلوم کرنے کی گھڑی "۔ وقت معلوم کرنے کا یہ طریقہ اور گھڑی سازی جو انسان کے لیے بہت فائدہ مند ہے نہایت قابل تعریف کام ہے۔[۶۳]

اعتصام الدین کی رائے میں ہندوستان میں چونکہ ایسی دھوپ گھڑیاں میسر نہیں تھیں اس لیے امیر لوگ نوبت و نقارہ بجوا کر وقت سے باخبر ہوتے تھے۔[۶۴] علم و تعلیم کی ترسیل و ترقی میں چھاپہ خانے کی ایجاد منشی اعتصام

الدین اور میر محمد حسین دونوں کو یکساں طور پر مفید معلوم ہوئی۔ میر محمد حسین کے برعکس منشی اعتصام الدین نے علم فلکیات کے حوالے سے جدید یورپی نظریات کو بیان کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہاں البتہ اپنے لندن قیام کے دوران انہوں نے مدرسہ ہیئت میں بنائے گئے زمین و آسمان کے ماڈلوں کو بہت سراہا۔[۶۵]

یورپی سائنسی ترقی کے حوالے سے میر محمد حسین کی آراء و تصورات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ علم ہیئت اور فلکیات کے حوالے سے پیش کردہ یورپی جدید نظریات سے بے حد متاثر تھے مگر یہ بات بھی دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہے کہ ان کے ہاں علم ہیئت و فلکیات اور دیگر سائنسی علوم میں یورپی ترقی کو خالصتاً یورپی سعی و کاوش کا شاخسانہ قرار دینے کا رجحان نہیں ملتا اور نہ ہی انہوں نے سائنس کو خود یورپیوں کی طرح، یورپ کی میراث قرار دیا۔ بلکہ اس حوالے سے وہ چونکہ قدیم اسلامی حکومتوں اور مسلم فلاسفہ و حکماء کی خدمات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے یورپ میں سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت میں ان اسلامی فتوحات خاص کر فتح اسپین کو یورپی سائنسی ترقی میں اہم سنگ میل قرار دیا جس کی بدولت یورپ میں علم و ہنر کی شمع روشن ہوئی۔[۶۶]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اموی عہد حکومت میں شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر (۷۰۸ء۔ ۷۱۴ء) کے حکم سے ایک بربر جرنیل طارق بن زیاد نے اپنی سات ہزار فوج کے ذریعے جولائی ۷۱۱ء میں اسپین کے حکمران لاڈراک (لذریق) کی ایک لاکھ فوج کو وادی لکہ میں شکست دی تھی۔ طارق آبنائے کو عبور کر کے جس پہاڑی پر اترا تھا وہ آج بھی اس کے نام پر جبرالٹر (جبل الطارق) سے منسوب ہے۔ طارق کی اس اولین فتح کے بعد اسپین کے دوسرے شہر جیسے کے قرطبہ، طلسطلہ، اندلس، اشبیلیہ اور ماردہ بھی دیگر مسلم فاتحین کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے۔[۶۷] چنانچہ میر محمد حسین نے یورپ میں سائنسی و علمی سرگرمیوں کے آغاز و ابتداء کے حوالے سے اسپین میں مسلم حکومت کے اس آٹھ سو سالہ دور کو اہم قرار دیا کیونکہ ان کی رائے میں اس عرصہ کے دوران مسلمانوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے پیش نظر اندلس، غرناطہ اور نابلس علم و ادب اور فصاحت و بلاغت میں مشہور ہو گئے اور ان شہروں میں ہر علم و فن (طب، ہیئت، ریاضی، کیمیا، جغرافیہ اور صنعتی علوم وغیرہ) کے مشاہیر و ماہرین کی جماعتیں پیدا ہوئیں۔ محمد حسین نے ان مشاہیر میں ابن عربی [۶۸] جو بقیہ علوم کے ساتھ ساتھ علم ریاضیات کے ماہر تھے، کا نام مثال کے طور پر پیش کیا۔

یورپیوں کے علم کے خزانوں تک رسائی کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد حسین نے یہ رائے پیش کی کے اگرچہ کچھ اسباب کے پیش نظر شاہ اسپین کا ایک مرتبہ پھر اندلس پر قبضہ ہو گیا مگر وہاں مسلمانوں کی تعمیر کردہ

عمارتیں اور علوم وفنون کی کتب کے ذخیرے نہ صرف فرنگیوں کی علم دوستی اور آثار قدیمہ میں ان کی دلچسپی کے باعث نہ صرف محفوظ رکھی گئیں بلکہ انہوں نے ان کتب سے استفادہ کرنے کے لیے ان کے عربی سے تراجم کیے۔[۶۹]

ہمارے لیے یہ بات دلچسپی کی حامل ہے کہ ہمارے ابتدائی نوآبادیاتی دور کے دونوں سفر نامہ نگاروں محمد حسین اور منشی اعتصام الدین نے اہل فرنگ کو آثار قدیمہ چاہے وہ علوم وفنون کی کتب تھیں یا تاریخی عمارات وغیرہ ،ان میں متجسس پایا۔ میر محمد حسین نے اس حوالے سے اپنا یہ مشاہدہ پیش کیا کے یورپی اقوام کو آثارِ قدیمہ کی سیر کا چاہے وہ کہیں بھی موجود ہوں بہت شوق تھا اور وہ لوگ دنیاوالوں کے خیالات، مذاہب اور عادات وخصائل کے متعلق جاننے میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔[۷۰]

منشی اعتصام الدین نے بھی خاص طور پر برطانوی قوم کو علم وہنر کا قدر دان اور آثارِ قدیمہ کا دلدادہ قرار دیا۔[۷۱]

محمد حسین نے یورپی عہدِ دریافت (اگرچہ انہوں نے عہد دریافت کی اصطلاح براہ راست استعمال نہیں کی) میں یورپی اقوام کو حاصل ہونے والی کامیابیوں کا سرچشمہ دراصل اہلِ اندلس کے علوم وفنون خاص کر علم ہیئت اور ریاضیات سے یورپی فیض واکتساب کو قرار دیا کیونکہ ان کے تجزیہ کے مطابق سمندروں کے ساحلوں سے قریب ہونے اور ملاح وتجارت پیشہ ہونے کے ناطے سمندری سفروں میں آسانی وسہولت پیدا کرنے کی خاطر یورپی اقوام نے اہلِ اندلس کے علمی سرمائے میں سے خاص طور پر علم ہیئت اور ریاضیات کو نہ صرف ذوق وشوق سے حاصل کیا بلکہ ان علوم کی جو کتب انہیں دستیاب ہوئیں اُن کے عربی سے تراجم بھی کیے چنانچہ ان تراجم سے استفادہ کر کے وہ زمین، اس کی ماہیت اور علم فلکیات کے حوالے سے نئے نئے نظریات پیش کرنے کے قابل ہوگئے۔ اس طرح انہوں نے ان علوم سے استفادہ کرتے ہوئے دنیا کے ان جانے خطوں (امریکہ) کو دریافت کر لیا اور وہاں جیسا کہ ہم جانتے ہیں اپنی نوآبادیاں بھی قائم کر لیں۔

محمد حسین نے عہد یورپی نشاط ثانیہ میں اٹھنے والی احیاء العلوم اور اصلاح کی تحریکوں کو بھی یورپی معاشرے میں فکری وسائنسی ترقی کا ایک اور اہم محرک قرار دیا۔[۷۲] یورپ کی ترقی کے اسباب ومحرکات کا جو تجزیہ محمد حسین نے پیش کیا اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کے محمد حسین کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کے علم وفن کے میدان میں یورپ نے اٹھارہویں صدی تک جو ترقی حاصل کی تھی اس کا سفر دراصل یورپ نے گزشتہ تین سو سال یعنی عہد نشاط ثانیہ و عہد دریافت میں ہی شروع کیا تھا اور یورپ کی حالیہ ترقی ہمیشہ سے اس کا نصیب نہ تھی کیونکہ نشاط ثانیہ سے پہلے یورپی معاشرے میں پوپ اور چرچ کی بالادستی تھی اور مذہبی اور سائنسی تعلیمات تک عام یورپی باشندوں کی براہ راست

رسائی نہ تھی۔ محمد حسین کے اس تجزیہ کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کے ہمارے ابتدائی نوآبادیاتی دور کے یہ سفر نامہ نگار سائنسی علوم کو کم از کم یورپی علوم سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے۔

بہر حال یورپ قیام کے دوران محمد حسین سائنسی علوم میں یورپی ترقی اور خاص طور پر علمِ ہیئت و فلکیات کے حوالے سے پیش کردہ جدید یورپی نظریات سے بے حد متاثر ہوئے۔ میر محمد حسین نے ان علوم و فنون میں یورپی ترقی کو دراصل ان کے استعمال کردہ سائنسی طریقہ کار (تجربہ و استقرا) نیز ایسے آلات کی ایجاد جیسے کے دوربین وغیرہ کا مرہونِ منت قرار دیا جس کی بدولت یورپی علمِ فلکیات کے حوالے سے نئے نئے نظریات پیش کرنے کے قابل ہوئے۔ ان آلات میں سے محمد حسین کے نزدیک دوربین بہت اہم آلہ تھا جسے فارسی میں دوربین کہا جاتا تھا۔ محمد حسین کے تجزیہ اور معلومات کے مطابق دوربین کی دو اقسام تھیں۔ ایک قسم جس سے زمین کی دور کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جب کے دوسری قسم ستاروں اور سیاروں وغیرہ کے مشاہدہ کے لیے استعمال کی جاتی تھی چنانچہ یورپیوں نے اس دوسری قسم کی دوربین کی مدد سے علمِ ہیئت و فلکیات کے حوالے سے ایسی چیزوں کا مشاہدہ کیا اور ان کے متعلق ایسی معلومات فراہم کیں جن کے متعلق قدما ان کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے معلومات نہ رکھتے تھے۔[۳۳]

میر محمد حسین اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ جدید یورپی سائنسی ایجادات اور اسی طرح علمِ فلکیات کے جدید نظریات یورپی سائنسدانوں کی لگن اور محنت و ریاضت کا نتیجہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سفر نامے میں خاص طور پر جن دو سائنس دانوں کا ذکر کیا اُن میں انگلش سائنس دان سر آئزک نیوٹن اور پولینڈ کے سائنس دان کوپر نیکس شامل ہیں۔ محمد حسین نے ان دونوں سائنس دانوں کے لیے اپنے سفر نامے میں فلسفی کی اصطلاح استعمال کی جو شاید اس زمانے میں سائنس دانوں کے لیے رائج ہوگی۔ نیوٹن کے حوالے سے میر محمد حسین نے اپنے سفر نامے میں جو آراء پیش کیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیوٹن سے متعلق انگریزی بیانیوں سے متاثر تھے جن میں نیوٹن کو تمام قدیم سائنس دانوں سے اپنے علم و عقل کی بنا پر بلند رتبہ قرار دیا گیا چنانچہ نیوٹن کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> انگریزوں میں ایک بلند مرتبہ اور عجیب و غریب فلسفی پیدا ہوا۔ اس کا نام سر آئزک نیوٹن ہے۔ اس کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ جیسے فطرت نے اپنے خزانوں کی کنجیاں اس کے سپرد کر دی ہوں اور وہ فطرت کے راز کھول رہا ہو اور ان کے اسباب بیان کر رہا ہو۔ وہ نئے قوانین وضع کرتا تھا اور جدید نظریات پر دلائل دیتا تھا۔ انگریزوں کے نزدیک قدیم فلاسفروں میں سے کوئی بھی نیوٹن کا ہم پلہ نہیں تھا بلکہ وہ تو فلسفہ قدیم کو ایسے مغالطے سے تعبیر کرتے ہیں کہ بجز بحث و جدال کے جس کا کوئی حاصل نہ ہو۔[۳۴]

چنانچہ انگریزی انسل نیوٹن کے متعلق اس قسم کے بیانیے مشہور کر دینے کے پیچھے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ انگریزی مقتدرہ کی وہ ذہنیت کام کر رہی تھی جس کی بناپر وہ نہ صرف سابقہ یونانی و مسلم علمی سرمائے کو بے وقعت کر دینا چاہتے تھے بلکہ اس طرح دیگر اقوام پر اپنی علمی و سائنسی فضیلت کو بھی ثابت کرنا چاہتے تھے۔

کوپرنیکس کے حوالے سے میر محمد حسین اس کے وضع کردہ نظامِ شمسی میں سورج کی مرکزیت نیز سیاروں کے اس کے تابع ہو کر گردش کرنے کے حوالے سے پیش کردہ نظریات سے بھی واقف تھے اور ان کے مطابق قدما میں فیثا غورث کی بھی یہی رائے تھی مگر چند شکوک و شبہات کی بنا پر لوگوں نے اس کی رائے کو مسترد کر دیا مگر کوپرنیکس کے پیش کردہ 'نظامِ شمسی' کے نظریات نے ان شکوک و شبہات کو دور کر دیا۔ اپنے سفر نامے میں میر محمد حسین کی اگرچہ تمام تر توجہ علمِ فلکیات کے جدید یورپی نظریات بیان کرنے کی طرف رہی مگر سوائے کوپرنیکس کے انہوں نے کسی مخصوص یورپی سائنسدان یا ماہر علمِ فلکیات سے کوئی نظریہ منسوب کر کے بیان نہیں کیا بلکہ انہوں نے علمِ فلکیات کے حوالے سے کواکب کی چار اقسام شموس، سیارات، اقمار اور ذوات الاذناب پر مجموعی طور پر جدید یورپی نظریات کو بیان کرنے کی طرف توجہ دی۔

محمد حسین نے نظامِ شمسی میں سورج کی مرکزیت اور اس کی نوعیت کے حوالے سے یورپی ماہرین فلکیات کے جدید نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا کے سورج ایسا سیارہ ہے جس کی روشنی اپنی ہے اور تمام سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں اور اس کی شعاعیں در حقیقت ناری اجسام ہیں جو سورج سے جدا ہو جاتے ہیں اور انہی کی بدولت اس دنیا میں آگ کا وجود ممکن ہوا ہے۔[۷۵]

محمد حسین کی رائے میں جدید یورپی نظریات کے مطابق سیارات، زمین کی طرح کروی اجسام ہیں جو سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور اسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ محمد حسین نے سیاروں کے سورج سے فاصلے نیز زمین کے سورج کے گرد گردش کرنے کی مدت کے حوالے سے بھی جدید یورپی نقطۂ نظر کو بیان کرنے میں دلچسپی لی۔[۷۶]

چاند کے متعلق جدید یورپی نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے جو معلومات فراہم کیں ان کے مطابق چاند ایک کثیف جسم ہے جو سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اور حقیقت میں ایک سیارہ نہیں بلکہ ایک سیارے یعنی زمین کا تابع سیارہ ہے اور ذیلی سیارے کی حیثیت سے زمین کے ساتھ سورج کے گرد گردش کرتا ہے۔ چاند کی تخلیق نیز دوسرے سیاروں کے اپنے اپنے اور ایک سے زائد چاند ہونے کی توجیح بیان کرتے ہوئے محمد حسین لکھتے ہیں کہ:

قمر کا منشا تخلیق یہ (معلوم ہوتا) ہے کہ وہ جس سیارے کا تابع ہو اس کے کسی نصف حصّے سے شمس کے چھپ جانے کی صورت میں شمس سے حاصل کیے ہوئے نور کو اس سیارے (کے اس نصف حصّے) تک پہنچائے چنانچہ زمین و ساکنان زمین کے لیے ایک ہی قمر کافی رہا کیونکہ زمین شمس سے قریب ہے اور مشتری چونکہ دور ہے اور بڑا بھی اس لیے اس کو چار اقمار کی حاجت ہے اور زحل کو پانچ کی۔ [۷۷]

ان چار اجسام کے حوالے سے یورپی نظریات و توجیحات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ میر محمد حسین نے ثوابت اور ان کے درمیان پائے جانے والے فاصلے، ان فاصلوں کی بنا پر دوسری دنیاؤں کے حوالے سے پیش کردہ یورپی قیاس و نظریات نیز انگلستان کی رصد گاہوں میں ان ثوابت کی تعداد پر کی جانے والی تحقیق کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں بھی خاصی دلچسپی لی۔ [۷۸]

میر محمد حسین کا یہ سفر نامہ درحقیقت علم ہیئت و فلکیات کے حوالے سے قدما کے پیش کردہ نظریات و توجیحات پر جدید یورپی علمِ ہیئت و فلکیات کے نظریات کی فوقیت و مقبولیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سفر نامے میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپی علمِ فلکیات کے تقریباً تمام بنیادی نظریات و رجحانات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سفر نامے میں اس زمانے کے ایسے ہندوستانی افراد کے لیے جو علمِ فلکیات کے جدید یورپی رجحانات و نظریات کو جاننا چاہتے تھے۔ میر محمد حسین نے بہت کچھ سامان مہیا کیا۔

۲۔ مستشرقیت

مشرقی خطوں میں یورپی نوآبادیوں کے قیام نے دراصل یورپ میں مستشرقیت کے رجحان کو فروغ دیا اور یورپیوں میں مشرقی علم و ادب اور زبانوں کی تحصیل کا ذوق و شوق بیدار ہوا۔ ہمارے اٹھارہویں صدی کے سفر نامہ نگار اگرچہ مستشرقیت کی اصطلاح سے تو واقف نہ تھے جو ظاہر ہے کے اس وقت تک رائج بھی نہ تھی مگر انہوں نے اپنے سفر ناموں میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپ میں بالعموم اور انگلستان میں مشرقی زبانوں اور علم و ادب خاص کر فارسی زبان کی تحصیل کے حوالے سے برطانوی قوم اور خصوصاً کمپنی کے اہلکاروں کو مشتاق پایا۔ اٹھارہویں صدی کا نصف آخر ہندوستان میں برطانوی ابتدائی نوآبادیاتی دور کے ساتھ ساتھ دراصل انگلستان میں شرق شناسی کا بھی ابتدائی دور تھا۔ ویسے تو ہمارے تینوں سفر نامہ نگاروں کے ہاں یورپی اقوام کی مشرقی زبانوں اور ان میں تصنیف کردہ علم و ادب میں دلچسپی کے حوالے ملتے ہیں مگر منشی اعتصام الدین کے سفر نامے میں اس حوالے سے دلچسپ حقائق پیش کیے گئے ہیں۔

مشرقی زبانوں خاص کر فارسی زبان اور علم وادب کی تحصیل میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو اعتصام نے نہ صرف بھانپ لیا تھا بلکہ وہ فارسی زبان میں انگریزوں کی دلچسپی کی وجہ بھی جانتے تھے۔ اس حوالے سے اعتصام نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھا کے چونکہ بنگال کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ آگئی تھی اسی لیے ان کے اندر فارسی سیکھنے اور پڑھنے کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ اعتصام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق انگریزوں کی مشرقی خاص کر فارسی زبان سیکھنے میں دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کے کپتان سوینٹن نے جنھیں منشی اعتصام الدین کے ہمراہ بادشاہ شاہ عالم کا خط دے کر بطور ایلچی انگلستان روانہ کیا گیا تھا۔ سفر کے دوران منشی اعتصام الدین سے نہ صرف پوری کلیلہ و دمنہ پڑھی بلکہ فرہنگ جہانگیری کے بارہ ابواب جو فارسی قواعد کے متعلق تھے اُن کا ترجمہ بھی کیا۔ منشی اعتصام الدین کے مطابق لندن پہنچنے کے بعد فرہنگ جہانگیری کے ترجمہ کی مدد سے مسٹر ولیم جونز نے جو کلکتہ کی عدالت میں کام کرتے تھے (اور مستشرق تھے) کپتان سوینٹن کے ہمراہ شکرستان کا ترجمہ کیا اور اسے شائع کروایا جس سے انہیں کافی نفع بھی حاصل ہوا اور یہ کتاب اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں میں بہت مقبول بھی ہوئی۔ بودلیئن لائبریری میں کے اعتصام الدین کو مشرقی زبانوں جیسے کے عربی و فارسی کی بہت سی کتب دیکھنے کو ملیں اس کے علاوہ وہاں کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ بھی ان کی نظروں سے گزرا اور فرہنگِ جہانگیری کا خاتمہ جو انہوں نے کپتان سوینٹن کو نقل کرکے دیا تھا وہ بھی کتب خانے میں موجود تھا۔ اعتصام نے اس کتب خانے میں ایک خط دیکھا جو ملک البحر کے بادشاہ کی جانب سے بادشاہ انگلستان کے نام فارسی اور ترکی میں تحریر کیا گیا تھا مگر اعتصام کی رائے میں اس زمانے میں چونکہ انگلستان میں کوئی فارسی زبان سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا اس لیے کوئی بھی اس خط کے متن و مضمون کو اچھی طرح نہ سمجھ سکا مگر اعتصام کے دعویٰ کے مطابق انہوں نے (فارسی زبان پر عبور رکھنے کی بدولت) اُن لوگوں کو اس خط کے مضمون اور صحیح مفہوم سے آگاہ کیا۔[۹۷] اعتصام الدین کی فراہم کردہ ان معلومات سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کی ابتدائی دہائیوں میں برطانیہ میں فارسی زبان پر عبور رکھنے والے مستشرقین کی تعداد بہت کم تھی مگر وہ لوگ فارسی سیکھنے میں دلچسپی بہت رکھتے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگلستان کی اشرافیہ میں فارسی زبان کی مقبولیت اور فارسی سیکھنے کا رجحان کس قدر بڑھ رہا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب اعتصام الدین کو انگلستان میں اپنے مقصد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا یعنی وہ لارڈ کلائیو کی دھوکہ دہی کے باعث بادشاہ شاہ عالم کا خط بادشاہ انگلستان تک نہ پہنچا سکے تو انہوں نے وطن واپسی کا ارادہ کر لیا مگر اعتصام الدین کے مطابق اس زمانے میں چونکہ انگلستان میں فارسی زبان سے اچھی واقفیت رکھنے والا کوئی شخص نہ تھا اس لیے کپتان سوینٹن، ڈاکٹر نیولٹن اور دیگر معززین جو فارسی زبان سیکھنے کے لیے بے حد

مشتاق تھے انہوں نے اعتصام کو انگلستان میں ہی رہنے کا اور وہاں کے معززین کو فارسی زبان سکھانے کا مشورہ دیا اور اس کے بدلے انہیں ہر قسم کی سہولت مہیا کرنے کا لالچ بھی دیا۔ بقول منشی اعتصام الدین:

> اس زمانے میں ولایت میں فارسی زبان جاننے والا کوئی نہ تھا۔ کپتان سوینٹن نے اور ڈاکٹر نیولٹن وغیرہ نے یہ طے کیا کہ مجھ کو لندن میں فارسی پڑھانے کے لیے روک لیا جائے۔ اس لیے کپتان مذکور نے بار بار مجھ سے کہا اور دوسروں سے کہلوایا کہ میں ان کی بات مان لوں اور ہر قسم کا لالچ اور ترغیب بہت زیادہ دی اور کہا کہ ولایت کے معزز لوگ تم سے فارسی کی کتابیں پڑھیں گے اور تم پر بہت مہربان ہو جائیں گے۔ تمہاری دیکھ بھال بہت اچھی طرح ہوگی اور تمہارے بال بچوں کے خرچ کے لیے بنگال میں مستقل طور پر معقول رقم دی جائے گی اور تم ایک بیوی کی بجائے دو بیویاں رکھنا چاہو تو اسلامی طریقے پر نکاح کرا دیا جائے گا۔[۸۰]

ان پیش کشوں کے علاوہ اعتصام کے مطابق کپتان سوینٹن نے انہیں یورپ کے تمام مشہور مقامات کی سیر اور عجائبات و نوادرات دکھانے کا لالچ بھی دیا مگر اعتصام الدین نے وطن سے محبت اور اپنوں سے دوری کے غم میں مبتلا ہونے کے سبب تمام پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور یہ بات ان کے لیے کپتان سوینٹن کی ناراضی کا باعث بھی بنی۔[۸۱]

بحیثیت ماہر فارسی اور منشی مسٹر کیلاڈرسل کے ہمراہ منشی اسماعیل کا سفر انگلستان اختیار کرنا دراصل برطانویوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں میں فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرنے کے رجحان پر دلالت کرتا ہے۔

برطانوی شرفاء کی فارسی زبان سیکھنے میں دلچسپی اور ذوق و شوق دراصل اس لیے تھا کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی فتوحات اپنے عروج پر تھیں۔ اس زمانے میں ہندوستان میں فارسی کو سرکاری و دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا اور نوشت و خواند کا تمام کام بھی فارسی زبان میں کیا جا رہا تھا۔ اس لیے ایسے تمام حضرات جو ہندوستان جا کر ایسٹ انڈیا کمپنی میں اچھی ملازمت و عہدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ فارسی زبان سیکھنے میں دلچسپی لے رہے تھے تاکہ کمپنی کے سپرد کردہ انتظامی امور میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے مراعات اور افسرانِ بالا کی توجہ حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ سر ولیم جونز جیسے مستشرق اور انگریزی دانشورانہ طبقہ فارسی زبان کی تحصیل کے ذریعے ہندوستان کی تاریخ اور علم و ادب سے آگہی چاہتا تھا جو اس قوم کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور عادات و خصائل جاننے کے ذرائع تھے جن سے واقفیت حاصل کر کے وہ آئندہ اس ملک (ہندوستان) پر حکمرانی کرنے کے لیے حکمت عملیاں تیار کر سکتے تھے۔

منشی اعتصام الدین کی طرح میر محمد حسین نے بھی یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ یورپی اقوام اور خاص طور پر انگریز مشرقی زبانوں کی تحصیل اور علوم و فنون کی کتب کے تراجم کرنے میں دلچسپی لے رہے تھے چنانچہ اس حوالے

سے انہوں نے جو مشاہدہ کیا تھا اس کے مطابق انگریز یورپی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ان زبانوں میں انہوں نے کئی ضخیم کتابیں چھاپنی شروع کر دی تھیں اور اپنی استعداد کی حد تک انہیں مرتب بھی کیا تھا۔

میر محمد حسین نے اس حوالے سے ایک انگریز مستشرق 'سیل' کے ترجمہ قرآن کو بہت سراہا بلکہ اس کے ترجمہ قرآن کرنے کو ایک طرح کی خدمت قرار دیا۔[۸۲] اس طرح میر محمد حسین کی فراہم کردہ معلومات سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منشی اعتصام الدین جو ۱۷۶۹ء میں انگلستان سے واپس آئے اور اس وقت اُن کے مطابق انگلستان میں کوئی اچھا فارسی جاننے والا نہ تھا کہ بعد ۱۷۷۵ء تک جب میر محمد حسین انگلستان گئے یعنی محض پانچ یا چھ سالوں میں ہی انگلستان میں کچھ ایسے مستشرقین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو چکی تھی جو میر محمد حسین کے مطابق عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی کتب کے تراجم اپنی استعداد کے مطابق کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔

منشی اسماعیل کے سفر نامے کے اختصار کے باوجود تاریخ جدید میں بھی ہمیں انگلستان میں مشرقی زبانوں کی تحصیل کے رجحان کا ایک آدھ حوالہ مل جاتا ہے۔ اس حوالے سے منشی اسماعیل نے مسٹر کیلاڈر سل جن کے ہمراہ انہوں نے فارسی دان منشی کی حیثیت سے انگلستان کا سفر کیا تھا کے بھائی کا ذکر خاص طور پر کیا جو منشی اسماعیل کے مطابق ترکستان کی کوٹھی میں تعینات رہے تھے اور عربی زبان اور گفتگو میں مہارت رکھتے تھے۔ منشی اسماعیل ان کی عربی دانی سے متاثر ہوئے اور ان کے مطابق مسٹر کیلاڈر سل کے بھائی اگرچہ فارسی زبان پر مہارت نہ رکھتے تھے مگر فارسی زبان سمجھنے سے قاصر نہ تھے۔[۸۳]

یوں ہم اپنے سفر نامہ نگاروں کے برطانوی قوم کی مشرقی زبانوں میں دلچسپی اور مستشرقیت کے حوالے سے فراہم کردہ شواہد کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی خطوں میں برطانوی اقتدار و نو آبادیات قائم ہونے کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں شرق شناسی کے رجحان کو بھی تقویت و ترقی ملی جس سے انہیں مشرقی نو آبادیوں کی زبانیں، علوم و ادب اور ماضی و تاریخ کو جاننے میں بہت مدد ملی۔ اس طرح مستشرقیت کی بدولت حاصل ہونے والے تاریخی اور علمی و ادبی مشرقی سرمائے نے برطانوی نو آبادیوں میں برطانوی نو آبادیاتی نظام کے قیام و استحکام میں بہت معاونت کی۔

۷۔ یورپی زندگی کے اہم پہلو اور جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے تاثرات و رویے: تنقیدی جائزہ

یورپی مرکزیت کا تصور نو آبادیاتی باشندوں پر مختلف طرح سے اثر انداز ہوتا ہے اور یہ تصور نو آبادیاتی نظام

میں نوآبادیاتی باشندوں کے لیے مختلف طرح کی صوت حال اور اس حوالے سے مختلف رویوں کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً کچھ نوآبادیاتی باشندے یورپی مرکزیت کے تصور کو قبول کرتے ہوئے نوآبادکار کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت کو قبول کر لیتے ہیں جسے انجذابی صورت یا انجذابی رویہ کہا جاتا ہے۔ کچھ نوآبادیاتی باشندے یورپ کی مرکزیت کے تصو کو رد کر دیتے ہیں۔ یورپی مرکزیت کے رد کا یہ رویہ دراصل بغاوتی نوعیت کا ہوتا ہے اسی لیے اسے بغاوتی صورت یا بغاوتی رویہ کہا جاتا ہے۔ جب کے کچھ نوآبادیاتی باشندے اپنی تہذیبی و ثقافتی شناخت کھوئے بغیر یورپ کی مرکزیت یعنی یورپی نوآبادکاروں کی زندگی کے سنہری اصولوں کی برتری کو بھی تسلیم کرتے ہیں جو دراصل نوآبادیاتی نظام میں آفاقی صورت حال اور رویوں کو جنم دینے کا باعث بنتے ہیں۔ کسی نوآبادی میں ہم دیکھتے ہیں کے اس طرح کی صورت حال و رویے زیادہ تر نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں ظاہر ہوتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان سے یورپ کا سفر کرنے والے ہمارے جنوب تین ابتدائی سفر نامہ نگار منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کے یورپ اور یورپی نوآبادکاروں کے حوالے سے ان کے تاثرات اور رویوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کے ان کے نزدیک یورپ دراصل وہ خطہ زمین تھا جس نے سولھویں صدی سے مختلف تحریکوں، دریافتوں اور ایجادات کی بدولت تیزی سے ترقی کی جانب سفر کرنا شروع کیا تھا اور اٹھارہویں صدی تک وہ مختلف شعبہ ہائے زندگی مثلاً مذہب، سیاست، سائنس اور تعلیم وغیرہ کے میدان میں اتنی ترقی کر چکا تھا اور ایسے نظریات و طریقہ کار متعارف کروا چکا تھا جو قابل تعریف ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک قابل تقلید بھی تھے۔ ان ہندوستانی ابتدائی سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کے ان کے ہاں برطانوی نوآبادکاروں کو مختلف شعبہ ہائے زندگی جیسے کے مذہب، سیاست، دفاعی نظام، تعلیم اور سائنسی علوم وفنون میں ترقی کے حوالے سے تمام یورپی اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھنے اور قرار دینے کا رجحان ملتا ہے۔ اسی لیے ان کے سفر ناموں میں یورپی زندگی کے ان اہم پہلوؤں کے حوالے سے ان ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کی بحث کا موضوع اور تجزیہ کا دائرہ کار زیادہ تر برطانوی رجحانات ہی رہے جب کے بقیہ یورپی اقوام کے حوالے سے ان پہلوؤں پر جو معلومات و تبصرے پیش کیے گئے وہ زیادہ تر برطانوی رجحانات سے تقابل کے طور پر ہی پیش کیے گئے۔

اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر ناموں میں یورپی (برطانوی) زندگی کے اہم پہلوؤں پر ہمارے ان ابتدائی ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کے پیش کردہ مشاہدات و تاثرات کے عمیق تجزیہ سے ایک اہم نقطہ جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کے ان کے ہاں برطانوی نوآبادکاروں کی زندگی کے کچھ اہم پہلوؤں جیسے کے نظام سیاست، بحری و فوجی قوت اور علمی و سائنسی ترقی کے حوالے سے اگرچہ برطانوی برتری کے تصور کو اجاگر کیا گیا ہے اور اس حوالے سے ان

کی کاوشوں کو سراہا بھی گیا ہے مگر ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے برطانوی زندگی کے ان اہم پہلوؤں کو سراہنے کے انداز اور رویے کسی قدر مختلف ہیں۔

یہاں سب سے پہلے اگر برطانوی دفاعی نظام کے حوالے سے بات کی جائے تو جنوب ایشائی سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین اور منشی اعتصام الدین کے ہاں مشترکہ طور پر برطانوی جنگی بحری جہازوں اور بحیثیت مجموعی بحری قوت کو تمام یورپی اقوام سے اعلیٰ و برتر قرار دیا گیا۔ جس سے ایک تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کے وہ برطانوی نوآبادکاروں کی فوجی و بحری طاقت سے بے حد مرعوب و متاثر تھے اور دوسرے یہ کے انہیں اس زمانے میں برطانیہ کے 'سپر پاور' ہونے کا بھی پورا پورا احساس تھا۔

برطانوی نظام سیاست کے حوالے سے بات کی جائے تو بلاشبہ ہمارے ہندوستانی سفر نامہ نگاروں کے لیے یہ نظام سیاست ہندوستان کے نظام سیاست سے بالکل مختلف اور انوکھی طرز کا تھا مگر ہمارے سفر نامہ نگار منشی اسماعیل اور خاص طور پر منشی اعتصام الدین چونکہ گہرا سیاسی شعور رکھتے تھے اس لیے انہیں برطانوی نظام سیاست کی پارلیمانی طرز اور جمہوری جمہوری روح نے بے پناہ متاثر کیا۔ منشی اسماعیل کے ہاں برطانوی نظام سیاست کے حوالے سے بادشاہ کے محدود اختیارات اور اور مختلف سیاسی اداروں اور عوام کے درمیان پائے جانے والے نظم و ضبط کو مجموعی طور پر مختصر الفاظ میں سراہا گیا۔ ان کے ہاں برطانوی اور ہندوستانی نظام سیاست میں نہ تو کسی قسم کا تقابل پیش کیا گیا اور نہ ہی برطانوی نظام سیاست کو ہندوستانی نظام سیاست سے اعلیٰ 'و برتر قرار دیا گیا۔ جب کے اعتصام الدین نے نہ صرف برطانوی نظام سیاست کے حوالے سے بادشاہ کے محدود اختیارات، پارلیمنٹ کی بالادستی اور برطانوی عوام کے سیاسی شعور جیسے محاسن کو اجاگر کیا بلکہ برطانوی نظام سیاست کی پارلیمانی اور جمہوری روح کو سراہتے ہوئے انہوں نے برطانوی نظام سیاست اور برطانوی قوم کے متعلق بڑے بڑے دعوے اور کلامیے پیش کیے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کے وہ برطانوی نوآبادکاروں کی قائدانہ صلاحیتوں نیز برطانوی قوم کے سیاسی شعور و آگہی سے کس قدر متاثر ہوئے تھے مثلاً اعتصام نے برطانوی نظام سیاست کو دنیا کا بہترین سیاسی نظام اور برطانوی قوم کو دنیا کی بہترین قوم قرار دیا۔ اعتصام نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ برطانوی نظام سیاست کے محاسن اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندوستانی نظام سیاست کے عیوب کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ انہوں نے ہندوستانی بادشاہوں کی تعیش پرستی، کاہلی اور ناعاقبت اندیشی اور شہزادوں کی آپس کی خانہ جنگی اور نااتفاقی کو ہندوستانی سیاست کے زوال کے اسباب قرار دیا۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کے وہ ہندوستان کی گزشتہ و معاصر سیاسی تاریخ کے متعلق بھی کس قدر آگاہی رکھتے تھے۔

اہل یورپ کے مذہب کے حوالے سے بات کی جائے تو جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں محمد حسین یورپ میں اٹھنے والی اصلاح مذہب کی تحریکوں اور ان کے بانیوں (مارٹن لوتھر اور جان کالون) کے متعلق نہ صرف معلومات رکھتے تھے بلکہ ان تحریکوں کی بدولت یورپ میں برپا ہونے والے علمی و فکری انقلاب اور اس بناپر چرچ اور پوپ کی حیثیت اور مقام و مرتبے پر پڑنے والے اثر کے متعلق بھی کافی آگہی رکھتے تھے۔ میر محمد حسین نے اگرچہ تمام یورپ کا مذہب 'نصرانیت' قرار دیا مگر وہ اس حقیقت سے اچھی بھی واقف دکھائی دیئے کہ یورپی عہد نشاط ثانیہ (اگرچہ انہوں نے اس اصطلاح کا براہ راست استعمال نہیں کیا) میں یورپ میں مختلف فرقے جنم لے چکے تھے۔ مگر ان کے ہاں یورپیوں کے مختلف مذہبی فرقوں کو نہ تو کتھولک اور پروٹسٹنٹ کی اصطلاحات سے وضع کیا گیا اور نہ ہی ان کے عقائد یا ان کے درمیان عقائد کے حوالے سے پائے جانے والے اختلافات کے متعلق کوئی معلومات فراہم کی گئیں۔ تاہم مجموعی طور پر انہوں نے یورپی اقوام کے اصلاح مذہب کے حوالے سے اٹھائے جانے والے اقدامات کو یورپ میں ہونے والی علمی و سائنسی ترقی کا ایک اہم محرک قرار دیتے ہوئے اسے سراہا۔ مگر منشی اعتصام الدین کے ہاں اس حوالے سے دلچسپ صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے ہاں بھی اگرچہ اہل نصاریٰ کے فرقوں میں عقائد کے اختلافات کو بیان کرنے کے لیے کتھولک اور پروٹسنٹ کی اصطلاحات کا استعمال نہیں کیا گیا مگر ان کے ہاں برطانویوں (پروٹسٹنٹس) اور بقیہ اہل نصاریٰ کے مذہبی عقائد کے حوالے سے چند بنیادی اختلافات کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی طرف خاص توجہ ضرور دی گئی اور اس طرح انہوں نے اہل نصاریٰ کے مذہبی عقائد پر اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے تمام یورپی اقوام میں برطانوی نوآبادکاروں کے مذہبی عقائد کو سب سے بہتر قرار دیا۔ حالانکہ اعتصام اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے کہ انگریزوں میں بھی کچھ لوگ مشرکانہ عقائد رکھتے تھے (یعنی باقی اہل نصاریٰ کی طرح حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا تسلیم کرتے تھے) جب کہ کچھ ملحد یا دہریہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کی دانست میں انگریز چونکہ بقیہ اہل نصاریٰ کی طرح نہ تو بت پرستی کے طریقہ پر عبادت کرتے تھے اور نہ ہی فرانسیسیوں کی مانند Confession جیسے غیر عقلی فعل کو پسند کرتے تھے اس لیے انہوں نے مجموعی طور پر تمام یورپی اقوام میں برطانوی نوآبادکاروں کے مذہبی عقائد اور عبادت کے طریقہ کار کو سب سے بہتر قرار دیا۔

یورپی سائنسی ترقی اور ایجادات کے حوالے سے اگر جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے پیش کردہ تاثرات و رویوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعتصام کے ہاں اس حوالے سے کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں کی گئیں البتہ انہوں نے برطانیہ میں اپنی مشاہدہ کردہ کچھ ایسی مشینوں کی ایجادات کو ضرور سراہا جنہوں نے انسانی مشقت کو کم کرنے میں مدد دی۔ جیسے کہ آٹا پیسنے کی مشین، بیجوں سے تیل نکالنے والی مشین اور گھڑیاں وغیرہ۔ علمی و سائنسی ترقی

کے حوالے سے دراصل ان کے ہاں برطانوی قوم کو تمام یورپی اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ قرار دینے کا رجحان نظر آتا ہے۔ میر محمد حسین کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کے ہاں یورپ کی علمی و سائنسی ترقی کو بحیثیت مجموعی جب کے برطانوی علمی و سائنسی ترقی کو بالخصوص سراہا گیا اور 'نیوٹن' کے حوالے سے برطانیہ کی سائنسی و علمی برتری کا تصور بھی پیش کیا گیا۔ مگر ان کے ہاں سابقہ مسلم علمی و سائنسی ورثے کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا بلکہ انہوں نے سابقہ مسلم و یونانی علمی ورثے کو یورپ کی حالیہ سائنسی ترقی کی بنیاد قرار دیا۔

برطانوی نظام تعلیم میں اگرچہ جدید سائنسی علوم کی تعلیم ہمارے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کی توجہ کا مرکز ضرور بنی مگر انگریزی زبان یا انگریزی نصاب تعلیم کو مثالیہ قرار دینے کا رجحان ان ابتدائی جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے ہاں نہیں ملتا۔ جیسے کے برطانوی نظام تعلیم کے حوالے سے اعتصام کی بحث کا موضوع زیادہ تر طریقہ تعلیم اور تربیتی نظام ہی رہا۔

شرق شناسی (مستشرقیت) کے حوالے سے جنوب ایشائی سفر نامہ نگاروں کی آراء و تاثرات کا جائزہ لیا جائے تو بلاشبہ ہمارے تینوں سفر نامہ نگاروں نے یہی تجزیہ پیش کیا کے اہل یورپ اور خاص طور پر برطانوی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں مشرقی زبانوں اور خاص کر فارسی زبان سیکھنے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ میر محمد حسین نے خاص طور پر مشرقی زبانیں سیکھنے نیز ان زبانوں میں موجود علمی و ادبی سرمائے کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کے برطانوی رجحان کو بہت سراہا۔

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام الدین نے یورپی زندگی کے تمام پہلوؤں جیسے کے مذہبی عقائد، نظام سیاست، سائنسی و علمی ترقی اور نظام تعلیم کے حوالے سے برطانوی رجحانات و رویوں کو تمام یورپی اقوام اور سوائے مذہب کے تمام چیزوں میں ہندوستانیوں سے بہتر رویوں اور طریقہ کار کا حامل قرار دیا۔ میر محمد حسین کے ہاں بھی علمی و سائنسی ترقی اور جنگی و بحری قوت میں برطانوی قوم کو دوسری تمام یورپی اقوام سے ترقی یافتہ قرار دینے کا تصور ملتا ہے مگر ان کے ہاں اس سلسلے میں نہ تو ہندوستان سے کسی قسم کا تقابل کیا گیا اور نہ ہی مسلم علمی وادبی ورثے کو کمتر سمجھنے کا رجحان ملتا ہے۔ جب کے منشی اسماعیل کے ہاں بھی اگرچہ برطانوی مادی ترقی اور نظام سیاست کو سراہا ضرور گیا ہے مگر ان کے ہاں ان پہلوؤں کے حوالے سے برطانوی قوم کا دوسری یورپی اقوام یا ہندوستان سے کسی بھی حوالے سے تقابل پیش نہیں کیا گیا۔ یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کے ہمارے تینوں ابتدائی سفر نامہ نگاروں نے یورپی زندگی کے اہم پہلوؤں کے حوالے سے برطانوی زندگی کے رجحانات اور طور طریقوں کو سراہا ضرور ہے مگر سراہنے کا انداز زیادہ نہیں مگر کسی قدر مختلف ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ The Euler Archive، "Europe in the 18th Century"، تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۸، ۲۰۱۹ء، http://eulerarchive.maa.org>eighteenth

۲۔ مولانا محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء)، ص ۶۶۔۶۷۔

۳۔ گلشاں خان، Indian Muslim Perception of the West during the Eighteenth Century (پی۔ایچ۔ڈی۔ مقالہ، یونیورسٹی آف آکسفورڈ، ۱۹۹۳ء)، ص، ۱۴۳۔۱۴۵۔

۴۔ منشی اعتصام الدین، شنگرف نامۂ ولایت ۱۷۶۷ء۔۱۷۶۹ء مترجم امیر حسن نورانی (پٹنہ: خدابخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء)، ص، ۷۴۔۷۵۔

۵۔ میر محمد حسین لندنی، مشـــــاہدات فرنـــــگ، مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی (لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، سن ندارد)، ص ۲۲۸۔

۶۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص، ۷۷۔

۷۔ ایضاً، ص، ۸۳۔

۸۔ ایضاً، ص ۸۳۔۸۲۔

۹۔ ایضاً، ص ۷۸۔۷۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۳۔

۱۱۔ ایضاً، ص، ۱۳۴۔۱۳۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۳۔۸۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۵۔۹۱۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۸۔۸۰۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۰۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۰۔۸۱۔

۱۸۔ مارٹن لوتھر (۱۰ نومبر ۱۴۸۳ء۔ ۱۸ فروری ۱۵۴۶ء) جرمن الٰہیات دان، پروفیسر، راہب اور پروٹسٹنٹ اصلاحات تعارف کرانے والی اہم شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس نے رومن کیتھولک چرچ کی متعدد روایات اور تعلیمات وعقائد کورد کیا۔ اس سلسلے میں اس نے ۱۵۱۵ء میں اپنے پینتالیس مقالہ جات پیش کیے۔ علاوہ ازیں اس نے بائبل کو جرمن زبان میں ترجمہ کرنے کی خدمت بھی سرانجام دی۔

مارٹن لوتھر (مذہب اور عقیدہ)،Mimir اردو انسائیکلوپیڈیا، تاریخ ملاحظہ جنوری ۲، ۲۰۲۰ء
http://mimirbook.com۔

۱۹۔ جان کالون ایک معروف پروٹسٹنٹ اور ماہر الہیات قانون دان فرانس کے ایک قصبے نویون میں ۱۵۰۹ء میں پیدا ہوا۔ کالون اُس وقت محض آٹھ برس کا تھا جب مارٹن لوتھر نے وٹن برگ میں پروٹسٹنٹ اصلاح کا آغاز کیا تھا۔ کالون کی تربیت گرچہ ایک کیتھولک کی حیثیت سے ہوئی تھی مگر وہ پروٹسٹنٹ خیالات سے متاثر تھا۔ اسی لیے ۱۵۳۶ء میں وہ جنیوا چلا گیا جہاں پروٹسٹنٹ فرقہ تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ وہاں پروٹسٹنٹ طبقہ میں کالون بہت معروف ہوا اور ان لوگوں نے کالون کو اپنا رہنما بنانے کی پیش کش کی اور جنیوا میں ہی رہنے کی درخواست کی مگر کچھ ہی عرصہ بعد کالون اور جنیوا کے علماء کے درمیان اختلافات نے جنم لیا اور اسے ۱۵۳۸ء میں یہ شہر چھوڑنا پڑا۔ ۱۵۴۱ء میں وہ واپس جنیوا آگیا اور اس شہر کا مذہبی و سیاسی رہنما بن گیا۔ کالون کی رہنمائی اور قیادت میں جنیوا یورپ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کا گڑھ بن گیا۔ کالون مرتے دم تک پروٹسٹنٹ فرقے کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کوشاں رہا۔

"جان کالون 1564-1509"، اردو پوائنٹ، نومبر ۴، ۲۰۱۵ء، تاریخ ملاحظہ جنوری ۳، ۲۰۲۰ء،
http://www.urdupoint.com>article

۲۰۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۳۰۔

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ ناصر عباس نیر، لسانیات اور تنقید (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۴۔۲۵۔

۲۳۔ فرانز فینن، افتادگان خاک، مترجم سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز، ایضاً، ص ۳۲۔

۲۴۔ منشی اعتصام الدین، شگرف نامہ ولایت، ایضاً، ص ۴۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۶۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۲۹۔۲۳۱۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۲۹۔

۲۸۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص ۱۱۰۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔۱۱۰۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔۱۱۱۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۳۴۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت (لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۳۷ء)، ص ۶۳۔

۳۵۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص ۹۵۔

۳۶۔ منشی اعتصام الدین،شگرف نامہ ولایت ایضاً،ص ۹۴۔۹۶۔
۳۷۔ ایضاً،ص ۹۶۔۹۷۔
۳۸۔ ایضاً،ص ۹۵۔
۳۹۔ ایضاً،ص ۱۰۰۔۱۰۱۔
۴۰۔ ایضاً،ص ۹۸۔۹۹۔
۴۱۔ ایضاً،ص ۹۹۔۱۰۰۔
۴۲۔ ایضاً،ص ۱۰۲۔۱۰۳۔
۴۳۔ ایضاً،ص ۱۰۳۔۱۰۴۔
۴۴۔ ایضاً،ص ۱۰۳۔
۴۵۔ ایضاً،ص ۱۹۴۔
۴۶۔ فرانز فینن،افتادگان خاک ،ایضاً،ص ۳۲۔۳۳۔
۴۷۔ منشی اعتصام الدین،ایضاً،ص،۱۰۱۔
۴۸۔ میر محمد حسین لندنی،مشاہدات فرنگ،ص،۲۲۸۔
۴۹۔ ناصر عباس نیر،لسانیات اور تنقید،ص،ا۔
۵۰۔ منشی اعتصام الدین،ص ۹۳۔
۵۱۔ ایضاً،ص ۱۰۱۔
۵۲۔ ایضاً،ص ۱۰۵۔
۵۳۔ باری علیگ،کمپنی کی حکومت، ایضاً،ص،۳۵۔
۵۴۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً،ص،۱۰۶۔
۵۵ ایضاً۔
۵۶۔ ایضاً۔،ص،۱۰۶۔۱۰۷
۵۷۔ پیٹر فشر(Peter Fisher)، The Calico Acts: Why Britain turned its B*ack* On Cotton ، Soundideas تاریخ ملاحظہ ۱۲جنوری ۲۰۲۰ء،
http://soundideas.phgetsound.edu/history-these/
۵۸۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً،ص،۷۔
۵۹۔ منشی اسماعیل، "تاریخ جدید"، مترجم جواد ہمدانی، بنیاد، شمارہ ۵(۲۰۱۴ء)، ص ۱۰۵۔
۶۰۔ Europe in the 18th century،ایضاً۔
۶۱۔ "سائنسی ترقی کا جدید انقلاب کیسے آیا؟، الحاد،تاریخ اشاعت،۱۵اپریل ۲۰۱۹ء،۶جنوری ۲۰۲۰ء،

http://ilhaad.com>2019 /04>how...

۶۲۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۲۶۔

۶۳۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص ۱۲۹۔۱۳۰۔

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔

۶۵۔ ایضاً، ص ۶۲۔

۶۶۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۳۱۔

۶۷۔ محمد طفیل ہاشمی، اندلس میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے (اسلام آباد: ملت پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ص ۵۲ـ۵۳۔

۶۸۔ ابن عربی کا پورا نام ابو بکر محمد بن العربی الحاتمی الطائی ہے۔ آپ کا لقب محی الدین ہے جبکہ عقیدت مندوں اور مقلدوں میں آپ شیخ اکبر کے خطاب سے مشہور ہیں۔ ابن عربی ۷ اگست ۱۱۶۵ء میں جنوبی سپین کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے مسلم علمی و فکری روایت میں اپنے مخصوص نظریہ تصوف کے علاوہ فلسفہ، کشف، تفسیر، علم حدیث، اصول فقہ، الٰہیات، فلسفہ، تصوف، صرف و نحو، سیرت، نفسیات، شاعری، مابعد الطبیعات اور فلسفہ زمان و مکان جیسے علوم میں اپنے پیش کردہ نظریات کے حوالے سے کافی شہرت حاصل کی۔

عامر سہیل، "شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی: ایک تعارفی مطالعہ"، دانش (نومبر ۷، ۲۰۱۹ء)، تاریخ ملاحظہ ۶ جنوری ۲۰۲۰ء،

http://caawish.pk

۶۹۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۳۱۔

۷۰۔ ایضاً

۷۱۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص ۱۲۰۔

۷۲۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۳۱۔۲۳۰۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۲۳۴۔۲۳۵۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۳۴۔

۷۵۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص ۲۳۶۔

۷۶۔ ایضاً، ص ۲۴۰۔

۷۷۔ ایضاً، ص ۲۴۰۔

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۴۴۔۲۴۵۔

۷۹۔ منشی اعتصام الدین، ایضاً، ص ۵۹۔۶۰۔

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔۱۳۱۔

۸۲۔ میر محمد حسین، ایضاً، ص، ۲۲۹۔

۸۳۔ منشی اسماعیل، ایضاً، ص ۱٦۱۔

ماحصل

ماحصل

اٹھارہویں صدی کا نصف آخر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے سیاسی زوال اور برطانوی نوآبادیات کا ابتدائی دور تھا۔اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنے فوجی مقبوضات بڑھانے اور نوآبادیاں قائم کرنے کا سفر تیزی سے طے کیا۔یہاں تک کے بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے علاوہ اٹھارہویں صدی کے **اختتام تک جنوبی ہند کا ایک بڑا** حصہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات میں شامل ہو چکا تھا۔ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا سیاسی اثر رسوخ بڑھنے سے برطانیہ کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اس لیے اس دور میں جنوب ایشیائی باشندوں خاص کر کمپنی کے زیر تسلط علاقوں، ریاستوں اور صوبوں کے اشرافیہ اور تعلیم یافتہ افراد میں مختلف مقاصد کے تحت برطانیہ جانے نیز وہاں کی تہذیب و تمدن، سائنسی ترقی علوم و فنون اور یورپی زندگی کے دیگر اہم پہلوؤں کے متعلق نہ صرف معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی لی گئی بلکہ ان معلومات کو تحریری طور پر قلمبند کرنے کی روایت کا آغاز بھی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے ابتدائی دور سے رواج پایا۔

زیر نظر تحقیقی مقالے 'اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفرناموں میں تصوریورپ:نوآبادیاتی مطالعہ' میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے سفر یورپ کے متعلق تحریر کیے گئے تین ابتدائی سفرناموں کا تحقیقی و تنقیدی نوآبادیاتی مطالعہ البرٹ میمی، فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید کے نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے پیش کردہ نظریات میں سے چند بنیادی نوآبادیاتی نظریات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ان سفرناموں میں تاریخ جدیداز منشی اسماعیل،شگرف نامۂ ولایت از منشی اعتصام الدین اور رسالۂاحوال ملک فرنگ و ہندوستان(مشاہدات فرنگ)ازمیر محمد حسین لندنی شامل ہیں۔ان سفرناموں کے علاوہ جنوب ایشیائی باشندے محمد عبداللہ کے سفرنامے 'سفرنامۂروس و چین' سے روس کی سیاحت والے حصے پر بھی الگ سے ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین کا تعلق ہندوستانی طبقۂاشرافیہ سے تھا اور وہ علوم عقلیہ کے ماہر تھے۔جب کے بقیہ مصنفین بنگال کے متوسط طبقہ کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ افراد تھے اور ان میں سے دو منشی گری کے پیشے سے وابستہ تھے۔

جنوب ایشیائی سفرناموں کے ان مصنفین کے حوالے سے یہ بات اہم بھی ہے اور توجہ کی حامل بھی ہے کہ اٹھارہویں صدی میں ان کے سفر یورپ اختیار کرنے سے پہلے کمپنی بنگال، بہار اور اوڑیسہ کے دیوانی حقوق حاصل کر

چکی تھی اور یہ مصنفین ایسٹ انڈیا کمپنی یا کمپنی کے اہلکاروں کی ماتحتی میں عارضی نوعیت کی ملازمتیں بھی انجام دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے نوآبادیاتی دور کی چند ایک سیاسی اور نوآبادیاتی صداقتوں کے عینی شاہدین بھی تھے۔ جیسے کہ اعتصام الدین جنگ بکسر اور معاہدہ الٰہ آباد کے چشم دید گواہ تھے اور ان کے دعویٰ کے مطابق معاہدہ الٰہ آباد کے تحریر کرنے والے بھی وہ خود ہی تھے۔ جب کے منشی اسماعیل ۱۷۷۰ء میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص انتظامی پالیسیوں کے نتیجے میں رونما ہونے والے قحط اور اس کی ہولناکیوں کے چشم دید گواہ تھے اور ان دونوں سفر نامہ نگاروں نے ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور میں سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی کے نتیجے میں رونما ہونے والے ان تاریخی واقعات کے متعلق بھی اپنے سفر ناموں میں معلومات فراہم کیں مگر اہم بات یہ ہے کہ نہ تو منشی اعتصام الدین نے بنگال کی دیوانی کے حقوق اور معاہدہ الٰہ آباد کے ذریعے کمپنی کی معاشی لوٹ کھسوٹ کو تنقید کا نشانہ بنایا اور نہ ہی منشی اسماعیل نے بنگال کے قحط کا ذمہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناقص انتظامی پالیسیوں کو قرار دیا۔ اس طرح ابتدائی نوآبادیاتی دور کے ان سفر نامہ نگاروں کے ہاں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت مسلط برطانوی نوآبادکاروں کے متعلق کسی قسم کی منفی آراء وتاثرات کا اظہار نہیں ملتا۔

ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں یورپ کے متعلق تحریر کیے گئے بیان کردہ سفر ناموں کی تاریخی اور ادبی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس لیے کے یہ سفر نامے نہ صرف ہندوستان میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں ابتدائی نوآبادیاتی باشندوں کے یورپ اور یورپی نوآبادکاروں کی تہذیب و تمدن اور دیگر اہم پہلوؤں پر براہ راست مشاہدات اور حاصل کردہ معلومات کے ابتدائی ماخذات ہیں، بلکہ یہ ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیاتی صورت حال میں ابتدائی نوآبادیاتی عہد کے سفر نامہ نگاروں کے بیان کردہ تصورات وتاثرات یورپ سے یورپی (برطانوی) نوآبادکاروں اور جنوب ایشیائی باشندوں کے درمیان ابتدائی نوآبادیاتی تعلقات ورویوں کو جاننے کے حوالے سے بھی اہم ماخذات ہیں۔

زیر نظر تحقیقی مقالے میں نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و رویوں کے حوالے سے فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید کے جن نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے جنوب ایشیائی سفر ناموں کا نوآبادیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ان کا لب لباب کچھ یوں ہے کے نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کی معیشیت واقتصادیات اور تہذیب وثقافت کا استحصال کنندہ ہوتا ہے۔ نوآبادکار یہ استحصال دراصل اپنی طاقت کے بل بوتے پر کرتا ہے۔ نوآبادکار کی طاقت بھی دو طرح کی

ہوتی ہے۔ایک طاقت تو وہ ہوتی ہے جس کا مظاہرہ وہ فوجیوں اور ہتھیاروں کے استعمال سے کرتا ہے اور اس طرح جسمانی طور پر انہیں اپنا غلام اور مطیع و فرمانبردار بناتا ہے جب کے طاقت کی دوسری قسم اسے 'ڈسکورس' یعنی ایسے کلامیوں سے حاصل ہوتی ہے جو اسے اعلیٰ و برتر اور نوآبادیاتی باشندوں کو کمتر اور ادنیٰ ثابت کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اس طاقت کو نوآبادکار، نوآبادیاتی باشندوں کو اپنا ذہنی غلام بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔وہ اس طرح کے نوآبادکار اپنی تحریروں اور اپنے کلامیوں میں نوآبادیاتی باشندوں کی ثقافت، رسم و رواج، زبان اور ان کے علوم و فنون کو پسماندہ اور زوال یافتہ قرار دے کر بڑی سہولت سے ان کے لیے حیوانیات کی اصطلاحیں جیسے کے جنونی، جنگلی اور بندر وغیرہ استعمال کرتا ہے۔ وہ ان غیر تہذیب یافتہ اور جانور نما انسانوں کو تہذیب یافتہ بنانے کے لیے ان کے سامنے اپنی تہذیب و تمدن، ثقافت اور علوم و فنون کو نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے مگر یورپی برتری اور مرکزیت کا یہ تصور مختلف نوآبادیاتی باشندوں پر مختلف طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔یعنی کچھ نوآبادیاتی باشندے یورپی نوآبادکاروں کی برتر و مقتدر حیثیت کو قبول کرتے ہوئے ان کی تقلید کرتے ہیں اور ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں، جب کے کچھ اسے رد کرتے ہوئے اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، اور کچھ اپنی اور نوآبادکاروں کی تہذیب و تمدن کے اعلیٰ عناصر کو قبول کرتے ہوئے آفاقی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مگر نوآبادیاتی باشندے ان میں سے جو رویہ یا ردعمل کی جو صورت بھی اختیار کر لیں وہ نہ تو نوآبادکار کے ہم پلہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی مقتدر حیثیت کو ختم کر سکتے ہیں۔

نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے ان نظریات کو مد نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے جنوب ایشیائی خطے (ہندوستان) میں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں سفر کرنے والے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے سفر یورپ کے اسباب اور اغراض و مقاصد، خطہ یورپ اور اس میں بسنے والی اقوام کے متعلق ان کی عمومی و مجموعی معلومات و تاثرات اور برطانوی نوآبادکاروں کی تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور دیگر اہم پہلوؤں کے متعلق ان کے مشاہدات و تاثرات اور فراہم کردہ معلومات سے ابتدائی نوآبادیاتی دور کے ہندوستانی باشندوں اور یورپی نوآبادکاروں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا تجزیہ کر کے نتائج حاصل کیے ہیں۔

نوآبادیات کے ابتدائی دور میں چاروں جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامہ نگاروں محمد عبداللہ، منشی اسماعیل، منشی اعتصام الدین اور میر محمد حسین کے سفر یورپ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات کے بغور تجزیہ سے یہ حقائق سامنے آتے ہیں کے ان چاروں سفر نامہ نگاروں نے کمپنی کی جنگ 'بکسر' میں فتح کے بعد بنگال میں سیاسی و معاشی ابتری کے زمانے میں بظاہر نوآبادیاتی دور کے مختلف اسباب و محرکات کے تحت سفر یورپ اختیار کیا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کے تقریباً یہ تمام سفر نامہ نگار بنگال میں کمپنی کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور معاشی استحصال کی وجہ سے مالی و معاشی

مسائل کا شکار تھے یہ اور بات ہے کے انہوں نے اپنے مالی و معاشی مسائل کا مورد الزام براہ راست کمپنی کو نہیں ٹھہرایا مگر در حقیقت اپنے انہی مالی مسائل کو حل کرنے کے لیے انہوں نے سفر یورپ اختیار کیا تھا۔ مثلاً محمد عبداللہ کے سفر نامے میں موجود معلومات اس قیاس کو جنم دیتی ہیں کے انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی کسی خاص مہم یا جاسوسی کے پیش نظر روس و چین کا سفر اختیار کیا تھا۔ منشی اسماعیل نے نو آبادیات کے ابتدائی دور میں بھوک اور بے روزگاری سے بچنے کے لیے انتہائی مجبوری کے عالم میں کمپنی کے ایک اہلکار کے ساتھ بحیثیت ماہر فارسی دان منشی سفر یورپ اختیار کیا تھا۔ منشی اعتصام الدین نے بظاہر ایک شاہی مہم کے پیش نظر سفر یورپ اختیار کیا تھا تاکہ وہ بادشاہ شاہ عالم کے دہلی تک بحفاظت پہنچنے کے لیے بادشاہ انگلستان 'جارج سوم' سے انگریزی فوج کی مدد حاصل کرنے کا اجازت نامہ لے آئیں مگر در حقیقت وہ بھی منشی اسماعیل کی طرح معاشی مشکلات کا شکار تھے اور اس مہم کو سر کرنے کی صورت میں چونکہ انہیں شاہی انعامات و نوازشات ملنے کا امکان تھا اسی لیے انہوں نے سفر یورپ اختیار کیا۔ میر محمد حسین نے اگرچہ ہندوستان میں نو آبادیات کے ابتدائی دور میں ہندوستانی اشرافیہ میں یورپی سائنسی علوم، نت نئی ایجادات و جدید سائنسی نظریات کے چرچے اور اپنے ذوق حصول علم کے پیش نظر سفر یورپ اختیار کیا۔ مگر انگلستان جاکر انگریزی زبان کی تحصیل اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے پیچھے دراصل کمپنی میں کوئی موزوں عہدہ حاصل کرنے کی خواہش بھی کارفرما تھی۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کے ہمارے ان چاروں جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے اپنی خواہش یا سیاحت کے پیش نظر سفر یورپ اختیار نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے نو آبادیاتی دور کے اسباب و محرکات اور مالی و معاشی مسائل کارفرما تھے۔

نو آبادیاتی نظام میں نو آبادیاتی نظریہ سازوں (فرانز فینن، البرٹ میمی اور ایڈورڈ سعید) کے بیان کردہ نظریات کی روشنی میں جیسا کے ہم جانتے ہیں کے نو آبادکاروں کی دنیا، علوم و فنون، زبان و ادب، نظام سیاست، مذہب، ثقافت و معاشرتی اقدار غرض کے ہر شے اپنے اندر اعلیٰ وارفع کا تاثر لیے ہوتی ہے جب کے نو آبادیاتی باشندوں کی ہر شے اپنے اندر ادنیٰ و کمتر کا تاثر لیے ہوتی ہے۔ اس تصور کو مد نظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے بات کی جائے اگر جنوب ایشیائی سفر ناموں میں یورپی نو آبادکاروں کی حقیقی دنیا 'برطانیہ' کے حوالے سے سفر نامہ نگاروں کے پیش کردہ تصورات و تاثرات کی نوعیت کی تو بلاشبہ ان جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جنگ پلاسی اور جنگ بکسر میں کمپنی کی فتح کے بعد ایک ایسے دور میں برطانوی نو آبادکاروں کی حقیقی دنیا کو دیکھنے کا موقع میسر آیا تھا جب ہندوستان میں برطانوی نو آبادکاروں کی معاشی و اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے ہمارے یہ سفر نامہ نگار بھی یورپ کے حسن اور ترقی سے بے پناہ متاثر ہوئے۔ خاص

طور پر یورپ کے جدید ترین شہر لندن کی مادی، تکنیکی اور صنعتی ترقی کے مظاہر اور بعض عوامی سہولیات جیسے کہ لندن میں اسٹریٹ لائٹس کا نظام، پختہ و کشادہ سڑکیں، پانی کی فراہمی کا جدید نظام، باغات، پارکوں، رقص خانوں اور عجائب گھروں نے جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامہ نگاروں منشی اعتصام الدین اور منشی اسماعیل کی توجہ اور دلچسپی کو یکساں طور پر اپنی جانب مبذول کیا اور انہوں نے ان سہولیات کے فوائد اور اپنی پسندیدگی کے حوالے سے تقریباً ملتے جلتے تاثرات پیش کیے۔ جو ایک طرح سے 'ہم' کی 'وہ' پر مادی و اقتصادی ترقی کی فضیلت کی طرف دراصل ایک اشارہ ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان سفر نامہ نگاروں کے لندن کی صنعتی و مادی ترقی کے حوالے سے بیان کردہ تاثرات و تبصروں سے اگرچہ ان کی حیرت، مسرت اور دلچسپی جیسے ملے جلے تاثرات کا اظہار ضرور ہوتا ہے مگر احساس کمتری جیسے کسی جذبے یا احساس کا شائبہ نہیں ابھرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں ہمیں یورپ کی مادی و صنعتی ترقی کا ہندوستان سے براہ راست تقابل کرنے کا رجحان بھی دکھائی نہیں دیتا۔

یورپی علمی و سائنسی ترقی کے حوالے سے بات کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور کے تقریباً تمام سفر نامہ نگاروں نے یورپ میں سائنسی علوم و فنون کی ترقی اور ان کی تعلیم دینے کے رجحان کو بے حد سراہا۔ اس حوالے سے آکسفورڈ جیسے تعلیمی ادارے ان کی توجہ کا خاص مرکز بنے۔ میر محمد حسین نے یورپ میں سائنسی علوم جیسے کہ طبیعیات، ریاضیات اور علم ہیئت و فلکیات کی تعلیم اور ان علوم میں یورپی جدت و ترقی کو بے حد سراہا اور نیوٹن کی ایجادات و نظریات اور اختراعات کے پیش نظر تمام یورپ میں سائنسی ترقی کے حوالے سے برطانوی برتری کے تصور کو بھی پیش کیا۔ جب کہ منشی اعتصام الدین کے ہاں سائنسی علوم و فنون میں برطانوی ترقی کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے پرائمری اور ثانوی تعلیمی اداروں کے طریقہ تعلیم اور برطانوی اشرافیہ کے ہاں بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اختیار کردہ رویوں مثلاً بچوں کو اقامتی درسگاہوں میں تعلیم دلوانے اور انہیں چست و چالاک بنانے کے لیے گھڑ سواری اور اس جیسے دیگر فنون سکھانے کو صحت مندانہ اور مثبت رویے ورجحانات قرار دیا گیا۔ برطانوی اشرافیہ کے برعکس ہندوستانی اشرافیہ میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اپنائے گئے رویے جیسے کہ بچوں کو مدارس کی بجائے گھروں میں تعلیم دلوانا نیز تعلیم کے حصول کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دینا اعتصام کے نزدیک قابل مذمت اور غیر صحت مندانہ رجحانات ورویے قرار دیے گئے۔ مگر یورپی سائنسی ترقی اور سائنسی علوم و فنون کے حوالے سے ابتدائی نوآبادیاتی دور کے ان سفر نامہ نگاروں کی پیش کردہ آراء اور دیئے گئے تاثرات دراصل ہمیں کچھ اہم نتائج اخذ کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ جیسے ایک تو یہ کہ ان کے ہاں جس دلچسپی اور شوق سے یورپی سائنسی ترقی اور ایجادات کو زیر بحث لایا گیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوب ایشیائی خطے کے تعلیم یافتہ افراد اور دانشورانہ طبقے میں یورپی سائنسی جدت و

ترقی کے چرچے ہورہے تھے اور اس حوالے سے ان کے ہاں معلومات حاصل کرنے کا ذوق وشوق بھی بڑھ رہا تھا۔ مگر اس حوالے سے اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ مصنفین سائنس یا سائنسی علوم وفنون کو یورپی علوم وفنون سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا دکھائی نہیں دیتے۔ جیسے کہ محمد حسین نے یورپ میں علمی و سائنسی ترقی میں اسپین کے اس مسلم علمی، ادبی و سائنسی سرمائے کو ایک اہم محرک اور سنگ میل قرار دیا جو فتح اسپین کے بعد یورپیوں کے ہاتھ لگا۔ جب کہ تیسری اہم بات یہ ہے کہ ان کے ہاں برطانوی اور ہندوستانی نظام تعلیم کے حوالے سے ان میں پڑھائے جانے والے نصابات یا مشرقی و مغربی علوم وفنون یا پھر انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو موضوع نہیں بنایا گیا جو ہندوستان میں برطانوی نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں جنوب ایشیائی اور برطانوی نوآبادکاروں کے درمیان بحث کا پسندیدہ مگر متنازع موضوع رہا۔ اس کے برعکس ابتدائی نوآبادیاتی دور کے ان سفر نامہ نگاروں کے ہاں تقابل کے واسطے محض برطانوی تعلیمی اداروں میں تعلیم دینے کا طریقۂ کار اور تربیت کا نظام ہی موضوع بحث رہا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کے ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون یا نصابات کی اہمیت وافادیت کے حوالے سے وہ کسی قسم کے شک و شبہ یا احساس کمتری میں مبتلا نہ تھے۔ تاہم شگرف نامہ میں اعتصام الدین کی یورپیوں کی ہندوستانیوں کے متعلق بیان کردہ آراء سے بعض جگہ اس بات کا اشارہ ضرور ملتا ہے کے نوآبادیات کے ابتدائی دور میں بھی یورپی نوآبادکاروں نے ہندوستانیوں کو خود سے علم و عقل میں کمتر ثابت کرنے کے لیے ان کے متعلق 'سادہ لوح'، 'نادان' اور 'بیوقوف' جیسی اصطلاحات ضرور مشہور کر رکھی تھیں جو انیسویں صدی تک جیسا کے ہم جانتے ہیں ڈسکورس کا درجہ اختیار کر گئی تھیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے یورپ کی علمی ترقی اور سائنسی ایجادات وجدید نظریات کے حوالے سے فراہم کردہ آراء سے اس بات کا تاثر ضرور ابھرتا ہے کہ انہیں علمی و سائنسی ترقی میں جنوب ایشیائی خطے پر یورپی خطے کی برتری کا احساس ضرور تھا تاہم یہ احساس ابھی احساس کمتری میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ اٹھارہویں صدی کا نصف آخر جس طرح ہندوستان میں نوآبادیات کا ابتدائی دور تھا ویسے ہی برطانیہ اور بحیثیت مجموعی یورپ میں شرق شناسی یا مستشرقیت کا بھی ابتدائی دور تھا۔ اسی لیے مشرقی علوم وفنون اور زبانوں کے متعلق برطانوی مستشرقین و مصنفین کی طرف سے اس درجہ کا استحصالی رویہ اختیار نہ کیا گیا تھا جس کا اظہار انیسویں صدی میں کیا گیا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے ان تمام سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے یہ بات خاص اہمیت کی حامل ہے کے انہیں اپنی زبان فارسی اور فارسی علم وادب میں مہارت حاصل ہونے پر بے حد فخر تھا کیونکہ جیسا کے پہلے بھی ذکر کیا گیا کے

اٹھارہویں صدی ہندوستان میں برطانوی ابتدائی دور کے ساتھ ساتھ برطانیہ میں مستشرقیت کا بھی ابتدائی دور تھااوراس حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں انگریزوں خاص کر کمپنی کے اہلکاروں اور ملازمین کے نزدیک فارسی کی وہی قدر واہمیت تھی جو نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں ہندوستانی دانشورانہ طبقے کے لیے 'انگریزی' کی ہوگئی تھی مگر فرق یہ تھا کہ انگریزوں نے فارسی کی تحصیل فارسیت یا مشرقیت کے غلبے کو ختم کرنے اور یورپی اقتدار و غلبے کو قائم کرنے کے لیے کی تھی جب کے ہندوستانیوں نے انگریزی کی تحصیل یورپی غلبے کو قبول کرتے ہوئے اپنی بقاء کی خاطر کی تھی۔ بہر حال اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے ہاں یورپی اقوام کی مشرقی زبانوں اور علوم وادب اور خاص طور پر برطانوی نوآبادکاروں میں 'فارسی' زبان سیکھنے کے حوالے سے بڑھتے ہوئے ذوق وشوق کو غیر معمولی اہمیت دی گئی اور یورپی اقوام کے مشرقی زبانوں کی تحصیل اور کتب کے یورپی زبانوں میں تراجم کرنے کے رجحان کو بے حد سراہا گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام نے خاص طور پر ان عربی وفارسی کی کتب کے ذخیروں کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا جو انہیں آکسفورڈ قیام کے دوران بودلیئن لائبریری میں دیکھنے کو ملے۔ اعتصام کے لیے یہ بات بھی باعث فخر ثابت ہوئی کہ آکسفورڈ قیام کے دوران انہوں نے سر ولیم جونز (۱۷۴۶ء- ۱۷۹۴ء) جو مستشرق تھے اور کپتان سوینٹن جن کے ہمراہ انہوں نے سفر یورپ اختیار کیا تھا کو بعض کلاسیکی فارسی متون اور قواعد کے پڑھنے، سمجھنے اور ان کا ترجمہ کرنے میں کافی مدد کی تھی۔ محمد حسین کے نزدیک ایک انگریز مستشرق 'سیل' (sale) کا انگریزی ترجمہ قرآن انسانیت کے لیے ایک طرح کی خدمت تھی۔ ہمارے ان دانشوروں کے یورپیوں اور بالخصوص برطانوی نوآبادکاروں کے فارسی زبان وادب میں دلچسپی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے متعلق جو تاثرات و تبصرے پیش کیے گئے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان میں برطانویوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کی وجہ کو سمجھنے سے ہرگز قاصر نہیں تھے۔ ان کے نزدیک اس دلچسپی کی اہم وجہ بنگال میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانا تھی اس لیے بنگال کے انتظامی معاملات کو زیادہ بہتر طریقے سے چلانے کے لیے انگریز فارسی زبان کی تحصیل میں دلچسپی لے رہے تھے۔

'برطانوی پارلیمانی نظام حکومت' برطانوی زندگی کا وہ شعبہ تھا جو یورپ قیام کے دوران جنوب ایشیائی ابتدائی نوآبادیاتی دور کے سفر نامہ نگاروں کی توجہ کا خاص مرکز بنا تھا۔ یہ نظام حکومت بلاشبہ ان سفر نامہ نگاروں کے لیے ہندوستانی نظام حکومت سے بالکل مختلف اور انوکھی طرز کا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اپنے سفر ناموں میں برطانوی نظام حکومت کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس میں بادشاہ کے محدود اختیارات سے لے کر آئین کی بالادستی، قانون سازی کے حوالے سے پارلیمنٹ کے اختیارات وطریقہ کار اور برطانوی عوام کے سیاسی شعور تک تمام محاسن کو اجاگر کیا۔ جس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام کی خوبیوں سے کس قدر متاثر ہوئے تھے اور اس نظام کی افادیت واہمیت کے پیش نظر وہ اپنے ہم وطنوں یعنی ہندوستانی قارئین کو آگہی فراہم کرنے میں بھی بے حد مشاق نظر آئے۔

جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں اعتصام الدین جہاں برطانوی پارلیمانی نظام حکومت کی خوبیوں کے معترف ہوئے وہیں ان کے سیاسی شعور اور ناقدانہ سوچ نے انہیں ہندوستانی نظام حکومت کے عیوب کی نشاندہی پر بھی اکسایا اور انہوں نے اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی بحران کو ہندوستانی نظام حکومت میں بادشاہوں کی تعیش پرستی، کاہلی، ناعاقبت اندیشی اور شہزادوں کی آپس کی خانہ جنگی و نااتفاقی اور برطانیہ کے برعکس ہندوستان میں تخت کی موروثیت کے منظم قوانین کی عدم موجودگی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی عوام کی سیاسی نافہمی جیسے عوامل کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں سیاسی زوال اور غیر ملکی غلبہ کے اسباب پیدا کرنے میں محمد شاہ رنگیلا کے عہد حکومت اور شاہ عالم کے دور کے سیاسی انتشار و خلفشار اور محلاتی سازشوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے سیاسی زوال کے حوالے سے اعتصام کا پیش کردہ تنقیدی تجزیہ نہ صرف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ہندوستان کی گزشتہ و معاصر سیاسی تاریخ کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے بلکہ انہیں اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ مغلیہ سلطنت کے سیاسی زوال کے اسباب دراصل اندرون ملک ہی موجود تھے۔ منشی اسماعیل نے اگرچہ برطانوی پارلیمانی طرز حکومت کو سراہا ضرور مگر وہ اعتصام کی طرح مغلیہ سلطنت کے سیاسی زوال یا اس حولے سے مغلیہ حکمرانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے دکھائی نہیں دیتے۔

مذہب کے حوالے سے بات کی جائے تو اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں کے ہاں برطانوی معاشرے کے حوالے سے بڑھتی ہوئی لادینیت، عقلیت پرستی اور مادیت پرستی جیسے رجحانات کا مشاہدہ پیش کیا گیا اور ان کے اس قسم کے رجحانات کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ مگر یورپی اقوام میں مجموعی طور پر برطانویوں کے مذہبی عقائد (یعنی پروٹسٹنٹ عقائد) کو ہی بہتر قرار دیا گیا۔ تاہم برطانوی قوم کے حلال و حرام اشیاء اور پاکی و ناپاکی کے حوالے سے مذہبی احکامات سے زیادہ طب کی کتب کو اہمیت دیتے ہوئے ان پر انحصار کرنے کا رجحان جنوب ایشیائی مسلمان سفر نامہ نگاروں کے لیے باعث حیرت بنا۔ مگر ہمارے ان سفر نامہ نگاروں کو نہ صرف اپنے مذہب اسلام اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا بلکہ یورپ قیام کے دوران وہ اپنے مذہبی عقائد کے حوالے سے راسخ العقیدہ اور مذہبی احکامات پر کاربند مسلمان دکھائی دیئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اعتصام الدین نے یورپ کے سفر اور قیام کے دوران اسلام میں ممنوعہ اور حرام چیزوں (سور اور شراب) کو بھوک اور بیماری اور اپنے یورپی احباب کے اصرار پر بھی کھانے اور پینے سے پرہیز کیا جس کی وجہ سے اگرچہ انہیں اپنے متعلق 'بیوقوف بنگالی' جیسے ہتک آمیز کلمات بھی سننے

پڑے مگر اعتصام نے جس طرح یورپ قیام کے دوران شگرف نامہ میں اپنے حرام اشیاء سے پرہیز کے متعلق واقعات وقصے بیان کیے ان سے اندازہ ہوتا ہے کے برطانوی معاشرے میں شراب جیسی حرام چیز سے بچنا واقعی ہی ایک مشکل کام تھا مگر اعتصام کسی بھی چیز کو خاطر میں لائے بغیر سختی سے اپنے مذہبی احکامات پر کاربند رہے۔ مذہبی احکامات پر کاربند رہنا چونکہ اعتصام کے ساتھ ساتھ ان کے ہندوستانی قارئین کے لیے بھی خوشی اور فخر کا باعث ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے اس قسم کے قصے بیان کرنے پر خاص توجہ دی جس سے ان کی اپنے مذہب سے وفاداری کا ثبوت ملتا تھا۔ حرام اشیاء سے پرہیز کے علاوہ یورپ قیام کے دوران اعتصام نے جس فخریہ انداز اور پر جوش لہجے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت، ذات اور دین اسلام کے چند احکامات کے حوالے سے اپنے یورپی احباب کی طرف سے اٹھائے گئے چند اعتراضات اور سوالات پر اپنے پیش کردہ دلائل اور جوابات سے انہیں لاجواب کر دینے کا دعویٰ کیا اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کے اعتصام کو اسلام کے دین کامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی دینی تعلیمات اور وسیع مطالعہ ومعلومات پر بھی فخر تھا۔

ہندوستان کے ابتدائی نوآبادیاتی دور میں یورپ کا سفر کرنے والے یہ مصنفین جہاں اپنے مذہب اور مذہبی احکامات پر سمجھوتہ کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے وہیں وہ اپنی ثقافتی پہچان، لباس اور رنگ ونسل کے حوالے سے بھی کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا دکھائی نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کے ہمارے سفر نامہ نگاروں میں اعتصام برطانویوں کی طرف سے ان کے لباس اور ان کی ظاہری وضع وقطع (سیاہ رنگ) پر برطانویوں کے عجیب وغریب تاثرات اور رویوں کو کسی قسم کی نسلیت پرستی یا ثقافتی برتری کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے بلکہ اس حوالے سے ان کے پیش کردہ دلائل دراصل دو مختلف تہذیبوں اور خطوں کے رہنے والوں کے درمیان 'اجنبیت' کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کسی حد تک درست بھی معلوم ہوتے ہیں۔اس لیے کے جس طرح اعتصام کے کالے (سیاہ) رنگ، دیو قامت اور دیسی لباس کو دیکھ کر کچھ برطانوی حیران اور کچھ عورتیں اور بچے خوفزدہ ہوئے تھے ویسے اعتصام بھی ان کی گوری رنگت، مردوں کے مضبوط جسم اور برطانوی عورتوں کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔اعتصام کو برطانوی عورتوں کا حسن بلاشبہ بہت بھایا تھا مگر برطانوی عورتوں کی بے باکی اور بے جا آزادی برطانوی تہذیب وثقافت کے وہ پہلو تھے جو ان کے لیے ناقابل پسندیدہ تھے۔

برطانوی سائنسی ومادی ترقی، علوم وفنون اور نظام سیاست کے برعکس برطانوی معاشرتی اقدار اور رسم وروایات تینوں جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامہ نگاروں کے لیے یکساں دلچسپی کا حامل یا پسندیدہ موضوع نہ بن سکا اور سوائے اعتصام کے باقی دونوں سفر نامہ نگاروں نے برطانوی معاشرے کی تہذیبی وثقافتی روایات کو کوئی اہمیت نہ دیتے

ہوئے ان کے متعلق کسی قسم کی معلومات یا تاثرات پیش نہ کیے جو برطانوی معاشرتی اقدار یا رسم و روایات کے متعلق ان کے مثبت یا منفی نقطۂ نظر کو جاننے سے متعلق ہماری رہنمائی کرتے۔ مگر اعتصام نے اپنے ہم عصر سفر نامہ نگاروں کے برعکس بعض برطانوی معاشرتی رجحانات اور رسم و روایات جیسے کے شادی بیاہ کے رجحانات اور رسم و روایات، شراکتی کاروبار کرنے کے رجحانات، نوجوانوں کی عملی زندگی کے رجحانات، علم و ہنر اور مال و دولت کے حصول کے لیے جد وجہد اور جائیداد کی تقسیم کے حوالے سے برطانوی وراثتی قانون کو اپنی افادیت اور جدت کی بنا پر بے حد سراہا۔ تاہم وہ برطانوی معاشرے اور سماج میں پائی جانے والی برائیوں سے بھی بے خبر نہ تھے اور انہوں نے برطانویوں کے حوالے سے جوا، چوری، قتل اور طبقاتی تقسیم جیسی برائیوں کو بیان کر کے دراصل اس آفاقی حقیقت کو نظر انداز نہیں ہونے دیا کہ کوئی قوم چاہے کتنی مہذب یا ترقی یافتہ ہو برائیوں سے مبرا نہیں ہو سکتی۔

یورپ کا جغرافیہ اور اس خطے کی ترقی کے تاریخی اسباب اٹھارہویں صدی میں یورپ کا سفر کرنے والے ان ابتدائی نو آبادیاتی مصنفین کی توجہ اور دلچسپی کا خاص مرکز بنے جس سے اندازہ ہوتا ہے کے عام جنوب ایشیائی باشندوں کی خطہ یورپ سے متعلق معلومات اس وقت تک محدود تھیں اسی لیے ان مصنفین نے اپنے ہندوستانی احباب و قارئین کی معلومات کے واسطے خطۂ یورپ اور اس میں بسنے والی اقوام کے حوالے سے اپنے سفر ناموں میں ان کے متعلق ضروری اور اہم معلومات فراہم کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ ہمارے یہ سفر نامہ نگار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ یورپ ایک وسیع خطہ زمین کا نام تھا جہاں مختلف اقوام آباد تھیں جنہوں نے سولھویں صدی میں 'اصلاح' کی تحریکوں اور سقوط ہسپانیہ کے بعد مسلم و یونانی علمی و ادبی سرمائے سے استفادہ کرتے ہوئی اپنی نشاط ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ یہ سفر نامہ نگار نہ صرف یورپ میں بسنے والی مختلف اقوام اور آباد ممالک جیسے کے فرانس، جرمنی، اٹلی، پرتگال، اسپین، ہالینڈ، روس اور جارجیا وغیرہ میں سے بعض کے تاریخی حالات، جغرافیائی حدود، نظام حکومت اور ان میں بولی جانے والی زبانوں کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے بلکہ یورپی تاریخی مطالعوں اور معلومات نے ان پر یہ حقیقت بھی آشکار کر دی تھی کے یورپ میں 'اصلاح' کے زمانے سے مختلف مذہبی فرقے جنم لے چکے تھے۔ یہ مصنفین اگرچہ کافی حد تک پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں میں عقائد کے حوالے سے پائے جانے والے اختلافات کے متعلق آگہی رکھتے تھے مگر اپنے قارئین کے لیے ان اختلافات کو انہوں نے کیتھولک یا پروٹسٹنٹ کی اصطلاحات کو براہ راست استعمال کر کے وضع نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں برطانوی، آئرش اور اسکاٹش باشندوں کے درمیان پائے جان والے بنیادی افتراقات نیز مختلف یورپی اقوام کے درمیان نسلیت پرستی، قومیت پرستی اور مذہبی فرقہ پرستی کی بنا پر پائے جان والے اختلافات کو بھی موضوع بحث بنایا گیا۔

امریکہ کی دریافت اور امریکہ پر یورپی نوآبادیاتی یلغار جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں میں میر محمد حسین اور اعتصام الدین کے لیے ایک اہم اور حساس موضوع تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کے امریکہ کی دریافت نہ صرف دنیا کے جغرافیائی نقشے کو بدلنے کا سبب بنی بلکہ اس دریافت سے یورپی اقوام میں دنیا کے مزید ان جانے اور دور دراز خطوں کو دریافت کرنے اور انہیں تسخیر کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان سفر نامہ نگاروں کے حوالے سے جو بات خاص توجہ کی حامل ہے وہ یہ کے انہیں تمام یورپی اقوام میں 'برطانوی' علوم وفنون، سائنسی ترقی، نظام سیاست اور فوجی طاقت میں سب سے بڑھ کر اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ معلوم ہوئے یعنی اٹھارہویں صدی میں انہیں برطانیہ کے عالمی طاقت ہونے کا پورا یقین تھا کیونکہ ان کی معلومات اور رائے کے مطابق برطانوی بحری قوت اور طاقت میں ناقابل تسخیر ہو چکے تھے۔

اس طرح اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی ابتدائی سفر نامہ نگاروں کی خطہ یورپ، یورپی نوآبادکاروں اور یورپی زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں پر ان کے براہ راست مشاہدات اور فراہم کردہ معلومات و تاثرات کے نوآبادیاتی مطالعہ و تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کے نوآبادیات کے ابتدائی دور میں جنوب ایشیائی باشندوں اور یورپی نوآبادکاروں کے درمیان مختلف شعبہ ہائے زندگی جیسے کے مذہب، ثقافت، زبان، علوم وفنون اور رنگ و نسل کے حوالے سے نوآبادیاتی تعلقات قدرے کم پیچیدہ تھے اسی لیے ان سفر نامہ نگاروں کے ہاں ہمیں یورپی زندگی کے مختلف پہلوؤں جیسے کے یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی، سائنسی ایجادات، نظام سیاست اور معاشرتی اقدار کو بغیر کسی احساس کمتری میں مبتلا ہوئے ان کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت کے پیش نظر سراہنے کا رجحان ملتا ہے جو دراصل ان سفر نامہ نگاروں کے اپنی سوچ اور زاویہ نظر میں جدت پسند اور روشن خیال ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ان جنوب ایشیائی سفر ناموں میں مذہبی اختلافات، ثقافتی افتراقات (زبان اور لباس وغیرہ) اور رنگ و نسل جیسے حساس موضوعات پر بھی سفر نامہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات سے جنوب ایشیائی نوآبادیاتی باشندوں اور یورپی نوآبادکاروں کے درمیان ایک دوسرے کے متعلق انتہائی نوعیت کے منفی تاثرات یا نفرت انگیز آراء کے تبادلہ کا رجحان بھی نہیں ملتا۔ مگر ان سفر نامہ نگاروں کی فراہم کردہ معلومات اس طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کے یورپی، نوآبادیات کے اس ابتدائی دور میں جنوب ایشیائی باشندوں کو سائنسی علوم وفنون میں کم ترقی یافتہ ہونے پر 'سادہ لوح اور نادان'، رنگ اور وضع میں 'کالا یا سیاہ' مذہبی احکامات پر سختی سے کاربند ہونے پر بیوقوف ضرور تصور کرتے تھے مگر ان تصورات نے ابھی تک ڈسکورس کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس وقت تک انہیں جاہل و جنگلی کا درجہ دیا گیا تھا۔ جنوب ایشیائی باشندوں کی زبان فارسی اور ان کے علوم وادب کو ابھی تک یورپی نوآبادکاروں نے ناتراشیدہ اور پست درجہ کے قرار نہ دیا

تھا کیونکہ اس وقت وہ خود جنوب ایشیائی باشندوں سے ان کی تحصیل میں مصروف تھے۔ مگر جیسے جیسے یورپ میں شرق شناسی کا رجحان بڑھا اور ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی گرفت مضبوط ہوئی، اس کا دائرہ کار پھیلا اور میکالے اور اس جیسی برطانوی مقتدرہ نے یورپی مستشرقین کی مشرقی علوم و ادب اور زبان و ثقافت کے متعلق پیش کردہ آراء کو اپنے نوآبادکارانہ مقاصد کے استعمال کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کیا توں توں ان دونوں اقوام کے درمیان ہر شعبۂ زندگی میں پیچیدگیاں بڑھیں۔ان پیچیدگیوں کا اظہار مختلف نوآبادیاتی رویوں(انجذابی ،بغاوتی اور آفاقی)کے ذریعے کیا گیا۔ہندوستان میں نوآبادیات کے عروج کے زمانے میں یورپ کے متعلق تحریر کردہ سفر ناموں سمیت جو ادب تحریر کیا گیا اس سے ہندوستانیوں اور برطانویوں کے درمیان پیچیدہ نوآبادیاتی تعلقات و رویوں کی غمازی بخوبی ہوتی ہے۔ جیسے کہ راقم الحروف نے بھی اس تحقیقی مقالے کے باب اوّل میں میکالے کی تعلیمی رپورٹ اور اس کے رد عمل میں سرسید تحریک اور اودھ پنچ تحریک وغیرہ کے حوالے سے مختلف نوآبادیاتی رویوں کا تجزیہ اور بعد ازاں جنوب ایشیائی سفر ناموں کے نوآبادیاتی تھیوری کے تحت تجزیہ سے نوآبادیات کے عروج اور آغاز کے زمانے میں برطانوی نوآبادکاروں اور ہندوستانی نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان تعلقات اور رویوں کی نوعیت اور ان میں تبدیلی کا ایک طرح سے جائزہ پیش کر کے دکھایا ہے۔

نوآبادیاتی صورت حال کے حوالے سے البرٹ میمی، فرانز فینن اور ایڈورڈ سعید کے پیش کردہ نظریات کسی نوآبادیاتی صورت حال میں نوآبادکاروں اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان دراصل پیچیدہ تعلقات و رویوں پر بحث کرتے ہیں اور مجموعی طور پر کسی نوآبادیاتی نظام میں نوآبادکاروں کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت اور نوآبادیاتی باشندوں کی ادنیٰ 'کمتر حیثیت پر منتج ہیں۔یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کے کسی خطے میں نوآبادیاتی صورت حال کا آغاز ہی دراصل نوآبادکاروں کی 'برتری' کے تصور سے ہوتا ہے وہ چاہے عسکری ہو، ثقافتی، تہذیبی یا ان سب کا مجموعہ۔ جنوب ایشیائی سفر ناموں کے تنقیدی تجزیہ سے دراصل ہم پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کے اٹھارہویں صدی کے جنوب ایشیائی سفر نامہ نگاروں نے جب سفر یورپ اختیار کیا تھا تو برطانوی عسکری برتری کا تصور ان کی سائیکی میں کہیں موجود تھا اور جب وہ یورپ سے واپس ہندوستان لوٹے تو اپنی اپنی دلچسپی کے پیش نظر یورپ کی علمی، سائنسی، ثقافتی یا تہذیبی برتری کے تصور کو بھی خود کو کم تر سمجھے بغیر ساتھ لائے۔ جنوب ایشیائی خطے میں نوآبادیات کے ابتدائی دور میں یورپ کے سفر سے متعلق تحریر کیے گئے مجوزہ تحقیق کے لیے منتخب کردہ سفر ناموں کا نوآبادیاتی مطالعہ دراصل اس بات پر دلالت کرتا ہے کے نوآبادیات کا وہ دور جب نوآبادکار کسی خطے میں اپنی نوآبادیاں تشکیل کر رہا ہوتا ہے اس دور سے یقیناً مختلف ہوتا ہے جب وہ اس پر مکمل طور پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اسی طرح ان ادوار میں نوآبادکار اور نوآبادیاتی باشندوں کے درمیان

تعلقات و رویوں کی نوعیت بھی قدرے مختلف ہوتی ہے مگر نوآبادکار کی اعلیٰ و مقتدر حیثیت وہ چیز ہے جو ہر دور میں مشترک ہوتی ہے۔

ماخذات

ماخذات

آراء، روشن اور عبدالسلام۔ تاریخ تحریکِ پاکستان حصّہ اوّل۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان اُردو، ۱۹۹۳ء۔

آزاد، محمد حسین۔ دربارِ اکبری۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵۔

احمد، بشیر الدین۔ واقعات دار الحکومت دہلی حصّہ اول۔ دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۲ء۔

اردو انسائیکلوپیڈیا۔ "مارٹن لوتھر (مذہب اور عقیدہ)"۔ تاریخ ملاحظہ جنوری ۲، ۲۰۲۰۔ http://mimirbook.com

اردو پوائنٹ۔ "جان کالون 1509۔1564ء"۔ نومبر ۴، ۲۰۱۵۔ تاریخ ملاحظہ جنوری ۶، ۲۰۲۰ء۔ http://www.urdupoint.com>article

اسماعیل، منشی۔ "التاریخ جدید"۔ مترجم جواد ہمدانی۔ بنیاد ش ۵ (۲۰۱۴ء): ۱۳۶۔۱۷۱۔

اصفہانی، مرزا ابو طالب، سفرنامۂ فرنگ۔ مترجم ڈاکٹر ثروت علی نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۴ء۔

اعتصام الدین، منشی۔ شگرف نامۂ ولایت ۱۷۶۷ء۔۱۷۶۹ء۔ مترجم امیر حسن نورانی پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۱۹۹۵ء۔

اعوان، محمد آصف۔ مغربی تہذیب کے مشرقی نقاد: اکبر الہٰ آبادی اور اقبال۔ لاہور: بزم اقبال، ۲۰۱۲۔

انور، شکیل۔ "The Advent of Europeans in India the portiguese, the Dutch and the Danes". اکتوبر ۲۰، ۲۰۱۷ء۔ تاریخ ملاحظہ جولائی ۱۵، ۲۰۱۸ء http://www.jagranjosh.com/th.. Jagrnjosh.

بان، گستاؤلی۔ تمدن ہند۔ مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، سن ندارد۔

برکاتی، سید محمود احمد۔ مقدمہ مشاہدات فرنگ از میر محمد حسین۔ مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی، ۱۷۔۱۹۴۔ لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، سن ندارد۔

بیگ، مرزا حامد، اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ۔ لاہور: کلاسیک، بار اول دسمبر ۱۹۹۹ء۔

چند، تارا۔ تاریخ تحریکِ آزادی ہند، جلد اوّل۔ مترجم قاضی محمد عدیل عباسی۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۰ء۔

الحاد۔ "سائنسی ترقی کا جدید انقلاب کیسے آیا؟"۔ اپریل ۱۵، ۲۰۱۹۔ تاریخ ملاحظہ جنوری ۶، ۲۰۲۰ء۔ http://ilhaad.com>2019 /04>how....

حسین، میر محمد۔ مشاہدات فرنگ۔ مترجم حکیم سید محمود احمد برکاتی۔ لاہور: مغربی پاکستان اکیڈمی، سن ندارد۔

خان، گلفشاں۔ "European Polities At The Close Of The Eighteenth Century:"

Indian Perspective Of The West". Indian History Congress.vol.52(1991):333-337.http://www.jstore.org/stable/44142602

خان،افتخار عالم۔سر سید احمد خان۔دہلی:اردو اکادمی،۲۰۰۸ء۔

خان،سید احمد۔اسباب بغاوت ہند۔علی گڑھ:یونیورسٹی پبلشرز،۱۹۵۸ء۔

خان،گلفشاں۔ *Indian Muslim Perceptions of the West during the Eighteenth Century* ۔پی۔ایچ۔ڈی۔مقالہ،یونیورسٹی آف آکسفورڈ،۱۹۹۳ء۔

دہلوی،سید احمد۔مرتب فرہنگِ آصفیہ،جلد دوم۔دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۷ء۔

ڈگبی،سائمن۔ An eighteenth century Narrative of a journey-from Bengal to England: Munshi Ismail's New history". *Urdu and Muslim South Asia*. مرتب کرسٹوفر شیکل(Christopher Shackle)۔لندن:سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز، ۱۹۸۹۔

رضوی،سید خورشید مصطفیٰ'۔تاریخ جنگِ آزادی ہند ۱۸۵۷ء۔لاہور:یو پبلشرز،۲۰۰۷ء۔

سٹوشے،بینڈکٹ(Stuchtey,Benedikt) "Colonialism and Imperialism, 1450-1950".*Semantic scholar*،جنوری ۲۴،۲۰۱۱ء۔-www.semanticscholar.org-paper-colonialism

سدید،انور۔اردو ادب میں سفر نامہ۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،سن ندارد۔

سدید،انور،اردو ادب کی تحریکیں۔کراچی:انجمن ترقی اردو،۱۹۸۵ء۔

سعید،محمد زاہد۔"شاہانِ مغلیہ کا طلسماتی اور روحانی فنِ تعمیر"۔*Watch Live*(بلاگ)،Geo.tv،فروری ۱۱،۲۰۱۷ء۔

سلیون،نیٹ۔(Sullivan ,Nate)، "European Imperialism in India & the British East India Company" .Study.com,تاریخ ملاحظہ،جنوری ۱۲،۲۰۱۸ء۔

http://study.com/.../european-imperialism-in-india-the-british-east-india-company.html

سہیل،عامر۔"شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی:ایک تعارفی مطالعہ"۔دانش ۔نومبر ۷،۲۰۱۹ء۔تاریخ ملاحظہ جنوری ۶، ۲۰۲۰ء۔http://caawish.pk

سین،سونتی۔ Travels to Europe: Self and other in Bengali Travel Narratives, 1870-1910۔نئی دہلی:اورینٹ لانگ مین،۲۰۰۵ء۔

ظفری،ظفر عالم۔اردو صحافت میں طنز و مزاح۔لاہور:فیروز سنز،۱۹۹۶ء۔

عارف، نجیبہ، "The west in South Asian-Muslim Discourse A Study of Indian
Muslims Travel to the West 1757-1857"، جرنل آف انٹولوجی اینڈ ساؤتھ
ایشین سٹڈیز، ش۳۰ (۲۰۱۳ء):۲۱۔ ۴۵۔
عارف، نجیبہ۔ "اٹھارہویں صدی کا ایک نادر سفر نامہ روس وچین"۔ بازیافت ش۲۵(۲۰۱۴ء):۵۳۔۸۲۔
عارف، نجیبہ۔ "جنوبی ایشیاء میں اولین سفر نامۂ انگلستان"۔ بنیاد ش۵(۲۰۱۴ء):۱۱۷۔۱۳۵۔
عبداللہ، محمد۔ "سفر نامہ روس وچین"۔ مترجم نجیبہ عارف۔ بازیافت ش۲۵(۲۰۱۴ء):۶۱۔۸۲۔
علی، عبداللہ یوسف۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۱۹۹۲ء۔
علی، مبارک، برطانوی راج: ایک تجزیہ۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۲۔
علیگ، باری، کمپنی کی حکومت۔ لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۳۷۔
علیگ، سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ دہلی: کتب خانہ عزیزیہ، ۱۹۴۵ء۔
الغنی، عبد۔ "پس منظر" مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند: فارسی ادب سوم
۱۷۰۷ء۔۱۹۷۲ء۔ مرتب سید فیاض محمود اور سید وزیر الحسن عابدی۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، جلد پنجم۔
فشر، پیٹر۔ "*The Calico Acts: Why Britain turned its Back On Cotton*"،
Soundideas. تاریخ ملاحظہ جنوری ۱۲، ۲۰۲۰ء۔
http://soundideas.phgetsound.edu/history-these/
فشر، مائیکل ایچ۔ "Early Asian Travellers to the West.Indians in Britain,
C.1600-C.1850"، *World History Connected*، تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۵، ۲۰۱۹ء۔
http://worldhistoryconnected.press.uillinois.edu۔
فشر، مائیکل ایچ۔ *From Indian to England and Back: Early Indian Travel
Narratives for Indian Readers"*، Huntington Library Quarterly
۔ پنسلوینیا: یونیورسٹی آف پنسلوینیا پریس، جلد ۷، نمبر ا(۲۰۰۷):۱۵۳۔۱۷۲۔
فشر، مائیکل ایچ۔ *Counterflows to Colonialism: Indian-Travellers and Settlers in
Britain 1600-1857*، دہلی: پرمانٹ بلیک، ۲۰۰۴ء۔
فینس، فرانز، افتادگانِ خاک۔ مترجم سجاد باقر رضوی اور محمد پرویز۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۹۲ء۔
قدوائی، محمد ہاشم۔ جدید ہندوستان کے سیاسی و سماجی افکار۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء۔
قریشی، قدسیہ۔ اردو سفرنامے انیسویں صدی میں۔ لکھنؤ: نصرت پبلشرز امین آباد، فروری ۱۹۸۷ء۔
کاشمیری، تبسم۔ اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔
کمال، محمد اشرف، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات۔ فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء۔

مارشل،پی۔جے(Marshall,P.j)۔"Presidential Address: Britain and the World in the Eighteenth Century :I,Reshaping the Empire". Royal History Society, vol.8(1998):1-18,
http://www.jstore.org/stable/3679286
محمود،خالد۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ۔نئی دہلی:مکتبہ جامعہ،۲۰۱۱ء۔
مصحفی،غلام ہمدانی۔عقدِ ثریا (تذکرہ فارسی گویاں)۔مرتب شہاب الدین ثاقب۔علی گڑھ:مسلم ایجوکیشنل پریس،۲۰۱۲
میکالے،بینگٹن۔میکالے اور برصغیر کا نظامِ تعلیم۔مترجم سید شبیر بخاری۔لاہور:آئینۂ ادب،۱۹۸۶ء۔
میکلن،اینا(Micklin,Anna) . "Negritude Movement"،*Black Past*،جون۲۹، ۲۰۰۸ء۔تاریخ ملاحظہ ۲۰ نومبر ۲۰۱۸ء۔
http://www.blackpast.org>globalafrican-history-movement/۔
نائک،جے۔پی اور سید نوراللہ،تاریخ تعلیم ہند۔مترجم مسعودالحق۔نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،اشاعت اول،۱۹۷۲ء۔
نیر،ناصر عباس۔لسانیات اور تنقید۔ اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۱۹ء۔
نیر،ناصر عباس۔مابعدنوآبادیات اردو کے تناظر میں۔کراچی:اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس،۲۰۱۳ء۔
نیّر،ناصر عباس۔" The free Encyclopedi". *Alchetron* تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲،۲۰۱۸ء۔
http://alchetron/com>Nasir-Abbas-Nayyer....
ہاشمی،محمد طفیل۔اندلس میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے۔اسلام آباد:ملت پبلشرز،۲۰۰۱ء۔
وائٹ،ہیلینا(White,Helaena). "Memmi-Albert-Postcolonial Studeis"، *Scholar Blogs*،جون۱۹،۲۰۱۸ء۔

"Europe in the 18th CenturyThe Euler Archive"تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۸،۲۰۱۹ء۔
http://eulerarchive.maa.org>eighteenth
"Frantz Fanon Biography/List of Works,Study guides & essays". essysGradesaver-۔تاریخ ملاحظہ نومبر ۹،۲۰۱۸ء
http://www.gradesaver.com/author/frantz-fanon
"Mape Of European Russia".Europe Nations Online Project.تاریخ ملاحظہ دسمبر ۱۵،۲۰۱۹۔
http://www.nationsonline.org>europe....
BRITANNICA. "Sir William Jones"تاریخ ملاحظہ دسمبر ۳۱،۲۰۱۹ء
http://www.britanica.com>willia...
"The Industrial Revolution (1750.1850) *Cambridge Central. School* تاریخ

http://www.cambridgecscl.org..... ملاحظہ ۹ دسمبر ۲۰۱۹ء۔

“Albert Memmi ”، Encyclopedia.org. تاریخ ملاحظہ نومبر ۲۵، ۲۰۱۸ء۔

www.encyclopedia.com>people>history>alb/

"Edward W.Said Biography".*Encyclopedia of World Biography* تاریخ ملاحظہ

دسمبر ۱۲، ۲۰۱۸ء۔

http://www.notablebiographies.com>worldbiography>supplement

(Mi-50)

Encyclopedia BRITANNICA. “Treaty of Tordesillas” تاریخ ملاحظہ اکتوبر ۱۰،

www.britannica.com>events,Treaty-of-Tordesillas ۲۰۱۹۔

Europe and the age of Exploration"Heilbrunn Time line Of The

Art History تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۰۱۹، ۲۰ء۔

OLD Bailey، London History, 1715.1760 ،تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۱، ۲۰۱۹ء۔

http://www.oldbailyonline.org/

“The founding of St. Petersburg, Russia”، U Mass Boston ،تاریخ ملاحظہ

blogs.umb.edu>buildingtheworld دسمبر ۲۷، ۲۰۱۹۔

,Wikipedia Petersburg” تاریخ ملاحظہ دسمبر ۲۰۱۹، ۲۰، en.m.wikipedia.org

CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD